MARY SHELLEY

FRANKENSTEIN

حیرت کدہ

مظہر الحق علوی

"If I cannot inspire love, *I WILL CAUSE FEAR!*"

BORIS©93

انسانی ہاتھوں سے ایک عفریت کا جنم

حیرت کدہ

فرنگسٹائن

مظہر الحق علوی

"ڈراکیولا" سے زیادہ ہیبت ناک ناول

حیرت کدہ

﴿فرنکسٹائن﴾

مصنفہ:۔

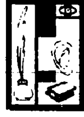
مس میری شیلے

مترجم:۔

مظہر الحق علوی

نوا۔ ناشرین کتب

راجپوت مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور 7223600 ✆



نام کتاب	——	حیرت کدہ
مصنفہ	——	مس میری شیلے
مترجم	——	مظہر الحق علوی
پیشکش	——	رانا محمود علی
انتخاب	——	واجہ امام بخش
سرورق	——	ذاکر
کمپوزنگ	——	گلزار چودھری
باراوّل	——	اکتوبر 2000ء
تعداد	——	500سو

قیمت -/Rs.100



نوٹ

ناول کے تمام واقعات اور کرداروں سے

ادارہ ہر گز متفق نہیں ہے

ادارہ

عرض ناشر

''ڈراکیولا'' کے بعد ایک اور ہیبت ناک ناول آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

زیرِ نظر ناول نہ صرف ہیبت ناک ہے بلکہ اپنے اندر بھر پور دہشت اور اسرار کا پہلو سموئے ہوئے ہے۔ اس کی مصنفہ ایک مشہور شاعرہ اور نثر نگار مس میری شیلے ہیں اور ان کا ناول ''فرنکسٹائن'' صحت مند ادب کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔

فرانسیسی مصنفہ شیلے اپنی کتاب کے بارے میں کہتی ہیں۔

''ایک رات اپنے بستر پر پڑی میں سونے کی تیاری کر رہی تھی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک ایک عجیب وغریب پلاٹ ذہن میں آ گیا اور اس کے بارے میں ساری رات سوچ سوچ کر میں صبح تک نہ سو سکی اور صبح پبلشروں کے حلقے میں میں نے اعلان کیا کہ ایک نئی کہانی کا پلاٹ میں نے سوچ لیا ہے۔''

''اتنا گھناؤنا اور ہیبت ناک خیال مجھے اچانک ہی ذہن میں آ گیا یہ ایسا عجیب وغریب اور لرزہ خیز پلاٹ تھا کہ جس کے مرکزی خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا۔''

اُمید ہے کہ آپ بھی مصنفہ کے اس کردار کا مطالعہ کریں گے تو ان کی رائے سے ضرور اتفاق کریں گے۔

اب ناول پڑھیئے اور ہمیں اپنے خیالات سے آگاہ کیجیئے۔

شکریہ

ادارہ

فرنکسٹائن کا خط
اپنی محبوبہ الزابیتھ کے نام

الزابیتھ پیاری!

میں سمجھتا ہوں کہ اب اس دنیا میں ہمارے لئے مسرتیں بہت کم ہیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں۔اس کے باوجود میری ساری مسرتیں، جتنی بھی باقی رہ گئی ہیں، تم ہی سے وابستہ ہیں تم میری سب کچھ ہو۔تم میری زندگی ہو اور وہ دن میری زندگی کا بہترین دن ہوگا جس دن کہ تم میری دلہن بنو گی...... میں تمہیں، صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ چنانچہ اپنے دل سے ہر شک نکال دو۔ الزابیتھ! میری پیاری! میرے سینے میں ایک راز دفن ہے۔ ایک ایسا بھیانک راز جسے میں تمہارے سامنے بیان کروں گا تو تم یقیناً چیخ اٹھو گی۔ یہ راز صرف تم سے کہوں گا۔لیکن ابھی نہیں۔شادی کے دوسرے دن تم مجھ سے میری داستان سنو گی اور پھر میری افسردگی اور دنیا والوں سے گریز اور تنہائی کی تلاش کا سبب معلوم کرلو گی۔شادی کے بعد تم میری شریک حیات اور شریک راز بن چکی ہو گی چنانچہ اس وقت میں تم سے اپنا راز کہتے نہ جھجکوں گا۔لیکن شادی سے پہلے مجھ سے کچھ نہ پوچھنا اور نہ ہی کس سے اس کا ذکر کرنا۔ ہماری شادی کے دوسرے دن تم سب کچھ جان لو گی۔

تمہارا

ڈکٹر فرنکسٹائن

ابتدائیہ

وہ خطوط جو ''والٹن'' نے اپنی بہن کو لکھے۔

11 دِسمبر

پیٹرس برگ

عزیز بہن!

میں نہایت مسرت کے ساتھ تمہیں یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ تمہاری پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی یا کوئی حادثہ ہوگا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ لوگوں کی پیشینگوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں تو وہ چراغ پا، یا کم سے کم نادم ضرور ہو جاتے ہیں۔ اس کے بر خلاف اپنی پیشینگوئیاں غلط ثابت ہونے پر تمہیں مسرت حاصل ہوگی۔

میں بخیر وخوبی کل یہاں پہنچ گیا ہوں۔ سفر کی تکان دور نہیں ہوئی ہے۔ کچھ کرنے کو، حتیٰ کہ باتیں کرنے یا کچھ سوچنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ لیکن اپنی پیاری بہن کو خیریت کی اطلاع دینا ضروری ہے۔ یہ تو واقعی سراسر ظلم ہوگا کہ تم وہاں میری فکروں میں راتوں کو سو نہ سکو اور میں یہاں پڑا سفر کی تکان دور کرتا رہوں۔ چنانچہ یہاں پہنچنے کے بعد میں پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

اس وقت لندن کے انتہائی شمال میں ہوں اور جب پیٹرس برگ کے بازاروں میں گھومتا ہوں تو شمالی ہوائیں میرے چہرے کو چھوتی ہوئی نکل جاتی ہیں اور ہوا کے جھونکے میرے پورے بدن میں مسرت اور سنسنی کی ایک عجیب سی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ جانتی ہو کیوں؟ اس لئے کہ ان ہواؤں میں اس ان دیکھے برفستان کی سردی ہوتی ہے جس کی طرف میں جا رہا ہوں۔ ان ہواؤں میں ایک عجیب مسحور کن بو ہوتی ہے جسے صرف میں محسوس کرتا ہوں۔ پیٹرس برگ کی سڑکوں پر بہتے ہوئے انسانی سیلاب میں سے کوئی ایک آدمی شمالی ہواؤں کے ان جھونکوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن یہی جھونکے، جب میں محسوس کرتا ہوں، تو جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگتا ہوں اور کسی طرح یقین نہیں کرتا کہ بحر منجمد شمالی

ویران اور غیر آباد ہو سکتا ہے۔ وہاں، جہاں میں جا رہا ہوں، سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ سورج کا قرمزی گولا مادرِ گیتی کی پیشانی چومتا دکھائی دیتا ہے اور پھر فوراً ہی مشرق کی طرف سے ابھر کر اپنا سفر شروع کرتا۔ سمتِ مغرب میں پھر دھرتی کا ماتھا چومتا ہے اور پھر فوراً ہی بطنِ مشرق سے نمودار ہوتا ہے۔ مارگریٹ! مجھے یقین ہے کہ میں اس مقام تک جاؤں گا جہاں مجھ سے پہلے کوئی نہیں گیا۔ میں اس خطے کے وہ راز معلوم کروں گا جو کسی نے معلوم نہیں کئے۔ وہاں کے اسرار پر سے پردے اٹھاؤں گا جو کسی نے نہیں اٹھائے۔ تمہارا بھائی وہ پہلا شخص ہو گا جو دنیا کے اس آخری سرے اور انجان خطے تک کا سفر کرے گا۔

وہاں کہتے ہیں سوائے برف کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہاں نہ حیوانات، نہ نباتات ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ برفستان میں قدرت نے اپنی قوتوں کے عجیب و غریب کرشمے دکھائے وہاں قدرت نے بڑی بے نیازی اور بے فکری سے اپنے شاہکار بکھیر دیئے ہوں گے کیونکہ وہاں ان شاہکاروں کو بگاڑنے والا کوئی نہیں، نہ انسان نہ جانور اور نہ نباتات۔ اور مارگریٹ پیاری! جس دنیا میں ہر دم روشنی رہتی ہو، وہاں کیا نہیں ہو سکتا؟ قدرت کا ہی ایک کرشمہ یہی ایک معجزہ قابل دید اور حیران کن ہو گا کہ وہاں سورج ڈوبتا ہی نہیں۔ اور بہن! اس غیر آباد اور ویران خطے میں پہنچ کر میں عجیب و غریب کشش کی کھوج لگاؤں گا جسے مقناطیسی قوت کہتے ہیں۔ ہاں وہ قوت جو قطب کی سوئی کو ہر وقت اپنی طرف ہی گھمائے رکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں غالباً ایسی بہت سی چیزوں کا کھوج لگاؤں گا جو اب تک انسان کی نظر سے پوشیدہ رہی ہیں اور گویا میری ہی منتظر ہیں اور ان چیزوں کا تعلق یقیناً اس دنیا سے نہیں۔ جو (پتہ نہیں کیا ہیں) ارضی نہیں سماوی ہوں گی۔ اگر وہاں پودے اگتے ہیں تو وہ یقیناً ایسے ہوں گے جو کبھی فردوسِ عدن میں اگا کرتے تھے۔ اگر وہاں جھرنے ہیں تو وہ شیشے سے زیادہ شفاف اور کوثر کی طرح مقدس ہوں گے۔ کیوں کہ ان کے پانی کو نہ کبھی کسی نے دیکھا، چھوا اور پیا ہو گا۔ اور پھر وہاں برف ہے۔ فرشتوں کے بالوں جیسی سفید اور پاک کیونکہ اس پر کسی انسان کے پاؤں نہیں پڑے۔ میں یہ سب دیکھوں گا اور قدرت کے اسرار معلوم کروں گا۔ اور جب میں وہاں پہنچوں گا تو اپنے آپ کو اس دنیا کا آدم محسوس کروں گا۔

تو یہ ہیں میرے خیالات جو مجھے ایک نیا عزم بخشتے ہیں اور میں وہ خوف محسوس نہیں کرتا جو اکثر مہم جو محسوس کرتے ہیں، اور یہی خیالات ہیں جنہوں نے مجھے راہ کی مشکلات اور خطرات سے بے پرواہ کر دیا ہے اور یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہاں شاید موت میری منتظر ہو۔ میں ایک عجیب طرح کا جوش، اکساہٹ اور سنسنی محسوس کر رہا ہوں۔

تم کہو گی میرا یہ جذبہ احمقانہ ہے۔ تم کہو گی کہ میں ایک مجنونانہ جوش میں اپنے آپ کو انجانے

خطرات کے حوالے کیئے دے رہا ہوں۔تم کہو گی میرے یہ خواب کبھی پورے نہ ہوں گے۔تم کہو گی میں کوئی نئی تحقیق نہ کرسکوں گا۔ بہت اچھا یونہی سہی لیکن اس سے تو تمہیں بھی انکار نہ ہوگا کہ میں اپنی کوشش سے کبھی آنے والی نسلوں کے لئے ایک نئی راہ کھول جاؤں گا۔ یہ تو بہر حال تمہیں بھی ماننا پڑے گا کہ میرا نام تاریخ میں جلی حرفوں سے لکھا جائے گا۔اگر میں کامیاب لوٹا تب بھی اور اگر وہیں مرکھپ گیا تب بھی۔

سنو مارگریٹ! اس مہم پر روانہ ہونے کے خواب میں اس وقت بھی دیکھا کرتا تھا جب میری سمجھ بوجھ پختہ نہ ہوئی تھی جب میں نے جغرافیہ کی کتاب میں قطب شمالی کا حال پڑھا تو میرے دل کو ایک کھوج سی لگ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ماسٹر صاحب سے قطبین کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے تھے۔ یہاں تک کہ ماسٹر صاحب نے گھبرا کر مجھے بڑی زوردار ڈانٹ پلائی تھی اور پھر بہت دنوں تک میرے ہم جماعت میرا مذاق اڑاتے رہے تھے، اسی وقت سے میں نے ان بہادروں کے قصے پڑھنے شروع کر دیئے تھے جنہوں نے دنیا کے دور افتادہ خطوں کا کھوج لگایا ہے اور دنیا کے نقشے میں نئے نئے ملکوں، پہاڑوں اور دریاؤں کا اضافہ کیا ہے۔ میں بھی ان بہادروں کی طرح بننا چاہتا ہوں اور اگر قسمت نے یاوری کی تو میری اچھی بہن، وہ دن دور نہیں جب تمہارا بھائی دنیا کا مشہور ترین شخص ہوگا۔

کوئی چھ سال پہلے میں نے اس سفر کا پختہ ارادہ کیا۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح سے یاد ہے۔ کیونکہ اس ارادے کے ساتھ ہی میں نے محنت و مشقت کی عادت ڈالنی شروع کر دی تھی۔ میں نے بھوکے اور پیاسے رہنے کی عادت ڈالی۔ ویل مچھلی کا شکار کرنے والوں کے ساتھ خطرناک بحری سفر کیئے اور طوفان کا مقابلہ کیا۔ کئی کئی راتوں تک جاگتے رہنے کی مشق کی۔ سخت دھوپ میں اور ٹھٹھرا دینے والی سردی میں ننگے بدن بیٹھا رہا۔ دوسرے ملاحوں سے زیادہ میں نے محنت کی کیونکہ میرے پیش نظر ایک واضح مقصد تھا۔ میں نے گھنٹوں تک مسلسل چپو چلائے۔ میں نے فوری علاج کے طریقے سیکھے، سمت اور طوفان کی آمد معلوم کرنے کے آلات کا استعمال سیکھا۔ ویل مچھلی کا شکار میں نے سیکھا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا میں نے سیکھا۔ موت سے بچ نکلنے کے داؤ پیچ میں نے سیکھے۔ طوفان سے ٹکر لینا میں نے سیکھا آبی جانوروں سے مقابلہ کرنے کی مشق میں نے کی اور ہواؤں کو قبضے میں کرنے کی قدرت میں نے پیدا کی اور چھ سال تک یہ سب کچھ میں اس لئے کرتا رہا کہ اپنے ارادے کو جامہ عمل پہنا سکوں۔ کیا میری یہ سب کوششیں رائیگاں جائیں گی؟۔ کیا میں کوئی کارِ عظیم انجام نہ دے سکوں گا؟۔ نہیں۔ ہر شخص کو اپنی محنتوں کا پھل ملتا ہے۔ چنانچہ مجھے بھی ملے گا۔ یقیناً ملے گا۔

بے شک میری زندگی عیش و آرام اور سکون سے گزر سکتی تھی لیکن مجھے عیش و آرام پسند نہیں ۔ میں خطرات سے کھیلنا پسند کرتا ہوں۔ میں اپنے خاندان کا نام روشن کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے آپ کو لافانی بنانا چاہتا ہوں۔ دولت و ثروت کے انبار اس دنیا میں جمع کیے بھی تو کیا۔ اور نہ کیے بھی تو کیا مرنے کے بعد یہ دولت کچھ کام نہ آئے گی اور نہ ہی اس سے تمہارا نام روشن ہوگا۔ دولت کے پیچھے بھاگنا اور دانت سے پکڑ کر ایک ایک پائی جمع کرنا حماقت ہی نہیں بلکہ گناہ ہے۔ اس سے نہ تو آپ کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ کسی اور کو۔ ممکن ہے بہت سے لوگ مجھ سے متفق نہ ہوں۔ ممکن ہے بہت سے لوگ یہ کہیں کہ وہ دنیا میں محض اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ دولت جمع کریں اور جب بہت سی دولت جمع کرلیں تو اس کے انبار پر بیٹھ کر مر جائیں۔ اور بہت سے لوگ ہیں دنیا میں جو صرف روپیہ جمع کرنا جانتے ہیں خرچ کرنا نہیں، حتیٰ کہ وہ لوگ کھانا بھی دوسروں کے یہاں کھاتے ہیں۔ اور اگر کبھی مجبوراً گھر پر کھانا پڑ جاتا ہے تو باجرے کی کھچڑی کھا لیتے ہیں اور اسے قناعت کہتے ہیں۔ حالانکہ دوسروں کے یہاں ان کی قناعت اٹھ جاتی ہے۔ خدا جانے ایسے لوگ دنیا میں کیوں بھیجے جاتے ہیں؟

خیر یہ تو گویا ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہرحال اپنے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ میں اس دنیا میں کچھ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ مارگریٹ! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں اور کر کے رہوں گا۔

میری ہمت اور میرا ارادہ پختہ اور حوصلہ بلند ہے۔ تاہم کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میری امیدوں پر ناامیدی غالب آ جاتی ہے۔ میرا حوصلہ پست ہونے لگتا ہے۔ میں ایک طویل مشکل اور خطرناک سفر پر روانہ ہونے والا ہوں اور اس سفر میں مجھے اپنے ساتھیوں کو ہی نہیں بلکہ اکثر اپنے آپ کو بھی ڈھارس دینا پڑے گی۔ جس وقت دوسروں کے اوسان خطا ہو رہے ہوں گے مجھے اپنے اوسان قائم رکھنے پڑیں گے اور یہ کام اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔

میں ہفتے عشرے میں ''آرچ اینجل'' کے لئے روانہ ہو جاؤں گا اور وہاں سے ایک جہاز کرائے پر لے لوں گا۔ جہاز کے مالک کو جہاز کی پوری قیمت اس شرط پر ادا کردوں گا کہ اگر واپس آ گیا تو رقم کرایہ وضع کرا کے بقیہ اس سے واپس لے لوں گا اور اگر نہ آیا تو وہ رقم اس کی ہوگئی۔ میرے خیال میں اس شرط پر کوئی بھی شخص اپنا جہاز مجھے دینے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ پھر میں بہت سے ملاح اپنے ساتھ لے لوں گا۔ خصوصاً ان ملاحوں کو جو وہیل مچھلی کے شکاری اور تجربہ کار ہوں۔ اپنے اس بحری سفر کی ابتدا غالباً جون سے پہلے نہ کرسکوں گا اب تم یہ بھی معلوم کرنا چاہو گی کہ واپس کب آؤں گا؟ کاش میں اس سوال کا جواب صحیح دے سکتا۔

چنانچہ خدا حافظ میری بہن۔ اگر زندگی ہے تو تم چند مہینوں بعد ہی اپنے اس بھائی کو اپنے سامنے پاؤ گی ورنہ...... میری زیادتیوں کو جو میں نے تم پر روا رکھی ہوں، معاف کر دینا۔ خدا تمہیں خوش اور شاد

کام رکھے۔

میری غلطیوں کو معاف کر دینا اور اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا۔

خدا حافظ میری بہن۔

تمہارا بھائی

آر۔والٹن

28/ مارچ

آرچ اینجل

میری بہن!

وقت یہاں رینگتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں یا تو برف رہتی ہے یا پھر گاڑھا کہر۔ لیکن یہ دونوں چیزیں میری ہمت نہیں توڑ سکتیں۔ جہاز کرائے پر لے چکا ہوں اور اب ملاحوں کی تلاش ہے۔ چند ملاح میرے ساتھ آنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ ان کی طرف سے میں مطمئن ہوں، کیونکہ یہ سب کے سب معتبر، بہادر، نڈر اور جفاکش معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن مارگریٹ پیاری! ایک کمی بہت شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ میں اب تک ناآشنائے دوست رہا ہوں۔ میرا کوئی دوست ہی نہیں خصوصاً اس سفر میں مجھے ایک مخلص دوست کی ضرورت ہے۔ جو میری مسرتوں میں شریک ہو سکے۔ جب میں کامیاب لوٹوں تو وہ میرے ساتھ فتح مندانہ قہقہے لگائے اور خدانخواستہ میں ناکام رہوں تو وہ مجھے تسلی دے۔ افسوس میرا کوئی دوست نہیں۔ تم کہو گی اتنے بہت سے ملاح میرے ساتھ جا رہے ہیں تو کیا میرے دکھ سکھ میں شریک نہ ہوں گے؟ نہیں۔ میری بہن، نہیں...... یہ لوگ میرے ملازم ہوں گے۔ تنخواہ دار ملازم۔ دوست نہیں۔ وہ روپیہ کمانے کی غرض سے میرے ساتھ آئیں گے دوستی کی خاطر نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں کاغذ پر اپنے خیالات بکھیر سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ زیادہ تسلی بخش نہیں۔ اس طرح میں اپنے دل کی بھڑاس پوری طرح نکال نہ سکوں گا۔ مجھے ایک ایسا دوست چاہیئے جو ہر حال میں میرا شریک رہے، مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو میری مسرتوں اور اداسیوں میں حصہ لے سکے۔ جو میرے مزاج اور میری دلی کیفیت کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ جو میرے ساتھ ہنس اور رو سکے جو میرے دل کو اپنے قبضے میں کر لے۔ جو صحیح معنوں میں دوست ہو۔ تم کہو گی میں جذباتی ہو گیا ہوں۔ چلو یوں ہی سہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت میں ایک دوست کی

کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں، میں تنہا اور بے یارو مددگار ہوں۔ کوئی ایسا شخص نہیں جس کی اکثر باتیں مجھ جیسی ہوں۔ اس کے مزاج اور میرے مزاج میں بعد المشر قین نہ ہو، جس نے میری ہی طرح خواب دیکھے ہوں اور اب ان کی تلاش میں میرے ساتھ نکلا ہو کوئی ایسا شخص نہیں جو میرے بلند ارادوں کی تعریف کر کے اکسائے اور میری غلطیوں کی تصحیح کر کے مجھے صحیح راستہ دکھائے۔ ایسا، صرف ایسا ہی شخص میرا دوست اور ساتھی بن سکتا ہے۔ میں نرا جاہل اور گنوار قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ میری زندگی کے چودہ سال آوارگی میں گزرے ہیں اور جب میں سنبھلا تو وقت نکل چکا تھا چنانچہ میں نے بغیر معلّم کے محض اپنی کوششوں سے پڑھنا لکھنا سیکھا اور صرف وہ سفرنامے پڑھ سکا جو چچا کی لائبریری میں تھے اور اس وقت بھی، مارگریٹ، میں اکیلا دوست سے محروم تھا۔ لوگ نہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے مجھ جیسے جاہل اور آوارہ لونڈے کے ساتھ کھیلیں چنانچہ میں اکیلا ہی لشتم پشتم زندگی کی منزلیں طے کرتا اور عجیب و غریب خواب دیکھتا رہا اور اب جبکہ میری عمر ۲۸ سال ہے، میں بس ایک پندرہ سالہ طالب علم سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہوں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکوں۔ میں خوش ہوں کہ اپنے خوابوں کو صحیح ثابت کرنے چلا ہوں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اداس و ملول بھی ہوں کہ میرا کوئی دوست نہیں۔ میں اکیلا ہوں اور تنہائی کا یہ احساس دن بدن شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

لیکن اس سے تمہیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اکیلے پن کا احساس میرے ارادوں اور میرے یقین کو ڈانواں ڈول کر دے گا۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ میری یہ بدقسمتی، کہ میرا کوئی دوست نہیں، مجھے افسردہ ضرور کر دیتی ہے لیکن میرے ارادوں میں حائل نہیں ہو سکتی۔

موسم ذرا خوشگوار ہو لے تو میں اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ اس وقت یہاں سردیاں ہیں اور سخت ہیں۔ چنانچہ اندازہ ہے کہ موسم بہار سفر کے لئے بے حد مناسب ہو گا اور موسم بہار کے پیروں کی چاپ سنائی دے رہی ہے اور اس کی آمد کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ چنانچہ وہ دن دور نہیں جب میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اطمینان رکھو میں عجلت سے کام نہ لوں گا۔ ویسے بھی میں فطرتاً جلد باز نہیں ہوں۔

میں ایک ایسی سنسنی محسوس کر رہا ہوں جسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ میں دُھند اور برف کی سرزمین کے اسرار معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں وہ کام کرنے والا ہوں جو آج تک کسی نے نہیں کیا اور پھر میں ذرا سا خائف بھی ہوں کہ خدا جانے وہاں کون سے خطرات میرے منتظر ہوں۔ پتہ نہیں میرے ساتھیوں پر کون سی ناگہانی مصیبت ٹوٹ پڑے۔ بہر حال خدا حافظ و ناصر ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں میدان جنگ میں نہیں جا رہا ہوں، میں ایک ویران اور غیر آباد خطے

میں جا رہا ہوں۔ جہاں صرف عناصر میرے دشمن ہوں گے۔ اور ان دشمنوں کو اپنے قبضے میں کرنے گر میں نے معلوم کرلیا ہے، اس کے علاوہ میں اشیائے خورد ونوش کا کافی ذخیرہ اپنے ساتھ لئے جا ہوں، چنانچہ میرے صحیح سلامت واپس آنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

مجھے خط لکھتی رہا کرو۔ کیونکہ وہ میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ اگر میرے خطوط تمہیں نہ بھی ملیں تب بھی تم خط لکھو ضرور لکھو۔

تمہارا بھائی
آر۔ والٹن

7/ جولائی

عزیز بہن!

بڑی عجلت میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ میں خیریت سے ہوں اور دنیا کے انجانے گوشے کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ خط ایک تاجر کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں جو آج کل میں لندن کے لئے روانہ ہونے والا ہے۔

میں نے جو ملاح اپنے ساتھ لئے ہیں وہ بہادر، نڈر اور باہمت ہیں اور میں ان کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوں۔

ہر پانچ منٹ کے بعد سطح آب پر تیرتے ہوئے برف کے تودوں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے لیکن جنہیں دیکھ کے نہ میں سہم جاتا ہوں اور نہ میرے ملازم ہی کسی طرح کے خوف کا اظہار کرتے ہیں۔ ان تودوں کے بیچ میں سے گزرتے وقت، میں بجائے خطرے اور خوف کے، ایک طرح کی روحانی مسرت اور انبساط محسوس کرتا ہوں اور یوں لگتا ہے جیسے یہی میری دنیا ہے اور اس سے آگے وہ فردوس ہے جس کا ذکر کتب سماوی میں موجود ہے۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ انجانی اور ان دیکھی دنیا کی طرف۔

جنوبی ہوا نہایت تیزی سے ہمارے جہاز کو آگے کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے یہ ہوا قدرے گرم ہے اور یہ واقعی خلاف توقع بات ہے کیونکہ میں سمجھے ہوئے تھا کہ اس برفستانی خطے کی ہوا میں استرے کی سی کاٹ ہے۔

اب تک کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ایک دو دفعہ ہوا میں تیزی آ گئی تھی، ایک دو دفعہ جہاز برف کی زیر آب سلوں پر چڑھ گیا تھا اور اس کے پیندے میں سوراخ ہو گیا تھا لیکن انہیں ہم

حادثات نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو معمولی واقعات ہیں۔

ایک بار پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں مارگریٹ کہ میں کوئی کام اندھا دھند نہ کروں گا بلکہ نہایت غور وخوض کے بعد کوئی قدم اٹھاؤں گا کیونکہ میری اور میرے ساتھیوں کی بہتری اور سلامتی اسی میں ہے اور اپنے ساتھیوں کی سلامتی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔

لیکن کیا کامیابی میرے قدم چومے گی؟ کیا میں عالمگیر شہرت کا تاج اپنے سر پر رکھوں گا؟ ان سوالات کا جواب مجھے اثبات میں ہی ملتا ہے۔ میں ایک انجانے سمندر میں اتنی دور تک صحیح سلامت آ گیا ہوں تو یقیناً اس سے آگے بھی پہنچ جاؤں گا۔ یہ سمندر ویران اور انجانا ہے اور دور تک کوئی بھولا بھٹکا جہاز بھی نظر نہیں آتا۔ اور یہ اس لئے ہے کہ اب تک ان سمندروں کے راستوں کا نقشہ تیار نہیں ہوا ہے۔ اور مارگریٹ! یہ نقشہ میں تیار کروں گا۔ کہو یہ قابلِ فخر بات ہوگی کہ نہیں۔!

مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب اور سرخرو لوٹوں گا۔ انسان چاہے تو کیا نہیں کر سکتا؟ وہ اپنی مستقل مزاجی سے پتھر کو موم کر سکتا ہے اور یقین محکم سے تاروں پر بھی کمندیں پھینک سکتا ہے۔

میں لوٹوں گا۔ یقیناً کامیاب لوٹوں گا۔

میرے لئے دعا کرتی رہو۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔

آر۔ والٹن

15 / اگست

ایک عجیب واقعہ ہے۔ ممکن ہے کہ ان کاغذات سے پہلے میں خود ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واقعے کی تفصیل اس خط میں، جو ممکن ہے تم تک مجھ سے پہلے نہ پہنچے، لکھ دوں۔

پیر کا دن تھا اور جولائی کی اکتیس تاریخ۔ ہمارے جہاز کو برف نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا اور اس سمندر کا پانی نظر نہ آتا تھا جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔ چنانچہ صورتِ حال خطرناک تھی۔ خصوصاً اس لئے کہ دھند بھی اتنی گاڑھی تھی کہ چند قدم دور کی چیز بھی نظر نہ آتی تھی۔ اگر میں اس دھند کو ٹھوس کہوں تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔

اس صورت میں سفر جاری رکھنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور تھا اور پھر خطرناک۔ چنانچہ جہاز کا لنگر ڈال دیا گیا اور ہم مناسب ہوا کا انتظار کرنے لگے۔ دو بجے کے قریب دھند چھٹ گئی اور اس وقت ہم نے دیکھا کہ ہمارے چاروں طرف، افق تا افق، برفستانی میدان سا چلا گیا تھا اور جگہ جگہ برف کے سفید سفید پہاڑ سے کھڑے تھے جو دیکھنے میں تو بھلے معلوم ہوتے تھے لیکن دراصل تھے

بڑے خطرناک۔ دائیں اور بائیں، آگے اور پیچھے بس برف کی چادر ہی بچھی ہوئی تھی۔ نہ کہیں کوئی جاندار نظر آتا تھا اور نہ کہیں کوئی درخت۔ نہ کہیں پہاڑ تھے اور نہ کہیں ندی نالے۔ بس برف ہی برف تھی اور برف کے پہاڑ تھے میرے ساتھیوں کے جی چھوٹ گئے اور خود میں پریشان ہو گیا۔

ہم اس پریشانی کے عالم میں تھے اور کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی کہ ایک متحرک چیز دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ ہمارے جہاز سے کوئی نصف میل دور ایک برف گاڑی، جس میں کتے جتے ہوئے تھے، حیرت انگیز تیزی سے شمال کی طرف جاتی نظر آئی برف گاڑی میں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسے انسان کہتے ہوئے ذرا جھجکتا ہوں۔ ویسے تھا تو وہ آدمی جیسا ہی۔ ہماری طرح اس کے دو ہاتھ تھے اور دو پاؤں۔ لیکن وہ قد میں دیو کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ کسی بھی انسان کا قد اتنا لمبا نہیں ہوتا۔ بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ زمانہ قدیم میں آدمی بڑے قد آور ہوا کرتے تھے۔ اگر یہ سچ ہے تو برف گاڑی میں بیٹھا ہوا وہ آدمی (بشرطیکہ وہ آدمی ہو) اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہو گا۔ ہم دوربین آنکھوں سے لگائے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کتوں کو یوں بھگا رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو جیسے دنیا کی ساری بلائیں اس کے پیچھے لگ گئی ہوں۔ برف گاڑی، جس میں وہ دیو بیٹھا ہوا تھا، برف کے تودوں کے عقب میں جا کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس منظر نے ہمیں حیرت زدہ کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم کسی بھی آبادی سے سینکڑوں میل دور آ گئے ہیں اور یہ کہ جہاں ہم ہیں کوئی ذی روح زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس اجنبی کو، جو پتہ نہیں کہاں سے آیا تھا اور کس طرف گیا دیکھ کے ہمیں اپنا پہلا خیال بدلنا پڑا۔ بہر حال ہم کسی بستی کے قریب، ممکن ہے ہوں لیکن اس تک پہنچنا بہر حال ناممکن تھا کیونکہ ہمارا جہاز برف میں پھنسا ہوا تھا اور ہم اسے ایک انچ بھی آگے نہ کھسکا سکتے تھے۔

اس واقعہ کے کوئی دو گھنٹے بعد سمندر کا، جو برف کی تہوں کے نیچے تھا، شور سنائی دیا۔ اور سطح پر جمی ہوئی برف بڑی مہیب آواز سے ٹوٹنے لگی اور رات ہونے سے پہلے ہمارا جہاز اس کی گرفت سے آزاد تھا لیکن ہم نے وہ رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھٹک جانے کا یا کسی نئی مصیبت میں پھنس جانے کا خوف تھا۔ اس خطے میں رات کا سفر کرنا بڑا خطرناک اور تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ برف ٹوٹ چکی تھی لیکن اس کے پہاڑ کے پہاڑ سمندر میں تیر رہے تھے اور ان میں سے کسی ایک سے بھی ہمارا جہاز ٹکرا کے پاش پاش ہو سکتا تھا۔

چنانچہ اس رات ہم نے لنگر نہ اٹھایا اور اس موقع کو غنیمت جان کر میں چند گھنٹوں کی نیند لینے کے لئے اپنے کیبن میں چلا گیا۔

صبح بیدار ہوتے ہی میں عرشہ پر پہنچا۔ سارے ملاح اور ملازم جہاز کے پچھلے حصے میں بھیڑ

لگائے ہوئے تھے اور جنگلے پر جھکے کسی سے باتیں کر رہے تھے اور وہ جس سے ملاح باتیں کر رہے تھے، جہاز پر نہ تھا۔ میں بھی وہاں پہنچا۔ برف کا ایک بڑا سا ٹکڑا بہتا بہتا تارات کے کسی حصے میں جہاز سے آلگا تھا۔ برف کے اس تیرتے ہوئے ٹکڑے پر ایک برف گاڑی تھی اور برف گاڑی میں جتے ہوئے کتے مر چکے تھے۔ صرف ایک زندہ تھا لیکن اس کی بھی آخری سانس معلوم ہوتی تھی۔ گاڑی میں ایک دیوانہ سا آدمی بیٹھا ہوا تھا جس سے میرے ملاح کہہ رہے تھے کہ وہ ہمارے جہاز میں آ جائے۔ یہ شخص پہلے کی طرح، جسے ہم نے اپنے جہاز سے نصف میل دور دیکھا تھا۔ زمانۂ قدیم کا انسان نہ تھا اور نہ ہی کسی انجانے ملک کا باشندہ تھا بلکہ وہ انگریز تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ملاحوں کے افسر نے اس اجنبی سے میرا تعارف کرایا۔

''یہ ہمارے جہاز کے کپتان ہیں۔ بے حد رحمدل، خلیق اور مہمان نواز ہیں۔ چنانچہ یقین رکھو کہ کپتان صاحب کبھی یہ گوارا نہ کریں گے کہ تم اس برفستانی دوزخ میں بھوکے اور پیاسے یا سردی سے ٹھٹھر کر مر جاؤ۔''

اجنبی نے مجھے انگریزی میں مخاطب کیا۔ وہ بدیسیوں کی سی انگریزی بولتا تھا۔

''اس سے پہلے کہ میں آپ کی دعوت قبول کروں'' اس نے کہا ''کیا آپ یہ بتائیں گے کہ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟''

اس کے اس سوال نے مجھے حیران کر دیا۔ اجنبی زندگی سے دور اور موت کے قریب تھا وہ اتفاقاً ہمارے جہاز سے آلگا تھا اور اس اتفاق پر وہ مارے خوشی کے دیوانہ تک بن سکتا تھا لیکن اس کے بشرے سے کسی طرح کی مسرت کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ اسے تو چاہیئے تھا کہ وہ میرے سامنے روتا اور گڑگڑاتا کہ میں اسے اس 'برفستانی جہنم' میں مرنے کے لئے نہ چھوڑ دوں۔

بہرحال میں نے اسے بتایا کہ ہم قطب شمالی کے انجانے خطوں کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور جہاز پر آنے کا ارادہ یوں ظاہر کیا گویا وہ ہم پر کوئی احسان کر رہا ہو۔

مارگریٹ! تم اس اجنبی کی حالت کا تصور نہیں کر سکتیں جو اپنے سوال کا اطمینان بخش جواب پانے کے بعد ہی جہاز پر آیا تھا۔ اس کے اعضاء سردی سے تقریباً اکڑ گئے تھے، بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور تھکن اور راہ کی مشکلات نے اسے نیم جان کر دیا تھا۔

ہم اسے کیبن میں لے آئے۔ لیکن کیبن میں آتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ چنانچہ ہم پھر اسے عرشے پر کھلی ہوا میں لے آئے۔ اور اس کے بدن پر برانڈی مل کے اسے گرمی پہنچانے لگے۔ ہم اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن ہماری کوششوں کے بعد اس میں زندگی کے تھوڑے بہت آثار نظر آئے تو ہم نے اسے کمبلوں میں اچھی طرح لپیٹ کر جہاز کی بھٹی کے قریب لٹا دیا۔ آہستہ آہستہ

اسے ہوش آنے لگا اور جب تھوڑا سا شوربہ اس کے حلق میں ٹپکایا گیا تو اس کے بدن میں جیسے نئے سرے سے جان پڑ گئی۔

دو دنوں تک وہ کچھ بولنے کے قابل نہ ہوسکا اور میں نے سوچا شاید مسلسل حادثات اور مصائب نے اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب کر لی ہیں۔

جب اس کی حالت ذرا ٹھیک ہوئی تو میں اسے اپنے کیبن میں لے آیا اور ہر ممکن طریقے سے اس کا علاج اور جی جان سے تیمارداری کرنے میں مصروف ہوگیا ایسے عجیب وغریب آدمی سے پہلے کبھی میرا سابقہ نہ پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی چمک تھی۔ جیسی کہ وحشیوں یا پاگلوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات جب وہ میری تیمارداری اور ہمدردانہ باتوں سے متاثر ہوتا، اس کی آنکھوں کی چمک مدھم پڑ کے احسان مندی اور شکریہ کی چمک میں تبدیل ہو جاتی۔ لیکن اس کی یہ چمک چند لمحوں تک ہی قائم رہتی۔ اس کے بشرے سے اس شخص کی سی افسردگی عیاں تھی جو زندگی میں کبھی اور کسی معاملہ میں کامیاب نہ رہا ہو۔ اور جس کا سب کچھ چھن گیا ہو یا اس شخص کی سی افسردگی جس کی زندگی میں شروع سے ہی ایک مہیب خلا ہو اور جس کی کوئی امید پوری نہ ہوئی ہو۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اکثر دانت پیسا کرتا تھا۔ کسی ہارے ہوئے اور مجبور دیوتا کی طرح۔ پھر یوں بھی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خیال اسے پریشان کئے ہوئے ہے۔ یا وہ ارادے جو پورے نہ ہوئے تھے بھوت بن بن کر اسے ڈرا رہے ہوں۔

جب میرے اس عجیب وغریب مہمان کی حالت ذرا سنبھلی تو میرے ملازم اور ملاح اس سے ملنے کے لئے بے تاب ہوگئے۔ وہ اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتے تھے۔ میں بڑی مشکلوں کے بعد انہیں اس سے باز رکھنے میں کامیاب ہوسکا میں نہ چاہتا تھا کہ اسے الٹے سیدھے سوالات سے پریشان کیا جائے۔ کیونکہ اس کے پاگل ہو جانے کا خوف لاحق ہوگیا تھا۔ میری ان کوششوں کے باوجود ملاحوں کا اس سے یہ پوچھ بیٹھنا کہ وہ اس ویران خطے میں کیوں آیا اور وہ بھی تنہا۔ اس سوال کا جواب اس اجنبی نے یوں دیا۔

''اس کی تلاش میں جو بھاگتا پھرتا ہے۔''

''اور وہ جو بھاگتا پھرتا ہے کیا ایسی ہی گاڑی میں سوار ہے جیسی گاڑی میں آپ سفر کرتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''تو میرا خیال ہے کہ وہ یہیں ہے۔ آپ کے آنے سے ایک دن پہلے ہم نے اسے بھی دیکھا تھا۔''

یہ سنتے ہی وہ اجنبی بڑی بے تابی سے اٹھ بیٹھا اور اس نے پوچھا۔

''وہ عفریت کس طرف گیا ہے؟ کب دیکھا تھا آپ نے اسے؟''

ملاحوں کے افسر نے مناسب وموزوں جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا تو اجنبی نے مجھ سے کہا۔

''میری شخصیّت آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لئے یقیناً ایک معمہ بن گئی ہوگی۔ تاہم حیرت ہے کہ آپ نے میرے متعلق کچھ نہیں پوچھا!''

''آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا اگر میں اپنے اشتیاق اور تجسّس سے بے تاب ہوکر آپ سے سوالات پوچھنے بیٹھ جاتا تو یہ میری خود غرضی یا زیادتی ہوتی۔''

چند ثانیوں تک خاموشی کا وقفہ رہا۔

''برف اچانک ٹوٹ گئی۔'' اس نے جیسے خواب میں کہا ''تو کیا یہ ممکن نہیں کہ برف کے یوں اچانک ٹوٹ جانے سے وہ برف گاڑی، جس میں وہ عفریت سوار تھا، مع اپنے مسافر کے غرق ہوگئی ہو؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا، کپتان صاحب، نہیں ہوسکتا؟''

''برف آدھی رات سے پہلے پوری طرح نہ ٹوٹی تھی'' میں نے جواب دیا ''اسی اثناء میں ممکن ہے وہ غرق ہی ہوگیا ہو، یا ممکن ہے جسے آپ عفریت کہتے ہیں دور نکل گیا ہو، یا کسی محفوظ مقام پر پہنچ گیا ہو۔ بہرحال یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔''

یہ سنتے ہی اس کے بدن میں برقی روسی دوڑ گئی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا کہ میں اسے عرشے پر لے جاؤں کیونکہ ممکن ہے، اس نے کہا کہ وہ برف گاڑی جس میں وہ عفریت سوار تھا، ہمیں پھر نظر آجائے۔ اسے کیبن میں ہی روکے رکھنے کے لئے مجھے لاکھ لاکھ جتن کرنے پڑے۔ وہ باہر جانا چاہتا تھا اور میں اندر ہی روکے رکھنا چاہتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ باہر کی سرد ہوا اس کے لئے مضر اور جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے بہرحال میں نے یہ کہہ کر اس کی تسلی کردی کہ میں ایک شخص کو عرشے پر متعین کئے دیتا ہوں کہ جیسے ہی وہ برف گاڑی نظر آئے، ہمیں فوراً خبر کردے تو یہ ہے میرے آج تک کے سفر کی روداد۔

ہمارے مہمان کی طبیعت سنبھلتی جارہی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ روبہ صحت ہے۔ کیونکہ اس کا امکان ہی نہیں۔ وہ خاموشی اور کسی خیال میں گم رہا کرتا ہے اور کیبن میں میرے علاوہ اگر کوئی اور آدمی آجاتا ہے تو اجنبی کے بشرے سے حد درجہ بے چینی عیاں ہونے لگتی ہے۔ جہاز کے سب ملازم اس سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان سب کو اجنبی سے کچھ انسیت سی ہوگئی ہے۔ لیکن اجنبی ان سے بہت کم، اور وہ بھی مجبوراً گفتگو کرتا ہے۔

اب رہا میں۔ تو میں اسے اپنے بھائی کی طرح چاہنے لگا ہوں۔ اس کی حالت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور تمہیں تعجب ہوگا مارگریٹ کہ اسے ملول اور رنجیدہ دیکھ کے میں بھی اداس رہنے لگا ہوں۔ میرا یہ عجیب وغریب مہمان کسی زمانے میں بے حد خوبرو ہوگا۔ حالانکہ اس وقت بھی، جبکہ اس کے

بدن میں سوائے ہڈیوں اور کھال کے کچھ نہیں ہے، وہ خاصا قبول صورت معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی شریف اور باعزت خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے۔

میں نے اپنے کسی خط میں لکھا تھا کہ میں نا آشنائے دوست رہا ہوں اور اب میری آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی، لیکن خدا کی قدرت دیکھو مارگریٹ کہ ویران خطے میں، جہاں کسی بھی انسان کے ملنے کی امید نہیں ہوسکتی، مجھے ایک دوست اور بھائی مل گیا۔

میں اپنے مہمان کے متعلق، بشرطیکہ کوئی خاص بات ہوئی، اپنے خطوط میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گا۔ میری طرف سے بے فکر رہو میں خیریت سے ہوں۔

13/ اگست

اپنے اس پراسرار مہمان سے میری محبت بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اسے یوں افسردہ اور بے چین نہیں دیکھ سکتا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسے کیا تکلیف ہے! میرا بس نہیں چلتا کہ اس کی ہر تکلیف اپنا لوں۔ مبالغہ نہ جاننا مارگریٹ بعض دفعہ میرا جی چاہتا ہے کہ وہ بچ جائے اور اگر موت کو ایک جان کی ہی ضرورت ہے تو وہ میری جان لے لے۔

مصائب نے، جو پتہ نہیں کیا ہیں، اس کی روح تک کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ مسلسل حادثات اور لگا تار سفر کی وجہ سے اس کا گوشت گھل کر رہ گیا ہے اور میرا دوست، ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن...... خدا کرے کہ وہ نہ مرے وہ بے حد زیرک، ہوشیار اور مخلص شخص ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ ان حالوں کو کیونکر پہنچا اور اس دنیا کے غیر آباد گوشے میں کیوں اور کس طرح آ گیا!

اس کی طبیعت بہت حد تک سنبھل گئی ہے۔ کمزوری بھی دور ہوگئی ہے۔ چنانچہ وہ اکثر عرشے پر آ کر کھڑا ہوتا ہے اور افق پر نظریں گاڑے گھنٹوں تک۔ جانے کیا دیکھتا یا دیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔! میرے خیال میں تو اسے اس برف گاڑی کی تلاش ہے جس میں ایک دیو قامت شخص بیٹھا ہوا تھا۔

میرا یہ مہمان دنیا اور زندگی سے بیزار معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ہمارے کاموں اور باتوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس نے مجھ سے میرے متعلق اور ہماری اس مہم کے متعلق سوالات پوچھے۔ میں نے کچھ بھی چھپائے بغیر اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے میری باتیں سنتا رہا اور پھر کہا کہ اگر حالات اجازت دیتے تو وہ بڑی خوشی سے اس مہم میں میرا شریک ہو جاتا اور میں نے کہا کہ میں اپنی مہم کو یہیں ختم کرتا ہوں، تاکہ اسے اپنے ساتھ واپس لے چلوں۔ کیونکہ میں نے کہا، یہ مہم تو پھر بھی انجام تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ لیکن خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرسکوں گا کیونکہ زندگی دوبارہ نہیں ملتی اور اس کی زندگی میری مہم سے زیادہ اہم ہے۔

جب میں انتہائی جوش کے عالم میں یوں کہہ رہا تھا تو اس کا سفید چہرہ اور بھی سفید ہو گیا، اس کے ہونٹوں کے کونے کانپے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔ میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ اجنبی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس کے منہ سے دل چیر جانے والی آہ نکلی اور پھر اس نے کہا۔

''میرے دوست! تم نہیں جانتے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یقین مانو تم میرے دکھ اپنا نہ سکو گے۔ مجھ سے دوستی کرنا خود اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ میرے محسن! کوئی غلط فیصلہ کرنے سے پہلے میری کہانی سن لو اس کے بعد...... یقین ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو گے...... ہاں میری کہانی سننے کے بعد یقیناً تم مجھے اپنا دوست بنانا نہ چاہو گے۔ میرے جلو میں موت چلتی ہے میرے محسن......''

میرا اشتیاق انتہا کو پہنچ گیا۔ میں اس کی کہانی سننے کے لئے بیتاب ہو گیا لیکن وہ اس قابل نہ ہوا تھا کہ اپنی طویل داستان حیات سنا سکتا۔ کیونکہ ذرا سا بولنے پر اس کی سانس پھول جاتی تھی۔ یقین ہے کہ دو تین دن بعد وہ اپنی کہانی مجھے سنا دے گا۔ تب تک مجھے صبر سے کام لینا چاہیے۔ کہیں میری جلد بازی اس کے لئے تباہ کن ثابت نہ ہو۔

اس نے اپنے جذبات پر قابو حاصل کر کے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ وہ مجھ سے میرے متعلق پوچھنے لگا اور اس دفعہ اس نے میرے بچپن اور نوجوانی کے حالات پوچھے۔ میں نے اپنی کہانی تفصیل سے سنا دی اور پھر یہ کہتے کہتے اداس ہو گیا کہ میرا کوئی دوست نہیں۔

''دنیا میں غالباً ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے گا'' میں نے کہا۔ ''جس کی مسرتیں مکمل ہو چکی ہوں اور تمام آرزوئیں پوری ہو گئی ہوں۔ ہر ایک کو خدا سے کچھ نہ کچھ گلا ہمیشہ رہا ہے۔ اور آپ جانئے اس بد نصیب کو کبھی مسرت حاصل ہو ہی نہیں سکتی جس کا کوئی دوست نہ ہو۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے کہا ''کبھی میرا بھی ایک دوست تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ چنانچہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ دوست اور دوستی کیا ہوتی ہے واقعی ایک آدمی بغیر دوست کے نہیں رہ سکتا۔ لیکن آپ کو مایوس نہ ہونا چاہیئے آپ کو ایک نہ ایک دوست مل جائے گا...... لیکن میرے لئے اب کوئی امید نہیں اس دنیا میں میرے لئے اب کچھ نہیں رہ گیا ہے۔''

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ اپنے کیبن میں چلا گیا۔

19 / اگست

کل اس نے مجھ سے کہا۔

''کپتان والٹن! یہ تو آپ نے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا کہ میں ایک بدقسمت آدمی ہوں اور روحانی و جسمانی تکلیفیں برداشت کر چکا ہوں اور اب بھی کر رہا ہوں۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی کہانی کسی کو نہ سناؤں گا اور میرا راز میرے ساتھ قبر میں دفن ہو جائے گا۔ لیکن آپ کی محبت اور ہمدردی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ کپتان والٹن! آپ کو نئی نئی دریافتیں اور تجربات کرنے کا شوق ہے۔ آپ قدرت کے اسرار معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی میری بھی یہی حالت تھی۔ میں بھی اپنے دائرہ علم کو وسیع تر کرنا چاہتا تھا۔ خدا کرے آپ کا یہ شوق تحقیق، سانپ بن کر خود آپ کو نہ ڈس لے۔ کپتان والٹن! وہ میرا تجسس اور شوق ہی تھا جس نے میری یہ حالت کر دی۔ میں بے یار و مددگار ہوں۔ اب میرا کوئی نہیں، اب دنیا مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ اب زندگی میرے لئے ایک عذاب ہو کر رہ گئی ہے۔ میں بہت پہلے مر چکا ہوتا۔ لیکن ایک کام پورا کرنے کے لئے زندہ رہا۔ لیکن اب وہ کام بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو یہ نتیجہ ہے قدرت کے اسرار معلوم کرنے کی کوشش کا۔ ہو سکتا ہے کہ میری کہانی سننے کے بعد آپ ارادہ بدل کر یہیں سے واپس لوٹ جائیں۔ میری داستان آپ کو عجیب و غریب، ناقابلِ یقین اور شاید مضحکہ خیز معلوم ہو۔ تاہم یہ جان لو کہ دنیا میں ہر چیز ممکن ہے اور ہمیں ان باتوں پر بھی یقین کرنا پڑتا ہے جو بظاہر ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں۔ اب رہا مضحکہ خیز ہونے کا سوال تو کپتان صاحب آدمی کو بعض دفعہ، خدا اور اس کی خدائی بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔

مجھے یہ اندازہ لگاتے دیر نہ لگی کہ اس کی کہانی بے حد غمناک ہوگی اور یہ کہانی سناتے وقت اس کی پچھلی یادیں تازہ ہو جائیں گی اور اسے کافی سے زیادہ روحانی اذیت برداشت کرنا پڑے گی۔ چنانچہ میں نے کہا کہ وہ اپنی کہانی مجھے اور کسی کو بھی نہ سنائے اور یہ کہ میں اسے روحانی کرب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ حد درجہ خود غرضی ہوگی۔

''اس ہمدردی کا شکریہ۔'' اس نے کہا ''لیکن اب خاموش رہنے سے کیا فائدہ میری بدقسمتی مکمل ہو چکی اور مصائب قریب الختم ہیں۔ مجھے صرف ایک بات کا انتظار ہے۔ میری صرف ایک آرزو ہے، وہ پوری ہو لے تو میں نہایت اطمینان سے مروں گا...... نہیں...... کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حالت سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ اس دنیا میں میرے بہت ہی تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ میری بدقسمتی پر مہر لگنا تھی لگ چکی۔ اب اسے نہ میں توڑ سکتا ہوں نہ آپ۔''

پھر اس نے کہا کہ وہ دوسرے دن مجھے اپنی کہانی سنائے گا۔ اور دوسرے دن اس نے اپنی کہانی شروع کی۔ میں اس سے جو کچھ سنتا رات کو اسی کے لفظوں میں لکھ لیتا۔ چنانچہ اب جو مسودہ تیار ہوا ہے اور جسے تم دلچسپی سے پڑھو گی ایک عجیب و غریب اور بھیانک کہانی ہے۔ اس قدر بھیانک کہ میں اکثر راتوں کو نیند میں چونک چونک اٹھتا ہوں اور یقین ہے کہ یہ کہانی پڑھتے وقت کبھی تو تمہیں

ٹھنڈے پسینے چھوٹ جائیں گے، کبھی مارے خوف کے تم چیخ اٹھو گی اور کبھی تمہاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ پہلے کبھی تم نے اور کسی نے بھی اتنی ہیبت ناک اور غمناک کہانی نہ سنی ہوگی۔ بے حد عجیب، رونگٹے کھڑے کر دینے والی اور غمناک کہانی ہے۔ یہ میرے پہلے اور آخری دوست کی۔ تو سنو، یوں ہے اس کی کہانی۔



پہلا حصہ

فرنکسٹائن کی کہانی

اُس کی زبانی

پہلا باب

میرا نام وکٹر فرنکسٹائن ہے اور میں جنیوا کے ایک شریف اور مشہور خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے اجداد سالہا سال تک جمہوریہ کے رکن رہے ہیں اور انہوں نے عوام کی خدمت کی ہے۔ وہ ہر دلعزیز تھے اور میرے والد بھی ہر دلعزیز تھے۔ ہر شخص خواہ غریب ہو یا امیر، ان کے سامنے احتراماً جھک جاتا تھا۔ اپنی نوجوانی کے دور میں وہ جمہوریہ کے سرگرم رکن رہے اور کسی اور طرف متوجہ نہ ہوئے۔ چنانچہ اس وقت انہوں نے شادی بھی نہ کی۔ اور جب وہ ایک بیوی کے شوہر اور ایک کنبے کے مربی بنے تو ان کی جوانی ڈھل چکی تھی۔

یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ ان کی شادی کس طرح اور کن حالات میں ہوئی۔ ان واقعات سے آپ والد صاحب اور خود میرے کردار کو سمجھ سکیں گے۔ ان کے دوستوں میں ایک شخص تاجر تھا جو عروج کی بلندیوں کو چھونے کے بعد دفعتہً زوال کی پستیوں میں جا پڑا تھا۔ تجارت اس کی ایسی ٹھپ ہوئی وہ جو دوسروں کو قرض دیا کرتا تھا مقروض ہو گیا۔ بوفرٹ (یہی اس تاجر کا نام تھا) خوددار اور وضع دار آدمی تھا۔ چنانچہ اس کی غیرت نے یہ بات گوارا نہ کی کہ وہ مفلسی کی حالت میں اس شہر میں رہے جہاں وہ امیر اور سب سے زیادہ باعزت تسلیم کیا جاتا تھا اور نہ ہی اسے یہ منظور تھا کہ لوگ جنہوں نے ہمیشہ اسے شاندار لباس میں دیکھا تھا، میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھیں اور نہ وہ یہ ہی گوارہ کر سکتا تھا کہ ان سڑکوں پر سے پیدل گزرے جن پر سے کبھی اس کی چار گھوڑوں والی شاہانہ قسم کی بگھی گزرتی تھی تو لوگ سڑکوں کے کنارے اور مکانوں میں احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرض ادا کرنے کے بعد وہ اپنی بیٹی کو لے کر ''لوکرین'' چلا گیا اور وہاں گمنامی اور تنگدستی میں اپنی زندگی گزارنے لگا۔ بوفرٹ والد صاحب کا عزیز ترین دوست تھا۔ والد صاحب کو اس کے بغیر قرار نہ آتا تھا۔ چنانچہ جب وہ یوں خاموشی سے چلا گیا تو والد صاحب کے دن اداس اور راتیں افسردہ ہو گئیں۔ وہ زیادہ دنوں تک اس کی جدائی برداشت نہ کر سکے اور آخرکار اپنے دوست کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ میرے والد صاحب کے پاس کافی روپیہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ بوفرٹ ان کے روپیہ سے پھر تجارت شروع کر کے اپنا پچھلا وقار اور مقام حاصل کر لے۔

بوفرٹ نے اپنے آپ کو چھپانے کی ہر ممکن تدبیر کر لی تھی۔ چنانچہ والد صاحب دس مہینے سے پہلے تو اس کا پتہ معلوم نہ کر سکے غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان دس مہینوں میں والد صاحب چین

سے نہ بیٹھے تھے۔ جب والد صاحب کو اپنے دوست کا پتہ معلوم ہوا تو وہ مارے خوشی کے نیم پاگل ہو گئے اور سیدھے اپنے دوست کے گھر پہنچے جو مزدوروں کے محلے میں ایک تنگ گلی میں واقع تھا۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ حد درجہ فلاکت کا پتہ دیتی تھی اور کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس تنگ و تاریک گھر میں رہنے والا کبھی اپنے وطن کا امیر ترین شخص تصور کیا جاتا تھا۔

بوفرٹ تھوڑی سی رقم، جو اس نے بچا رکھی تھی، لے کر "لوکرین" آیا تھا۔ اس رقم سے چند مہینوں تک اس کی اور اس کی بیٹی کی ضروریات زندگی پوری ہوئی۔ بوفرٹ کا خیال تھا کہ اسے کسی منڈی وغیرہ میں ملازمت مل جائے گی اور اس کی تنخواہ سے بہرحال کام چل جائے گا۔ چنانچہ وہ ملازمت تلاش کرنے لگا لیکن قسمت چونکہ روٹھ چکی تھی اس لئے کامیابی نہ ہوئی ایک یہی پریشانی کیا کم تھی کہ اوپر سے پچھلے خوشگوار دنوں کی یاد اسے پریشان کیا کرتی تھی۔ وہ متواتر تین مہینے تک ملازمت تلاش کرتا رہا لیکن ہر جگہ سے ناکام لوٹا دیا گیا۔ اور ہر ناکامی اس کی تلخیوں میں اضافہ کرتی گئی۔ بوفرٹ اس روحانی اذیت کو برداشت نہ کر سکا اور تیسرے مہینے کے آخری دنوں میں وہ ایسا بیمار ہوا کہ پھر کسی قابل نہ رہا۔

بیٹی کیرولین اپنے والد کی تیمارداری کرنے لگی اور اس نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کی تھوڑی سی جمع پونجی بہت دنوں تک ان کا ساتھ نہ دے سکی اور نہ ہی وہاں کوئی ایسا تھا جو ان کی مدد کرتا۔ چنانچہ کیرولن ہوتے سوتے کام کرنے لگی۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح خوددار اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا پسند نہ کرتی تھی۔ بہرحال وہ گلی محلے کے کپڑے سی سلا کر اور رسیاں بٹ کر اتنا کما لیتی کہ ایک وقت کا کھانا اپنے والد کے ساتھ کھا سکتی۔

چند مہینے اسی طرح گزر گئے۔

بوفرٹ کا مرض دن بدن زور پکڑتا گیا۔ چنانچہ اب کیرولن ہر وقت اپنے والد کے پاس ہی رہنے لگی اور چنانچہ اسے کام کر کے کچھ روپیہ پیدا کرنے کا وقت نہ ملا اور نوبت فاقوں تک پہنچی۔ آخر کار دسویں مہینے بوفرٹ نے اپنی بیٹی کی گود میں ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ کیرولن دنیا میں بے سہارا اور مفلس تھی۔ اس آخری حادثے نے کیرولن کی ہمت اور مستقل مزاجی کی دیواریں ڈھا دیں اور وہ اپنے مردہ باپ کے سینے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

عین اس وقت میرے والد اس مکان میں داخل ہوئے جہاں ان کے عزیز ترین دوست کی لاش بے کفن پڑی تھی۔ میرا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ والد صاحب گویا ایک فرشتۂ رحمت تھے جنہیں قدرت نے عین اس وقت اس موت کے مکان میں بھیج دیا جہاں ایک بے سہارا اور بے کس لڑکی خود اپنی موت کی دعائیں مانگ رہی تھی، یا شاید خودکشی کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔

والد صاحب نے اپنے دوست کی تجہیز و تکفین سے فراغت حاصل کی اور کیرولن کو لے کر واپس جنیوا آ گئے اور اسے یعنی کیرولن کو، اپنے ایک عزیز کی حفاظت میں دے دیا۔ اس واقعہ کے دو سال بعد کیرولن والد صاحب کی زوجیت میں آ گئی۔

میرے والدین کی عمروں میں کئی برس کا فرق تھا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عمر کا فرق میاں بیوی کو مل کر رہنے نہیں دیتا۔ اور بعض اوقات تو کم عمر بیوی اپنے معمر شوہر سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات نہ تھی وہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے اور میرے والد تو صحیح معنوں میں اپنی بیوی کی پرستش کیا کرتے تھے۔ والدہ چونکہ بہت زیادہ دکھ برداشت کر چکی تھیں۔ چنانچہ والد صاحب ہر ممکن طریقے سے انہیں خوش رکھتے حتیٰ کہ ان کے ادنیٰ اشارے پر دنیا کی ہر چیز حاضر کر دی جاتی۔

اپنی شادی کے ابتدائی دو برس والد صاحب اپنے تمام تر مشاغل اور فرائض سے دور ہوتے چلے گئے۔ پچھلے آزمائشی واقعات نے والدہ کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ چنانچہ والد صاحب انہیں لے کر اٹلی چلے گئے۔ آب وہوا کی تبدیلی سے والدہ کی صحت پھر بننے لگی اور اس ملک کے دلچسپ قدرتی مناظر نے انہیں اپنی طرف اس طرح متوجہ کیا کہ پچھلی تلخ یادوں کی شدت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔

وہ دونوں اٹلی سے جرمنی اور وہاں سے فرانس گئے۔ میں ان کا پہلا لڑکا نیپلز میں پیدا ہوا۔ اور اپنے والدین کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومتا رہا۔ اس وقت میں کمسن تھا۔ میری پیدائش کے چند سال بعد تک ان کی کوئی دوسری اولاد نہ ہوئی چنانچہ ان دونوں کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔ اماں مجھے دیکھ کر مسکراتیں اور ابا مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر اچھلتے اور ناچتے۔ میں ان کا جیتا جاگتا کھلونا اور ان کی امیدوں کا سہارا تھا۔ میں ان کی ہر آرزو اور ہر خواہش کا محور تھا۔ وہ دونوں کئی گھنٹوں تک بیٹھے میرے مستقبل کے متعلق اندازے لگایا کرتے۔ مجھے اپنے والد کا عزم، خوش مزاجی اور ہوشیاری اور والدہ کا صبر و تحمل ورثے میں ملا تھا۔

کئی سالوں تک میں ان کی تنہا اولاد رہا۔ والدہ کو ایک لڑکی کی بڑی آرزو تھی اور وہ اکثر اپنے شوہر سے اس کا ذکر کرتی تھیں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی جب میرے والدین سیر و سیاحت کے لئے اٹلی پہنچے اور جھیل کومد کے مناظر نے انہیں ایسا مسحور کیا کہ انہوں نے وہاں ایک ہفتے کے لئے ڈیرے ڈال دیئے۔ میرے والدین کو، خصوصاً میری والدہ کو، غریبوں سے خاص انسیت تھی۔ چنانچہ وہ اکثر ان کی جھونپڑیوں میں جایا اور ان کی ہر ممکن امداد کیا کرتے تھے۔ کیونکہ والدہ خود فلاکت کا مزہ چکھ چکی تھیں اس لئے غریبوں کے دکھ درد سے واقف تھیں۔

قصہ مختصر ایک دن میرے والدین بستی کے باہر تفریح کر رہے تھے کہ ان کی نظر ایک بے حد خستہ جھونپڑی پر پڑی جس کے باہر بہت سے ننگ دھڑنگ بچے کھڑے جھونپڑی والوں پر قہقہے لگا رہے

تھے۔ والدہ صاحبہ اس منظر سے بے حد متاثر ہوئیں اور چار دن بعد، جب والد صاحب کسی کام کے سلسلے میں ''ملان'' گئے تو وہ مجھے ساتھ لے کر اس جھونپڑی میں پہنچیں، اور وہاں ہم نے ایک غمناک اور اثر انگیز منظر دیکھا ایک کاشتکار اور اس کی بیوی، جن کے جسم پر ایک کپڑا بھی سالم نہ تھا، پانچ نیم عریاں بچوں کو، جن کی آنکھوں سے کئی دنوں کی بھوک جھانک رہی تھی۔ کھانا کھلا رہے تھے ان پانچ بچوں میں سے ایک لڑکی خصوصاً والدہ کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ یہ لڑکی دوسرے چار بچوں سے رنگ و روپ میں مختلف تھی۔ چاروں بچوں کی رنگت گندمی اور آنکھیں کالی تھیں۔ لیکن لڑکی کا رنگ کھلتا ہوا اور آنکھیں نیلی اور بدن بھی نازک تھا وہ کسی طرح بھی اس کاشتکار کی لڑکی معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کے بال ریشمی اور سنہرے تھے حالانکہ وہ بھی میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی لیکن کسی غریب کی بیٹی معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کے بشرے سے عجیب شان اور شرافت عیاں تھی ماتھا بلند تھا، ہونٹ سرخ اور بالائی ہونٹ محرابی۔

یہ دیکھ کر والدہ حیرت اور پیار سے اس بچی کی طرف دیکھ رہی تھی، کاشتکار نے اس بچی کی غمنا کی کی کہانی مختصراً سنادی۔ وہ واقعی ان کی بیٹی نہ تھی بلکہ ''ملان'' کے ایک شریف آدمی کی بیٹی تھی۔ لڑکی کی ماں جرمن تھی جو اس کی پیدائش کے زمانے میں مرگئی، چنانچہ یہ لڑکی کاشتکار کی بیوی کو دے دی گئی کہ وہ اسے دودھ پلائے۔ اس وقت وہ اتنے مفلس نہ تھے ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا اور ان کے پہلے بچے کی پیدائش بھی ابھی ابھی ہوئی تھی۔ لڑکی کا باپ اٹلی کے عوام کا نمائندہ تھا اور ملک کو آزادی دلانے کی خاطر حکومت سے برسرِ پیکار۔ معلوم نہیں کہ وہ مر گیا یا اب بھی یہ آسٹریا کے زنداں میں اپنی زندگی کے آخر دن پورے کر رہا ہے۔ حکومت نے اس ''باغی'' کی جائیداد ضبط کر لی۔ چنانچہ وہ اپنے رضاعی والدین کے ساتھ رہ رہی تھی اور اس جھونپڑے میں سب سے الگ تھلگ اس پھول کی مانند معلوم ہوتی تھی جو گھورے پر اُگ آنے کے باوجود لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اور جب والد صاحب ''ملان'' سے واپس آئے تو انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ مکان کے بڑے کمرے میں ایک بے حد پیاری لڑکی، جس کی رنگت دودھ کی طرح تھی، میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ والدہ صاحبہ نے انہیں بچی کی پوری کہانی سنادی اور کہا کہ اگر اجازت دیں تو بچی کاشتکار سے لے کر وہ گود لے لیں۔ والد صاحب تو جیسا میں نے کہا، والدہ کی کوئی درخواست ٹھکراتے ہی نہیں تھے چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی کی یہ درخواست بخوشی قبول کر لی۔ کاشتکار اور اس کی بیوی سے اس سلسلے میں گفتگو کی گئی۔ وہ دونوں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اپنے سے جدا کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنی حالت سے بھی واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس بچی کو وہ کچھ نہ دے سکیں گے پھر وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ ان کے بعد خدا جانے اس بچی کا کیا ہو۔ بہت ممکن

تھا کہ خود ان کی اولاد اپنی اس دودھ شریک بہن کو نکال باہر کرے۔ بہرحال کوئی جواب دینے سے پہلے انہوں نے گاؤں کے پادری سے گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور چند دنوں بعد ہی الزابیتھ لیوانزا ہمارے گھر کی ایک فرد اور میری شریک بن گئی۔ اور ایسا حسین ساتھی کبھی کسی کو نہ ملا ہوگا۔

ہر شخص کو الزابیتھ سے محبت تھی اور وہ تھی بھی اس قابل۔ حسین، خوش مزاج اور زیرک۔ الزابیتھ کو گھر لانے سے ایک دن پہلے والدہ نے ہنس کر کہا تھا۔

''میں اپنے وکٹر کو بے حد عمدہ اور قابل قدر تحفہ دوں گی۔''

اور جب دوسرے دن انہوں نے الزابیتھ کو میرے سامنے پیش کیا تو ان کے الفاظ کو یاد کر کے میں نے نہایت مسرت اور بچگانہ سنجیدگی سے سوچا کہ ''والدہ اسے میرے لئے لائی ہیں۔ چنانچہ وہ میری ہے۔ صرف میری۔ میں اس کے ساتھ کھیلوں گا، اس سے محبت کروں گا، اس کی حفاظت کروں گا اور اسے خوش رکھوں گا'' اور میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ یوں پکڑ لیا جیسے اب دنیا کی کوئی طاقت ہم دونوں کو الگ نہ کر سکے گی۔ میری اس حرکت پر والدہ صاحبہ مسکرائیں۔ میں الزابیتھ کو گھر سے لے آیا اور اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔

ہم بہت جلد گھل مل گئے۔ دنیا کی کسی زبان میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں جو ہم دونوں کے رشتہ کو سمجھا سکے۔ وہ میرے لئے ایک بہن نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر تھی۔

وہ میری......صرف میری تھی۔



دوسرا باب

چنانچہ اس طرح ایک ہی گھر، ایک ہی خاندان اور ماحول میں ہم دونوں کی پرورش ہوئی، میری اور الزابیتھ کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ میں اس سے زیادہ سے زیادہ دس مہینے بڑا ہوں گا اور یہ کوئی فرق نہ ہوا۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپس کی نااتفاقی، جھگڑوں اور اس حسد سے، جو بچوں میں عموماً پایا جاتا ہے، کوسوں دور تھے۔ ہم دونوں میں قابل رشک اتحاد تھا اور اور ہماری محبت مثالی۔ الزابیتھ کی پسند اور میری پسند مختلف تھی۔ الزابیتھ کے مزاج اور میرے مزاج میں بعد المشرقین تھا، لیکن مزاج کا یہ تضاد ہمیں ایک دوسرے سے دور نہ کرسکا۔ الزابیتھ فطرتاً صابر اور مستقل مزاج تھی۔ اس کے برخلاف میں عجلت پسند اور ذرا ذرا سی بات گھبرا جانے والا تھا۔ اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ الزابیتھ شاعروں کے دیوان پڑھا کرتی تھی اور ہر منظر کو شاعر کی نظر سے دیکھنے کی عادی تھی۔ طوفانِ بادوباراں، رات کا سناٹا، کھلے اور گھنے جنگلات، الپس کی برف پوش چوٹیاں، موسم سرما کا سکوت اور برف باری اور موسم گرما کے جھکڑ اس پر عجیب اثر کرتے اور وہ مسحور سی ہو جاتی۔ اس کے برخلاف میں نے متجسس طبیعت پائی تھی۔ چنانچہ میں ہر چیز کا کھوج لگانے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتا۔ "ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کس طرح ہوتا ہے؟ دنیا میرے نزدیک ایک طلسم خانہ تھی جس کے اسرار معلوم کرنے کی آرزو میرے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ زندگی کہاں ہے؟ کیوں ہے؟ کیسی ہے؟ عناصر کیا ہیں؟ جسم کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ موسموں کا ردوبدل کون سے اٹل قانون کا نتیجہ ہے؟...... یہ سوال تھے جنہیں حل کرنے کی کوشش میں اپنے چھوٹے سے دماغ کی تمام تر قوتیں صرف کر دیتا تھا اور کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ کر بے تاب اور بے چین ہو اٹھتا تھا۔

میری عمر سات سال کی تھی جب میرا ایک اور بھائی پیدا ہوا اور اس کی پیدائش کے ساتھ ہی میرے والدین نے اپنی بنجاروں کی سی زندگی ترک کر دی اور اپنے آبائی وطن میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ جنیوا میں ہمارا ایک ذاتی مکان تو تھا ہی دوسرا مکان بیلرائیوں میں تالاب کے کنارے خرید لیا گیا جو شہر کے ہنگاموں سے دور تھا۔ چنانچہ ہماری زندگی میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ ویسے میں خود بھی بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی سے گھبراتا تھا۔ چنانچہ اسکول میں بھی، میں اپنے ہم جماعتوں سے دور ہی دور رہتا۔ البتہ ایک لڑکے سے میری گہری دوستی تھی۔ اس کا نام ہینری کلیرول تھا اور وہ جنیوا کے ایک

تاجر کا لڑکا تھا۔ وہ بے حد ذہین، ہوشیار اور مہم جو تھا چنانچہ خطرات سے کھیلنا پسند کرتا، وہ بہادروں کی کہانیاں اور سیاحوں کے قصے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ پھر وہ خود جوشیلی نظمیں اور مہماتی کہانیاں لکھنے لگا وہ طالب علموں کے ساتھ کھیل بھی ایسے ہی کھیلا کرتا تھا جس میں خود وہ ہیرو ہوتا جو کسی بے حد خطرناک مہم پر جاتا۔ مثلاً پریوں کے دیس میں جہاں وہ کوئی مظلوم شہزادی کو بچانے کے لئے کسی زبردست دیو سے جنگ کرتا، یا اس کے کھیلوں کا ہیرو کوئی نائٹ ہوتا جو میدان جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا۔

میرا بچپن ایسا گزرا جیسا کہ کسی کا نہ گزرا ہوگا۔ ہم پر سختی کرنا تو ایک طرف رہا والدین کبھی ہمیں ڈانٹتے تک نہ تھے۔ ہماری ہر ضد فوراً پوری کر دی جاتی تھی، چنانچہ میرا بچپن بے فکری اور مسرتوں سے معمور تھا۔

میں کم وقت میں، جیسا کہ میں نے کہا، زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتا تھا اور س معاملے میں ضرورت سے زیادہ جلد باز واقع ہوا تھا۔ چنانچہ میری یہ جلد بازی بعض دفعہ مجھے اعصابی ہیجان میں مبتلا کر دیتی اور میں نہ صرف بے چین رہنے لگتا بلکہ مجھے چپ سی لگ جاتی۔

مجھے نہ لسانیات سے دلچسپی تھی، نہ قانون سے اور نہ ہی سیاست سے، مجھے قدرت سے دلچسپی تھی اور میں قدرت کے اسرار معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ زندگی کیا ہے؟ وہ کس طرح وجود میں آتی ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے وغیرہ۔ ہینری اپنے موضوع سے چپکا رہا۔ قدرتی مناظر اسے بھی مسحور کرتے تھے، لیکن وہ دوسرے ہی لمحے انہیں بھول کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس کے برخلاف میں جو کچھ دیکھتا، اس پر رات گئے تک غور کیا کرتا تھا۔

الزابیتھ بھی ہمارے ساتھ خوش تھی۔ اس کا حسن نکھر آیا تھا جو ہمارے گھر کو یوں منور رکھتا تھا جیسے ایک مقدس دیا کسی چھوٹے سے معبد کو۔ وہ میری تھی۔ اس کا ملکوتی تبسم میرا تھا۔ اس کی شیریں آواز میرے لئے تھی۔ اس کی ہمدردیاں میرے لئے تھیں۔ وہ سرتاپا ایک مجسم محبت تھی۔ موسم سرما کی دھوپ کی طرح نرم وگرم اور تسکین بخش۔ اس کی خوش مزاجی اور اس کے قہقہے مجھ پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو میں یقیناً بدمزاج اور ضدی ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ اکثر میرے دل میں طوفان سے اٹھا کرتے تھے۔ میں فوراً کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میں فوراً ساری دنیا کا علم سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ میری اس قسم کی فطرت نے مجھے پاگل کر دیا ہوتا۔ میں قنوطی بن گیا ہوتا لیکن الزابیتھ نے مجھے سنبھالے رکھا۔ اس کی مترنم آواز اس کی مسکراہٹ ہر وقت میری ڈھارس بندھایا کرتی تھی۔ اب رہا ہینری۔ تو اس کی شرافت میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر الزابیتھ اسے اس کے جوشیلے منصوبوں کے کھوکھلے پن سے آگاہ نہ کرتی اور اس کی مہم جو طبیعت کے آگے اپنے دلائل کی دیوار نہ

کھڑی کر دیتی تو وہ بھی یقیناً وحشی بن جاتا اور ایسا کریم النفس، بے تعصب اور مکمل انسان نہ ہوتا۔ چنانچہ اگر میں یہ کہوں تو نامناسب نہ ہوگا کہ ہینری جو کچھ بھی تھا الزابیتھ کی وجہ سے تھا۔ ایسے سلجھے ہوئے خیالات کی لڑکی کم سے کم میری نظر سے تو آج تک گزری نہیں۔

میں اپنے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے ایک عجیب طرح کا روحانی سکون اور مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ وہ میری خوش بختی اور مسرت کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد تو بدقسمتی میرا تعاقب کرتی رہی اور مجھے کہیں کا نہ رکھا اور میری وہ حالت کر دی جیسی کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

اور پھر میرے خیالات، جو ہر چیز کی تحلیل کرنا چاہتے تھے اور ہر چیز کو اپنے حلقے میں لے آتے تھے، صرف ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ میرے دل میں ایک عجیب جذبے نے جنم لیا اور یہی جذبہ آخر کار میری تباہی کا باعث بنا۔ ابتدا میں یہ جذبہ قطعی شدید اور خطرناک نہ تھا۔ وہ اس ندی کی طرح تھا جو کسی پہاڑ کے شگاف میں سے ننھے ننھے سے جھرنوں کی شکل میں پھوٹ نکلی ہو لیکن آگے بڑھ کر خطرناک اور ناقابلِ عبور بن جائے۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے یہ جذبہ شدت اختیار کرتا گیا اور آخر کار سیل بے پناہ بن کر میری امیدوں اور خوشیوں کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

اور وہ طبیعات کا مکمل علم حاصل کرنے کی دھن تھی اور یہی وہ دھن تھی جس نے میری قسمت پر سیاہ مہر لگا دی۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں اس واقعہ کا ذکر کروں جس کی وجہ سے میں اس خاص علم کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

اس وقت میری عمر تیرہ سال کی تھی۔ ہم تھانوں کے چشموں پر چھٹی منانے گئے ہوئے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بغیر کسی تمہید کے بارش نے ہمیں آلیا بارش موسلا دھار تھی۔ چنانچہ چشموں کے کنارے پر کے گھنے درخت ہمیں پناہ نہ دے سکتے تھے۔ اس لئے ہم قریب کے سرائے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ وہاں ایک کتاب، جو مشہور سائنسدان کارنے لیواس اگریپا کی تصنیف تھی، میرے ہاتھ لگ گئی۔ میں وقت گزاری کے لئے اس کی ورق گردانی کرنے لگا لیکن بہت جلد اس کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ مصنف نے عجیب وغریب مسائل پر بحث کر کے حیران کن نتائج اخذ کئے تھے۔ میرے دماغ میں ایک نئی اور سنسنی خیز روشنی پھیلنے لگی۔ میرے ذہن کی ساری کھڑکیاں دفعتہً بند ہو گئیں اور صرف ایک کھڑکی کھل گئی۔ مارے خوشی کے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنی منزل کا سراغ پا لیا ہے۔ یہی وہ منحوس کتاب تھی جس نے مجھے طبیعات کی طرف پوری طرح مائل کر دیا۔ میں نے اس کتاب کا ذکر والد سے کیا۔ انہوں نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔

''اوہ! کارنے لیواس اگریپا! وکٹر! میرے بچے! پھینکو اس کافر کتاب کو۔ یہ شخص پاگل ہے اور

عجیب، بعید از قیاس اور واہیات باتیں لکھتا ہے۔"

بے پروائی سے یہ الفاظ کہنے کے بجائے اگر والد صاحب نے یہ بات میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہوتی کہ جدید تحقیقات نے اگر یبا کے سارے نظریات غلط ثابت کر دیئے ہیں اور دلائل سے ثابت کر دیا ہوتا (اور ایسا کہہ سکتے تھے کہ جدید ایجادات قدیم کے مقابلے میں زیادہ سلجھی ہوئی اور سہل الحصول ہیں تو میں یقیناً اس کتاب کو پھینک دیتا اور پھر کبھی اس مصنف کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ والد صاحب میری دلی کیفیت سے واقف نہ تھے چنانچہ انہوں نے جس بیزاری سے اور تقریباً مضحکہ خیز انداز میں وہ کتاب لوٹا دی اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ والد صاحب اگر یبا اور اس کی اس خاص کتاب کے مواد سے قطعاً ناواقف ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ کتاب مجھے اور بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوئی اور میں نے اس کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔

گھر واپس آتے ہی میں نے بڑی کوشش کے بعد اس مصنف کی ساری کتابیں خرید لیں اور پھر "پارے لس" اور اوبرٹس کی کتابیں بھی میری الماری میں نظر آنے لگیں۔ ان مصنفین کے وحشت انگیز تصورات اور خیالات کا مطالعہ میں نے ایک عجیب طرح کی اندرونی خوشی اور سنسنی محسوس کر کے کیا۔ ان کتابوں کے مسائل مجھے اس دفینے کی طرح معلوم ہوئے جس سے کوئی واقف نہ تھا۔ اس دفینے کا پتہ میں نے پالیا تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قدرت کے اسرار معلوم کرنے کا مجھے خبط تھا۔ اور جدید فلسفیوں اور سائنسدانوں کی تحقیقات اور دلائل مجھے مطمئن نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب میں اسکول سے گھر لوٹتا تو ایک طرح کی تشنگی محسوس کرتا۔

بڑے سے بڑا فلسفی بھی مجھے سطحی اور کم علم معلوم ہوتا۔ اس نے بہت زور مارا تو یہ کیا کہ قدرت کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اس کی جھلک دکھا دی اور بس۔ قدرت کی گہرائیوں اور روح میں جھانکنے کی کوشش نہ کرتا اور کبھی کی بھی تو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ماریں۔ یہ فلسفی قدرت کے پراسرار قصر کی ایک ایک اینٹ نہ صرف گنا دیتے بلکہ اس کا نام بھی بتا دیتے لیکن یہ بتا سکتے کہ اس قصر میں آخر ہے کیا؟ وہ اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرتے۔ بس باہر سے قصر کی ساخت پر سرسری سا تبصرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ لیکن میں اس قصر میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس کے اسرار معلوم کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں ان مصنفوں کی طرف متوجہ ہو گیا جن کے خیالات کو "واہیات" کہا گیا تھا۔ لیکن یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے زیادہ سے زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش کی تھی اور ایک حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ وہ قدرت کے ایسے بہت سے اسرار سے واقف تھے جن سے جدید فلسفی اب تک واقف نہ ہوئے تھے غالباً ان کی اسی جرأت نے انہیں کلیسا کی طرف سے "کافر" کا خطاب دلوایا تھا۔ چنانچہ میں بھی انہیں "کافروں" کا شاگرد بن گیا اور اس طرح یہ ہوا کہ اسکول میں باقاعدہ

تعلیم حاصل کرنے کے باوجود میں ''خود آموز'' تھا، اٹھارویں صدی میں یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوگی۔ تاہم یہ حقیقت ہے اور ایسا اس لئے ہوا کہ اسکول کی تعلیم مجھے مطمئن نہ کرسکی اور نہ ہی میری تشنگی دور کرسکی۔ اس لئے میں نے تعلیم اپنے طور پر حاصل کی۔ اسکول جانا محض دکھاوا تھا۔ اور اگر یپا، پارے بس اور برٹس میرے استاد تھے۔

والد صاحب کو سائنس سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ وہ میری راہبری نہ کرسکے نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایک راستے پر، جو میں نے شروع سے ہی پسند کرلیا تھا، یہ سوچے بغیر کہ غلط ہے یا صحیح، آنکھیں بند کر کے چلتا رہا۔ میں نے دوسرے تمام علوم کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور صرف علم الابدان اور علم کیمیا کا ہوکر رہ گیا اور نہایت خوشی کے عالم میں سوچا کہ اگر میں نے امراض کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ اگر میں جسم کو ہر بیماری سے سوائے موت کے، محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ میرا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا اور دنیا قیامت تک میرا نام نہایت احترام سے لیتی رہے گی۔

اور پھر میرے استادوں نے نہایت ٹھوس دلائل سے ثابت کردیا تھا کہ ہم مردوں کی روحیں بلا سکتے ہیں، شیاطین کو اپنے قبضے میں کرسکتے ہیں اور بھوتوں کو قبروں میں سے اٹھا سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کسی مردے میں (بشرطیکہ اسے مرے زیادہ دیر نہ ہوئی ہو) یا انسانی ڈھانچہ بنا کے اس میں جان ڈال سکتے ہیں۔ میں تو اپنے استادوں کی ہر بات کو سند تسلیم کر ہی لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب میں اس میدان میں ناکام تجربات کرنے لگا اور میں نے اپنی ناکامیوں کو اپنے استادوں کے غلط استدلال سے نہیں بلکہ خود اپنی کوتاہیوں اور ناتجربہ کاری سے تعبیر کیا بہر حال میں ہمت نہ ہارا میں تجربات کرتا رہا، ہزاروں متضاد نتائج اخذ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک اور واقعہ ہوا جس نے ایک بار پھر میرے خیالات کا رخ موڑ دیا۔

اس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی اور ہم اپنے مضافاتی مکان میں جو تالاب کے کنارے پر تھا، مقیم تھے۔ ایک رات وہاں زبردست طوفان بادوباراں پھٹ پڑا۔ جب تک طوفان قائم رہا میں اس کی دم بدم بڑھتی ہوئی شدت کا مطالعہ حیرت سے اور دلچسپی سے کرتا رہا۔ میں دروازے میں کھڑا طوفان کا نظارہ کررہا تھا کہ دفعتہً شاہ بلوط کے ایک تن آور درخت سے جو ہمارے گھر سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا، شعلے نکلنے لگے۔ موسلا دھار برستے ہوئے پانی میں وہ تن آور درخت کے بجائے اب وہاں ایک ٹھونٹھ سا کھڑا ہوا تھا۔ صبح جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات کو اس درخت پر بجلی گری تھی اور وہ تناور درخت لکڑی کی ایک پچھی سی ہوکر رہ گیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں بجلی کی حیرت انگیز قوت سے واقف ہوا، اتفاق ایسا ہوا کہ اس وقت ایک مشہور سائنسدان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اس واقعہ سے ایسا متاثر ہوا کہ جوش میں آکر اپنے اس

نظریئے کی تفصیل بیان کرنے لگا جو اس نے بجلی اور اس کی قوتوں کے استعمال کے متعلق قائم کیا تھا۔ اس کی تحقیق میرے لئے نئی اور انوکھی تھی۔ اس سائنسدان نے جو کچھ کہا۔ اس نے میرے استادوں کی تحقیقات کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اور وہ تمام تجربات، جو میں کرتا رہا تھا، مجھے بے حد احمقانہ معلوم ہوئے۔ چنانچہ میں طبیعات سے برگشتہ خاطر ہو کر ریاضیات کی طرف جھک پڑا۔ کیونکہ میرے خیال میں اس علم کی بنیادیں ٹھوس، مضبوط اور مکمل تھیں اور میں اپنا مقصد سائنس کی اس شاخ کے ذریعہ حاصل کرسکتا تھا۔

جب میں اپنے ماضی کی طرف نظر کرتا ہوں تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ پہلے سے ہی میرے لئے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ میری بربادی کا سبب میرے خیالات کا وہی موڑ ہو جو اس سائنسدان کی تشریح اور شاہ بلوط پر بجلی گرنے سے پیدا ہو گیا تھا۔ اگر وہ واقعہ، جو دوسروں کے لئے معمولی اور میرے لئے غیر معمولی تھا نہ ہوا ہوتا تو آج میری یہ حالت نہ ہوئی ہوتی۔ آج میں اس برفستان میں ہونے کے بجائے اپنے گھر میں نرم گرم بستر پر دراز ہوتا اور میرے بچے میرے سامنے کھیل رہے ہوتے۔ ہاں اگر وہ واقعہ نہ ہوا ہوتا تو میں دنیا کا خوش نصیب آدمی ہوتا۔ اگر وہ واقعہ نہ ہوا ہوتا تو زندگی میرے لئے عذاب نہ بن جاتی۔ لیکن ہونی کو کون روک سکا ہے؟ وہ واقعہ ہوا۔ شاہ بلوط پر بجلی گری، سائنسدان نے اپنے نظریئے کی تفصیل بیان کی۔ نتیجہ یہ کہ میں اس برفستانی ویرانے میں بے یارومددگار مر رہا ہوں۔ میں نے وہ کیا جو کوئی نہ کرسکا تھا میرا ایسا حال ہوا جیسا کسی کا نہ ہوا ہوگا۔ اب میری زندگی کا صرف ایک مقصد رہ گیا ہے۔ کسی بھی طرح ''اس شیطان'' کا خاتمہ کر دینا۔ اگر میں نے ''اس'' کا خاتمہ کر دیا، اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو پھر میں سکون سے مر سکوں گا زندگی اب مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ میری بدقسمتی مکمل ہو چکی۔ دنیا میں میرے لئے اب کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ چنانچہ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ میں زندہ نہ رہوں گا۔ لیکن ایک کام۔ ایک کام مجھے کرنا ہے اور وہ ہے اس ''دجال'' کا خاتمہ کرنا۔



تیسرا باب

میری عمر تیرہ سال کی تھی جب مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اینجلو اسٹیڈ یونیورسٹی میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ میرے رخصت ہونے کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے مجھے اپنی زندگی کی پہلی روحانی تکلیف اور اضطراب کا تجربہ ہوا۔ اور یہ میرے بعد کے دکھوں کی تمہید تھی۔

الزابیتھ اچانک لال بخار میں مبتلا ہوگئی۔ ہم نے بڑی کوششوں سے والدہ صاحبہ کو الزابیتھ کی تیمارداری سے باز رکھا۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ الزابیتھ کی زندگی خطرے میں ہے تو پھر ہماری ہر کوشش رائیگاں ہی ثابت ہوئی والدہ الزابیتھ کی تیمارداری کرنے لگیں۔ وہ ہر وقت اپنی چہیتی کے پلنگ پر بیٹھی رو رو کر خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتیں۔ والدہ کی تیمارداری اور دعائیں آخری بار آور ہوئیں۔ الزابیتھ بچ گئی لیکن تیسرے دن خود والدہ بستر علالت پر پڑی تھیں۔ انہیں سنسنا کر بخار چڑھا اور ساتھ ہی ان کے بدن پر چنے برابر دانے نکل آئے۔ ڈاکٹر ان کی زندگی سے مایوس ہوگئے۔ خود والدہ کو احساس ہوا کہ اب وہ اس بستر سے اپنے آپ اٹھنے والی نہیں۔ پھر وہ کڑا وقت آ پہنچا جب انہوں نے ہم سب کو بلایا اور الزابیتھ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر بولیں۔

"خوش رہو میرے بچے! میں تمہارا سہرا نہ دیکھ سکوں گی۔ لیکن اس دنیا سے خوش اور مطمئن جاؤں گی کہ الزابیتھ کا ہاتھ اپنے وکٹر کے ہاتھ میں دے چکی ہوں۔ الزابیتھ! میرے بعد میرے بچوں کی ماں تم ہوگی۔ ہمیشہ ان کا خیال رکھنا اور کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ تم میرے وکٹر کی بیوی بنوگی۔ الزابیتھ! چنانچہ اپنے شوہر کے پیچھے میرے دوسرے بچوں کو نہ بھول جانا۔ خدا حافظ میرے بچو۔ خدا تمہیں خوش رکھے اور تم پھلو پھولو۔"

اور یوں والدہ اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے بیان کی مجھ میں طاقت ہے کہ والدہ کی موت کا ہم سب پر کیا اثر ہوا؟...... کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ وہ پیاری اور محبت بھری آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی اور فرشتوں کا سا چہرہ جس سے ہر دم پیار ٹپکا کرتا تھا سرد ہو چکا ہے اور وہ ہاتھ جو ہمارا سر سہلایا کرتے تھے ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح بے جان ہیں۔ غم کا پہاڑ ٹوٹنا کسے کہتے ہیں اس کا تجربہ ہمیں والدہ کے انتقال پر ہوا۔

لیکن زمانہ سب سے بڑا حکیم واقع ہوا ہے جو دل کے ہر زخم کو بتدریج مندمل کر دیتا ہے۔ دنیا ایک عجیب میلہ ہے جس میں گم ہو کر آدمی اپنے پچھلے غم بھول جاتا ہے۔ کیونکہ دوسرے غم اس کے منتظر

ہوتے ہیں۔

والدہ صاحبہ کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ہم زندہ تھے چنانچہ ہماری ضروریات زندگی بھی قائم تھیں۔ لوگ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں لیکن دنیا کا چکر چلتا رہتا ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ رفتہ رفتہ سب ہمیں بھول جائیں گے حتیٰ کہ ہماری اولاد بھی ہم کو یاد نہ کرے گی۔ کوئی جانے گا بھی نہیں کہ اس نام کا کوئی آدمی کبھی اس دنیا میں سانس لیتا تھا...... آہ! ایسی ہے دنیا...... خود غرض، ظالم اور بے درد...... معاف کرنا کپتان صاحب کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کر کہانی سے دور ہٹ گیا۔

خیر والدہ صاحبہ کے انتقال کی وجہ سے مقررہ تاریخ کو اینجلو اسٹیٹ روانہ نہ ہو سکا۔ چنانچہ دوبارہ دن اور تاریخ مقرر کی گئی اور یہ تاریخ خود میں نے مقرر کی۔ کیونکہ میں چند ہفتوں تک اپنے ہی لوگوں میں رہنا چاہتا تھا کہ میرا غم کسی قدر ہلکا ہو جائے۔ اس کے علاوہ والدہ کی موت کے بعد خود الزابیتھ ملول اور اداس رہنے لگی تھی اور میں اسے اس حال میں چھوڑ جانا نہ چاہتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ حتی الامکان اپنا غم چھپائے ہوئے تھی، اور ہم سب کو تسلی دینے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت، کانپتے ہوئے ہونٹ اور آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز اس کی دلی کیفیت ظاہر کئے دیتے تھے۔ اگر اس وقت میں روانہ ہو گیا ہوتا تو میرا دل گھر اور الزابیتھ میں لگا رہتا۔

آخر کار میرے روانہ ہونے کا دن آ گیا۔ ہینری نے وہ شام ہمارے یہاں گزاری۔ میں نے اور والد صاحب نے ہینری کے باپ کو اس بات پر راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی میرے ساتھ بھیج دیں لیکن وہ حضرت ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس وقت ہینری میرے ساتھ آیا ہوتا تو میری زندگی کی کہانی کچھ اور ہوتی۔ ہینری کا باپ ایک تنگ نظر اور کنجوس تاجر تھا۔ چنانچہ اسے اپنے بیٹے کی عالی حوصلگی اور علم حاصل کرنے کی حد سے بڑھی ہوئی تمنا میں خود اپنی بربادی کے سامان نظر آتے تھے۔ چنانچہ اس وقت ہینری کو میرے ساتھ آنے کی اجازت نہ ملی۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اس کے باپ کی تنگ نظری اور کنجوسی اس کے بلند ارادوں کے آگے روک نہ بن سکے گی اور ہینری ایک نہ ایک دن اپنے ارادے کو جامۂ عمل پہنا کر رہے گا۔

ہم رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہم ایک دوسرے کو الوداع نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ لفظ باوجود کوشش کے ہماری زبان پر نہ آتا تھا۔ آخر کار ہینری مجھ سے رخصت ہوا لیکن اس طرح کہ وہ پھر مجھ سے ملے گا۔ جیسے میں کہیں جا نہ رہا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں نے گویا انجان بن کے، خدا حافظ کے بجائے شب بخیر کہا۔

لیکن صبح سویرے ہی جب میں اس گاڑی میں سوار ہوا جو لے جانے والی تھی تو میرے سب عزیز

وہاں موجود تھے۔ والد صاحب نے میری پیشانی چومی، ہینری نے مجھ سے مصافحہ کیا اور الزابیتھ نے چپکے سے میرے کان میں کہا ''وکٹر! خط ہمیشہ لکھتے رہا کرنا۔''

میں گاڑی میں ایک طرف اداس سا بیٹھ گیا اور خیالات ہجوم کر آئے۔ میں اپنے آبائی وطن، گھر اور عزیزوں سے دور جا رہا تھا۔ یہاں میں نے کبھی تنہائی محسوس نہ کی تھی۔ لیکن، وہاں میں کم سے کم چند ہفتوں تک، تنہائی محسوس کروں گا۔ وہاں نئے سرے سے مجھے اپنی زندگی کا آغاز کرنا ہوگا۔ نئے ماحول اور نئے لوگوں سے اپنے آپ کو مانوس کرنا ہوگا۔ کوئی میرے غم اور پریشانیوں میں شریک نہ ہوگا۔ میرے بھائی، ہینری اور الزابیتھ میرے اپنے تھے انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی۔ وہ میرے ساتھ اور میں ان کے ساتھ قہقہے لگاتا تھا۔ وہ لوگ میری فطرت اور میرے مزاج سے واقف تھے اور پھر میری طبیعت بھیڑ بھڑکے سے گھبراتی تھی۔ میں غیر لوگوں کے بیچ میں عجیب طرح کی بے چینی محسوس کیا کرتا تھا۔ انجانے لوگوں کے ساتھ گھل مل نہ سکتا تھا۔ خدا جانے میری کیا حالت ہوگی؟

کیا میں اکیلا اور سب سے الگ تھلگ رہوں گا؟ یہ اور ایسے بہت سے حالات تھے جو مجھے پریشان کر رہے تھے۔ گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا گھر اور اس کے دروازے پر کھڑے ہوئے میرے عزیز نظر سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے اور میرا دل ڈوب سا رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے وطن اپنے لوگوں سے دور جا رہا تھا۔

گاڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے سکون ہونے لگا۔ میں بہر طور علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ علم حاصل کرنے کی پیاس مجھے بے قرار رکھا کرتی تھی۔ اور میں اکثر، جب اپنے گھر میں تھا، ایک کونے میں بیٹھا سوچا کرتا تھا کہ علم حاصل کرنے کے لئے میں ملکوں ملکوں بھٹکتا پھروں گا اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کروں گا۔ اور میرا وہ خواب پورا ہو رہا تھا۔ چنانچہ مجھے اداس ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیئے تھا۔ میں تحصیل علم کے لئے جا رہا تھا۔ آوارہ گردی کرنے کے لئے نہیں۔ اور اسی خیال نے میری ڈھارس بندھائی۔ میری اداسی رفتہ رفتہ پگھلنے لگی اور وہ منحوس خیالات، جو مجھے پریشان کر رہے تھے، دفعتہً غائب ہو گئے۔ مجھے اپنے عزیزوں کے چھوٹنے کا غم ضرور تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بہت جلد اس غم کی بھی شدت کم ہو جائے گی۔

سفر خاصا طویل اور اکتا دینے والا تھا۔ پورے راستے میں ایسی ہی باتیں سوچتا اور خود اپنی ڈھارس بندھاتا رہا۔ یہاں تک کہ شہر کی سفید عمارتیں اور گرجے کا بلند مینار نظر آیا اور ساتھ ہی دو متضاد احساسات نے میری کچھ عجیب حالت کر دی۔ خوشی کا احساس اور خوف کا احساس۔ گاڑی شہر میں داخل ہوئی میں دھڑکتا دل لئے اترا۔ شہر نیا تھا لوگ نئے تھے۔

مجھے اپنے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی میں تعارفی خطوط لے کر، جو میں اپنے ساتھ لایا تھا، کئی پروفیسروں سے ملا۔ اور اتفاق ایسا ہوا، بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ بدقسمتی سے، جو وطن سے میرے ساتھ ساتھ میری تباہی کا سامان لے کر چلی تھی، سب سے پہلے طبیعات کے پروفیسر مسٹر کریمپ سے ملا۔ مسٹر کریمپ خاصے بدصورت اور بے ڈول آدمی تھے۔ لیکن اپنے فن میں یکتا تھے۔ انہوں نے مجھ سے کئی سوالات پوچھے۔ خصوصاً طبیعات کے متعلق۔ میں نے ان کے ہر سوال کا جواب مناسب و موزوں دیا۔ پھر انہوں نے مجھ سے میرے پسندیدہ مصنفوں کے متعلق پوچھا۔ میں نے اگریپا وغیرہ کے نام بتا دیئے۔

پروفیسر کریمپ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''کیا واقعی ایسی واہیات کتابوں کے مطالعہ میں تم نے اپنا وقت برباد کیا ہے؟''

''جی ہاں'' میں نے الجھ کر جواب دیا۔

''نوجوان!'' وہ جوش میں آ کر بولے۔ ''مجھے کہنے دو کہ تمہارا اتنا بہت سا وقت محض بیکار گیا۔ حیران ہوں کہ تم کون سے جنگل میں رہتے تھے جہاں کوئی ایسا نہ تھا جو تمہیں تمہاری اس فاش غلطی سے آگاہ کرتا! یوں تو تم احمق معلوم نہیں ہوتے کیا تمہیں بھی اس کا احساس نہ ہوا کہ تم جن نظریات اور مسائل کا مطالعہ کر رہے ہو وہ محض بے کار اور کھوکھلے ہیں؟ اگریپا کے ایک بھی شاگرد کو اس زمانے میں پانا ناممکن بات تھی۔ لیکن میں اپنے سامنے اس بے وقوف شخص کے ایک شاگرد کو دیکھ رہا ہوں اور حیران ہوں کہ کیا کہوں! بہر حال، نوجوان، اب تمہیں نئے سرے سے اپنی تعلیم کا آغاز کرنا ہوگا۔ کیونکہ اب تک تم جھک مارتے رہے ہو۔''

پروفیسر صاحب نے طبیعات کی کتابوں کی فہرست بنائی اور مجھے دیتے ہوئے بولے۔

''یہ کتابیں پڑھو سمجھے۔ اسی ہفتے میں اور پروفیسر والڈن طبیعات اور کیمیا پر لیکچر دینے والے ہیں۔ تم ان میں ضرور شریک ہونا۔ ممکن ہے ہم تمہارے دماغ کا بھُس جھٹکنے میں کامیاب ہو جائیں۔ بس اب جاؤ۔''

میں مطمئن اور خوش لوٹا۔ شاہ بلوط پر بجلی گرنے والے واقعہ کے بعد میں اپنے پسندیدہ مصنفوں کی طرف سے برگشتہ ہو گیا تھا۔ تاہم ان نئے مصنفوں کو جن کی کتابوں کی فہرست پروفیسر صاحب نے بنا دی تھی، پڑھنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہ تھا۔ پروفیسر کریمپ بدصورت اور موٹے تھے اور ان کی آواز بھی پھٹی ہوئی اور کچھ عجیب سی تھی۔ چنانچہ، وہ اپنے فن میں ماہر ہونے کے باوجود مجھے مرعوب نہ کر سکے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی شخصیت سے میں ذرا بھی مرعوب نہ ہوا اور نہ ہی وہ اگریپا اور اس قسم کے دوسرے سائنسدانوں کے اثر کو میرے دماغ سے دور کر سکے کیونکہ بعض اوقات نقش اول نقش آخر ثابت ہوتا ہے

اور یہی میرے ساتھ ہوا۔

ابتدائی تین دن پروفیسروں سے ملتے گزرے اور پھر مجھے پروفیسر کریمپ کی وہ اطلاع یاد آئی جو انہوں نے اپنے اور پروفیسر والڈن کے لیکچر کے متعلق دی تھی۔ پروفیسر کریمپ کو سننے کی میری کوئی خواہش نہ تھی۔ البتہ میں پروفیسر والڈن کو سننا اور ان سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ وہ چند دن کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور میں ان سے مل نہ سکا تھا۔

اور کچھ تو شوقِ تجسس سے اور کچھ وقت گزاری کے خیال سے میں لیکچر روم میں پہنچا۔ چند منٹوں بعد پروفیسر والڈن بھی آ گئے۔ وہ اپنے ساتھی پروفیسر کریمپ سے قطعی مختلف تھے۔ ان کی عمر پچاس سال کی ہوگی۔ چہرے پر مسٹر کریمپ جیسی کرختگی نہ تھی۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ پست قد تھے اور سینہ تان کر چلتے تھے۔ آواز میں عجیب طرح کا لوچ اور شیرینی تھی۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور آدمی سنتا رہے۔ انہوں نے اپنے لیکچر کی ابتدا علم کیمیا کی تاریخ سے کی اور مختصر لفظوں میں بتایا کہ سائنس دانوں نے اس کی مختلف شاخوں میں کیا تجربات کئے اور کیسی تحقیقات کیں۔ کیمیا کے ماہروں پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد انہوں نے آخیر میں جو باتیں کیں؟ میں انہیں کبھی نہ بھولوں گا۔

انہوں نے کہا:۔

''قدیم کیمیا گروں نے باتیں تو بہت لمبی چوڑی کی ہیں حتیٰ کہ ناممکن کو ممکن بنانے کا بھی یقین دلایا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ خود کچھ نہ کر سکے۔ اس کے برخلاف جدید سائنسدانوں نے ہمیں بہت کم باتوں کا یقین دلایا ہے۔ چنانچہ وہ یہ نہیں کہتے کہ دھات کے جوہر بدلے جا سکتے ہیں۔ لیکن انہیں سائنسدانوں نے جو قدیم کے مقابلے میں جو شیلے نوجوان اور حقیر معلوم ہوتے ہیں اور جن کی آنکھیں خوردبین سے چپکی رہتی ہیں۔ حقیقت میں عجیب و غریب باتوں کا کھوج لگایا ہے اور ان کی یہ تحقیقات معجزات سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ لوگ قدرت کی کمین گاہوں سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ قدرت کن اصولوں پر کیا کام کرتی ہے۔ انہی کی بدولت ہم دوران خون کے عمل سے واقف ہوئے، انہی کی کوششوں سے تنفس کا راز، راز نہ رہا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے بادہ و باراں کے طوفان کو قبضے میں کرنے کے طریقے سے ہمیں آگاہ کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں عناصر پر حکومت کرنے کے گر بتائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو زلزلوں کا مذاق اڑاتے اور اس عالم کا، جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے، منہ چڑاتے ہیں۔''

تو ایسے تھے پروفیسر والڈن کے الفاظ جنہوں نے میرے دل و دماغ پر ایک خاص اثر کیا اور میری تباہی و بربادی کی راہیں کھول دیں۔ پروفیسر صاحب نہایت جوش کے عالم میں بولتے گئے اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری روح ایک انجانے مگر زبردست دشمن سے دست بہ گریباں ہے۔ قدیم بت،

جنہیں میں اب تک پوجتا آیا تھا، یکے بعد دیگرے ٹوٹ رہے تھے اور ان کی جگہ نئے بت لیتے جا رہے تھے، دماغ پر مدت سے چھائی ہوئی دھند چھٹ رہی تھی اور میرے گڈمڈ اور دھندلے خیالات صاف اور واضح ہوتے جا رہے تھے اور پھر میں نے ایک آخری اور قطعی فیصلہ کیا۔ میں نے اپنی ایک نئی اور انوکھی منزل مقرر کر لی۔

وکٹر! یہ سب تجربات کئے جا چکے ہیں۔ میری شیطان روح نے سرگوشی کی، طوفان، زلزلوں اور عناصر کے راز معلوم کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ تمہیں کچھ اور کرنا ہے ایک ایسا کام جو آج تک کوئی نہ کر سکا۔ تمہیں زندگی کا راز معلوم کرنا ہے۔ تمہیں تخلیق کے اسرار پر سے پردے اٹھانے ہیں۔ حیات اور موت۔ ان دو قوتوں کو قبضے میں کرنا اور انہیں انسان کا غلام بنانا ہے۔

اور میری وہ رات بہت بے قرار گزری۔ میں ایک عجیب طرح کی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ میرا بدن تپ رہا تھا۔ میری روح خدا جانے کون سے انجانے گوشوں میں بھٹک رہی تھی کہ میں جاگتے میں عجیب وغریب خواب دیکھ رہا تھا۔ صبح ہو رہی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی اور جب میں بیدار ہوا تو مجھے اپنے پچھلے خیالات ایک خواب پریشاں محسوس ہوئے۔ چنانچہ سوائے اس کے اور کوئی بات سمجھ میں نہ آئی کہ میں اپنے آپ کو اسی سائنس کے لئے وقف کر دوں جس طرف شروع سے میرا رجحان تھا۔ تاہم مجھے قرار نہ آیا۔

میں پروفیسر والڈن سے ملا۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور نہایت اعلیٰ اخلاق سے پیش آئے۔ چنانچہ میں نے بلا جھجک اپنی ابتدائی تعلیم اور اپنے پسندیدہ مصنفوں کا قصہ انہیں سنا دیا۔ وہ غور و توجہ سے سنتے رہے۔ اگریپا اور پارے بس کے نام سن کر مسکرائے لیکن ان کی اس مسکراہٹ میں قطعی وہ نفرت و حقارت نہ تھی جو میں نے مسٹر کریمپ کی مسکراہٹ میں دیکھی تھی۔

جب میں خاموش ہوا تو انہوں نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی لوگ سائنس کے باوا آدم ہیں۔ انہوں نے جدید سائنسدانوں کے لئے نئی نئی راہیں کھول دی ہیں اور علم کے تاریک افقوں کو بہت حد تک روشن کر دیا ہے۔ جدید سائنسداں ان لوگوں کا جتنا بھی احسان مانیں کم ہے۔''

میں نے ان مصنفوں کے متعلق پوچھا جن کی فہرست پروفیسر کریمپ نے مجھے دی تھی۔

''نوجوان!'' انہوں نے کہا ''میں خوش ہوں کہ ایک عرصے کے بعد مجھے ایک شوقین شاگرد ملا ہے۔ اگر تمہارا یہ ذوق وشوق سمندر کا جھاگ نہ ثابت ہوا اور تمہاری صلاحیتوں اور قابلیت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا تو تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ کیمیا، طبیعات کی انتہائی لچکدار شاخ ہے۔ اس کی بہت سی اصلاحیں کی گئی ہیں اور بہت سی اصلاحوں کی اب بھی گنجائش ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے لئے یہی علم پسند

کیا۔ لیکن دوسرے علوم سے بے بہرہ نہ رہا۔ اگر کوئی شخص صرف کیمیا کا ہی ہو کر رہ جائے اور دوسرے علوم کی طرف متوجہ نہ ہو تو مرتے دم تک اچھا سائنسداں نہ بن سکے گا۔ اور اس کا کوئی خواب پورا نہ ہوگا۔ اگر تم واقعی سائنسدان بننا چاہتے ہو تو طبیعات کی ہر شاخ کا عموماً اور ریاضیات کا خصوصاً مطالعہ کرو۔

پھر پروفیسر والڈن مجھے اپنی تجربہ گاہ میں لے گئے جہاں انہوں نے مجھے بہت سی مشینیں دکھائیں اور ان کی بناوٹ اور کاموں پر مختصر سا لیکچر دیا۔ اور آخر میں وعدہ کیا کہ جب میں ذرا ہوشیار اور تجربہ کار ہو جاؤں گا تو ان کی مشینیں مستعار لے سکوں گا۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے نہایت ضروری کتابوں کی، جو ان کے خیال میں مجھے پڑھنی چاہئیں، فہرست طلب کی۔ فہرست لے کر میں نے پھر ان کا شکریہ ادا کیا۔

اور اس طرح میری زندگی کا وہ یادگار دن ختم ہوا جس نے مستقبل کا آخری فیصلہ کر دیا۔



چوتھا باب

چنانچہ اس دن سے کیمیا اور ریاضیات میرے خاص موضوع تھے۔ میں نہایت ٹھوس اور دقیق کتابوں کا مطالعہ کرتا، ہر لیکچر میں شریک ہوتا اور یونیورسٹی کے سائنسدانوں سے ملتا۔ حتیٰ کہ پروفیسر کریمپ کا گنواروں کا سا لہجہ اور بدمزاجی بھی مجھے بُری نہ معلوم ہوتی۔ قدیم نظریات پر وہ سخت تنقید کرتے اور مسکرانے کے بجائے ان کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ پر غور کرتا۔ چنانچہ پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ ان کے خیالات بے بنیاد نہ تھے اور نہ ان کی باتیں متعصانہ ہوتی تھیں۔ لیکن میں پروفیسر والڈن سے بے حد متاثر تھا۔ وہ استاد سے زیادہ میرے دوست تھے انہوں نے میری بہت سی الجھنیں دور کر دی تھیں اور وہ ہر وقت میری ہمت بندھاتے اور مناسب مشورے دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں میرے تجربات بڑے بے قائدہ اور کچھ مایوس کن رہے اور میں زیادہ محنت بھی نہ کر سکا۔ آہستہ آہستہ میرا شوق بڑھتا گیا اور پھر تو یہ حالت ہوگئی کہ تارے صبح کی روشنی میں مدھم پڑنے لگتے اور سورج طلوع ہوتا تو مجھے اپنی تجربہ گاہ میں دیکھتا۔

میں نہایت ذوق وشوق اور ایک خاص لگن سے محنت کر رہا تھا چنانچہ بہت جلد میں نے ترقی کی منازل طے کرلیں۔ چنانچہ میرے ذوق وشوق نے طلباء کو اور میری ترقیوں نے پروفیسروں کو حیرت زدہ کر دیا۔ پروفیسر کریمپ جب بھی مجھے دیکھتے مسکرا کر پوچھتے۔

"کیوں بھئی! ہمارے نوجوان اگریپا کے تجربات کا کیا حال ہے؟ کہاں تک پہنچا ہمارا یہ سائنسداں؟"

دو سال گزر گئے۔

اور اس تمام عرصے میں مَیں جنیوا نہ گیا۔ کیونکہ میری تمام تر توجہ کسی نئی دریافت کی طرف مبذول تھی۔ سائنس کی وسعتوں کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہو۔ دوسرے علوم کے برخلاف سائنس میں ہزارہا موڑ ہیں اور اگر آدمی کوشش کرے تو نت نئے انکشافات کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

چنانچہ دو سال کی محنتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کیمیاوی آلات میں نہ صرف ردوبدل کرنے میں کامیاب ہوا بلکہ میں نے چند نئے آلات بھی بنا ڈالے۔ میری اس کامیابی نے پوری یونیورسٹی میں دھوم مچادی۔ ہر شخص کی زبان پر وکٹر فرنکسٹائن کا نام تھا۔ طلباء عزت واحترام سے اور پروفیسر حیرت

اور دلچسپی سے مجھے دیکھتے۔ جب مجھے اتنی شہرت حاصل ہوگئی اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں کسی کی بھی مدد کے بغیر اپنے تجربات جاری رکھ سکتا ہوں تو میں نے اپنے وطن لوٹ جانے کا ارادہ کیا کہ وہاں اطمینان اور سکون سے نئی دریافتیں کروں گا۔ لیکن انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے میں اپنے ارادے کو جامعہ عمل نہ پہنا سکا۔

یوں تو مظاہر قدرت میری توجہ کا مرکز بنے ہی ہوئے تھے۔ لیکن انسانی جسم کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے مجھے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا کرتا تھا کہ جان اور روح کیا ہے؟ یہ کس طرح سے جسم کو زندہ رکھتی ہے؟ حیات کے اصول کیا ہیں؟ کیا اصولوں میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے؟ یہ بڑا جرأت مندانہ سوال تھا۔ یہ وہ سوال تھا جس کا صحیح جواب آج تک کوئی سائنسداں حاصل نہ کر سکا تھا۔ تاہم اگر کوشش کی جائے اگر بزدلی کا ثبوت نہ دیا جائے، تو آدمی اس سوال کا جواب حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں اسی طرف متوجہ ہوگیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب علم عضفیات کا مطالعہ کروں گا۔ اور ایک نہ ایک دن تخلیق، حیات اور موت کے اسرار معلوم کرلوں گا اور زندگی کے اسرار معلوم کرنے کے لئے مجھے سب سے پہلے موت اور اس کے اثرات کا کھوج لگانا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ بے جان جسم پر قبر میں کیا گزرتی ہے۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ قدرت جسم کو کون سے لگے بندھے اصول کے ذریعہ مٹی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ اعضاء جو کبھی حرکت کیا کرتے تھے، وہ آنکھیں جو کبھی دیکھا کرتی تھیں اور وہ زبان جو کبھی آواز کو لفظوں میں ڈھالتی تھی کس طرح مٹی بن جاتی ہے، اندھیرا مجھے خائف نہ کر سکتا تھا، قبرستان کا بھیانک سناٹا میرے اعصاب کو نہیں جھنجھنا سکتا تھا۔ قبرستان میرے خیال میں ان اجسام کی آرام گاہ تھی جو حیات اور روح سے محروم کر دیئے گئے تھے۔

چنانچہ اب میرے شب و روز قبرستان کے اس تہہ خانے میں گزرنے لگے جہاں مردے رکھے جاتے ہیں۔ میں انسانی جسم کے انحطاط کا سبب معلوم کر رہا تھا اور وہاں اس خاموش اور مردے خانے اور مُردوں کے بیچ میں بیٹھ کر میں نے دیکھا کہ خوبصورت انسان کے ڈھانچے کس طرح مٹی بن جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کس طرح موت کی زردی زندگی کی سرخی پر غالب آ جاتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے مگر بے حد گھناؤنے کیڑے کس طرح آنکھوں اور دماغ کو کھا لیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح لانبے اور گول کیڑے اعضاء پر رینگتے اور پھر کھال کو کھود کر گوشت میں اتر جاتے ہیں۔ کس طرح انسان سڑتا اور گلتا ہے۔ کس طرح گوشت جھڑتا اور ہڈیاں خشک ہوتی ہیں۔ کس طرح آنکھوں کی جگہ دو گہرے غار نمودار ہو جاتے ہیں اور کس طرح ناک کی جگہ صرف ایک سوراخ رہ جاتا ہے۔ میں نے ان بھیانک نظاروں کو غور سے دیکھا اور ایک ایک بات اپنے ذہن میں محفوظ کر

لی۔ وہیں سڑتے اور گلتے ہوئے اجسام کے درمیان بیٹھ کر میں نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ موت کو دوبارہ کس طرح زندگی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ موت...... اس کا کوئی علاج نہیں؟ موت...... ہم کسی کو مار سکتے ہیں تو کیا جلا نہیں سکتے؟۔ اور اس اندھیرے مردہ گھر میں ایک بھونچال خیال یکا یک میرے دماغ میں کوند گیا۔ ایک عجیب سی روشنی سطح دماغ پر پھیلنے لگی اور میں نے انتہائی انبساط کے عالم میں سوچا کہ میں وہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جسے آج تک کوئی معلوم نہ کر سکا تھا

آپ یہ خیال نہ کیجئے کہ وہ خیال ایک پاگل دماغ کی اپج تھی۔ جی نہیں۔ میں اپنے ہوش میں تھا اور وہ ایک حقیقت تھی جس پر سے اچانک پردہ اٹھ گیا تھا۔ حقیقت میرے سامنے تھی۔ میری ان راتوں اور دنوں کا ثمر جو میں نے اس بھیانک مردہ گھر میں گزارے تھے میں نے اس مقام کو کھوج لگا لیا تھا جہاں سے حیات کا سوتا پھوٹتا ہے۔

ہاں میں غیر ذی روح اشیاء میں جان ڈال سکتا ہوں۔

میری یہ دریافت اتنی عظیم تھی کہ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا اور میں اس راہ کو بھول گیا جس کے ذریعہ میں نے یہ منزل پائی تھی۔ مجھے صرف نتیجہ یاد تھا اور وہ نظارے یاد نہ رہے جن کے سہارے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ وہ راز، جسے بڑے بڑے سائنسداں معلوم نہ کر سکے تھے، میں نے معلوم کر لیا تھا یہ اچانک مجھ پر ظاہر ہو گیا تھا۔ سندباد جہازی لوگوں نے اس کی مردہ بیوی کے ساتھ مردوں کے غار میں زندہ دفن کر دیا تھا لیکن وہ روشنی کے ایک نقطے کی طرف چل پڑا تھا اور باہر نکل آیا تھا۔ سندباد جہازی کی طرح میں نے بھی روشنی کے ایک نقطے سے زندگی کا سراغ لگا لیا تھا۔

میں تخلیق کر سکتا تھا۔ میں بے جان جسم میں جان ڈال سکتا تھا۔ حیات میری گرفت میں تھی۔ دوسرے سائنسدانوں نے عناصر کو قبضے میں کیا تھا۔ یہ کسی کا بھی بہت بڑا کارنامہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ کامیابی میری قسمت میں لکھی تھی۔

کپتان صاحب! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے بشرے سے حیرت اور تجسس کا اظہار ہو رہا ہے۔ لیکن معاف فرمایئے اپنا فارمولا آپ کو نہیں بتا سکتا۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟ تو اس کا جواب آپ کو میری کہانی سننے کے بعد خود بخود مل جائے گا۔

کپتان صاحب! یہی راز تھا جسے معلوم کر کے میں نے خود اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ چنانچہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کوئی بھی یہ راز معلوم کر کے اپنی تباہی کو دعوت دیں۔ میرے محسن! قدرت کے اسرار معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اس کا ظاہر دیکھ کر خوش ہو لو۔ اس کے باطن کا کھوج لگانے کی سعی نہ کرو۔ ورنہ تمہارا بھی وہ حشر ہو گا جو میرا ہوا۔ تباہی اور بربادی میرے لئے مقدر ہو چکی تھی کیونکہ میں

نے قدرت سے ٹکر لینے کی کوشش کی تھی۔قدرت بڑی زبردست ہے جو بھی اس سے ٹکراتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے۔قدرت خودمختار ہے جو بھی اس کے کاموں میں ٹانگ اڑاتا ہے تباہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میرے دوست!میری کہانی سنواور عبرت پکڑو۔

جب ایسا زبردست انکشاف ہوااور جب ایسی عظیم قوت مجھے مل گئی تو میں سوچنے لگا کہ میں اس قوت کو کس طرح استعمال کرسکتا ہوں؟

میں غیرذی روح میں روح پھونک سکتا تھا۔لیکن اس سے پہلے مجھے ایک ڈھانچہ ایسا تیار کرنا تھا جواس روح کو قبول کرتا۔گوشت، پوست، رگوں اوراعصاب کا مکمل ڈھانچہ۔اور یہ بے حد مشکل کام تھا۔ابتدا میں مَیں شش و پنج کے عالم میں رہا۔کیا میں اپنے جیسا ہی کوئی آدمی بنا سکوں گا؟ کیا مجھے کامیابی ہوگی؟ لیکن حالیہ کامیابی کا نشہ مجھ پر ایسا چڑھا ہوا تھا کہ ایک بھی شک دیرپا ثابت نہ ہوا۔ میرے تصور نے مستقبل کی ایک ایسی عظیم اور درخشاں تصویر مجھے دکھائی کہ بے یقینی اور شکوک کے سارے قصر دفعتہً ڈھے گئے اور میں نے سوچا کہ جب میں روح پھونک سکتا ہوں تو جسم کیوں نہیں بنا سکتا۔یہ نسبتاً آسان کام ہے۔چنانچہ میں وہ کام کرنے پر تیار ہو گیا جو کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔اور میں خوش آئند خواب کے ریلے میں بہہ گیا۔افسوس میں نے آغاز پر غور کیا انجام پر نہیں۔ میں نے تصویر کا درخشاں رخ دیکھا تاریک نہیں۔میں نے یہ تک نہ سوچا کہ اگر میرا تجربہ ناکام رہا تو کیا ہوگا؟ میں اندھا ہو گیا تھا۔پاگل ہو گیا تھا۔میں نہیں جانتا تھا کہ کیا کر رہا ہوں۔میں نے انتہائی جوش اور اشتیاق سے انسانی جسم بنانے کے کام کی ابتدا کر دی۔جسم انسانی میں بے حد باریک اور نازک پرزے لگے ہوئے ہیں جن کو جوڑنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا اور عضلات وغیرہ بنانے میں وقت بھی بہت لگ جاتا تھا۔ چنانچہ یہ مشکل میں نے اس طرح آسان کی کہ ڈھانچہ قد آدم سے بڑا بنایا۔دیو قامت۔اس کا قد آٹھ فٹ یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔چنانچہ اسی مناسبت سے وہ چوڑا چکلا تھا۔اس طرح وہ چیزیں، جو ہمارے اجسام میں باریک ہیں اس دیو کے جسم میں باریک نہ رہیں۔

اس وقت کے میرے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل ہے موت وزیست میرے اختیار میں تھی۔ قدرت کے اصول اور بندھن اب کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔میں انہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا تھا۔میں خالق تھا۔میں آدم کی تخلیق کر رہا تھا۔اور آدم کی اولاد میں نیا انسان آئے گا۔یہ میرا شکر بجالائے گا۔شاید مجھے خدا کہے گا......میں......وکٹر فرنکسٹائن......ایک نئی نسل کا خدا بننے والا تھا۔

اور پھر ایک نئے خیال نے اپنا پھن پھیلایا۔اگر میں اپنے بنائے ہوئے ڈھانچہ میں جان ڈال سکتا ہوں تو کیا مردوں کو زندہ نہیں کرسکتا؟ شاید کرسکتا ہوں (حالانکہ اب یہ بات مجھے ناممکن معلوم ہوتی ہے) بس اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے پہلے کام کی رفتار تیز کر دی کہ دوسرے تجربے کی

طرف متوجہ ہوسکوں۔

میں اپنے کام میں ایسا منہمک تھا کہ مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ نہ رات کو سوتا اور نہ کبھی مجھے کھانا کھانے کا ہی خیال آتا۔ اس شب و روز کی مسلسل محنت اور شب بیداریوں کا نتیجہ آخر کار ظاہر ہوا۔ میری رنگت پیلی پڑ گئی، جسم لاغر ہو گیا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو گئے اور ہاتھوں اور پیروں کے پٹھے اکڑنے لگے۔ لیکن کامیابی کے یقین اور شہرت کے سنہرے خواب نے مجھے آرام کے لئے چند گھنٹوں کی مہلت نہ دی، مجھے بہت جلد اپنی محنت کا ثمر ملنے والا تھا۔

میری اس وقت کی حالت کا تصور کرنے کی کوشش کیجئے۔ بھیانک اندھیری رات، شہر اور گلیاں سنسان اور غول بیابان کی طرح ضروری اشیاء جمع کرنے کے لئے قبرستان میں بھی تکتا نظر آتا۔ اور کبھی چاندنی رات ہوتی تو آدھی رات کا چاند مجھے اس حال میں دیکھتا کہ میں کسی قبر میں اترا ہوا ایک تازہ مردے کی کھال اتار رہا ہوتا کہ اپنے بنائے ہوئے ڈھانچہ پر منڈھ سکوں۔ کسی بڑے جانور کو مار رہا ہوتا کہ اس کی رگیں اور پٹھے کام میں لاؤں۔ اس وقت کا تصور کر کے اب میں خوف و دہشت سے کانپ اٹھتا ہوں۔ لیکن اس وقت کے جوش اور لگن نے سارے احساسات مردہ کر دیئے تھے۔ میں نہ خوف محسوس کر رہا ہوتا تھا، نہ رحم اور نہ گناہ۔ میں جلد از جلد اپنی تخلیق مکمل کر لینا چاہتا تھا اور بس...... دیکھو! کپتان! دیکھو ان ہاتھوں سے میں نے مُردوں کی کھالیں اتاری ہیں۔ انہیں ہاتھوں سے میں نے مُردوں کے سینے چاک کر کے دل اور کھوپڑی کے بھیجے نکالے ہیں۔ انہیں ہاتھوں سے مردوں کا گوشت نوچا ہے۔ میرے انہیں ہاتھوں نے رگوں کے الجھے ہوئے گچھوں کو سلجھایا ہے۔ لیکن اس وقت نہ مجھے احساس گناہ تھا اور نہ ہی میں کسی طرح کا خوف محسوس کرتا تھا۔ میں قبر کھودتے ہوئے کانپتا نہ تھا۔ مردہ گھر میں گھستا مگر ڈرتا نہ تھا۔

میں اندھیری اور چاندنی راتوں میں وہاں جاتا اور صبح ہونے سے پہلے لوٹتا تو میری کمر پر ایک تھیلا ہوتا جس میں ضرورت کی چیزیں ہوتیں۔ اوجھڑی، آنتیں، گوشت پوست اور ہڈیاں۔ چوروں کی طرح قدم قدم پر چونکتا اور رکتا ہوا میں اپنے اس کمرے میں پہنچتا جو میری تجربہ گاہ تھی۔ میرا یہ کمرہ دوسرے تمام کمروں سے الگ اور چھت پر تھا۔ اس کمرے میں لمبی سی میز پر مختلف انسانی اعضاء پڑے تھے۔ ایک طرف آنتوں کا انبار تھا۔ دوسری طرف ہڈیاں ڈھیر تھیں۔ ایک طرف رگیں پڑی تھیں۔ وریدیں اور شریانیں۔ اور ایک طرف کھال۔ کسی بڑے شہر کا مذبح بھی ایسا منظر نہ پیش کر سکا ہو گا جیسی کہ میری تجربہ گاہ پیش کر رہی تھی۔

موسم گرما گزر گیا۔

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ کھیت ہرے بھرے ہو چکے تھے۔ انگور کی بیلیں خوشوں سے ٹوٹی پڑ رہی

تھیں۔شہد کی مکھیاں اپنے اپنے چھتوں میں سے نکل پڑیں تھیں لیکن میں ......اپنی تجربہ گاہ میں بند تھا۔قدرت کا حسن مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کرسکا۔حتیٰ کہ مجھے وہ لوگ بھی یاد نہ آئے جو بہت دور میرے آبائی وطن میں، میرے خط کا انتظار کررہے تھے۔میں جانتا تھا کہ میری طویل خاموشی سب کے لئے عموماً اور الزابیتھ کے لئے خصوصاً بڑی تشویش ناک ثابت ہورہی ہوگی۔لیکن میں ایک خط لکھنے کا وقت نہ نکال سکا۔

موسم سرما......اور پھر موسم بہار بھی گزر گیا۔

اور میں نے اپنی تجربہ گاہ کی کھڑکی سے باہر جھانک کر نہ دیکھا۔ وہ سال یوں ہی گزرا۔ مصروف۔ بے حد مصروف۔ پھر پت جھڑ آئی۔اور وہ جسم جسے میں بنارہا تھا، مکمل تھا۔اب اس میں جان ڈالنے کی دیر تھی۔

اور عجیب جسم تھا وہ۔آٹھ فٹ لمبا۔ہاتھ اور پاؤں کے پنجے غیر معمولی طور پر بڑے۔انگلیاں لانبی، کھوپڑی ماتھے کے کنارے پر سے ذرا پچکی ہوئی اور وہاں دو شگاف تھے جن کے کنارے سی کر جوڑ دیئے گئے تھے اور گردن پر دائیں بائیں کان کی لوؤں سے ذرا نیچے، دو بڑے بڑے مسّے ابھرے ہوئے تھے لیکن اس وقت وہ بدہئیت اور بے ڈھنگا جسم مجھے بے حد حسین معلوم ہوا کیونکہ وہ میرا بنایا ہوا تھا اور پھر اس وقت بے جان بھی تھا۔اسے دیکھ کر مجھے خوشی تو ہونا ہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرا احساس بھی ہوا۔گناہ کا احساس۔میں اس شریف آدمی کی طرح محسوس کررہا تھا جس نے مجبوراً پہلی دفعہ چوری کی ہو۔ میں اپنے ہم جماعتوں کے سامنے جاتا تو میری نظر خود بخود جھک جاتی۔ پروفیسروں سے میں کترانے کی کوشش کرتا اور اگر کبھی بازار میں نکل جاتا تو میں یوں محسوس کرتا جیسے ہر آدمی، نفرت، حقارت اور ملامت سے میری طرف دیکھ رہا ہے یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں نے اس جسم میں روح پھونکنے کا ارادہ ترک نہ کیا۔

جب میں انسانی جسم بنا چکا تو مجھے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔شاید یہ انتہائی خوشی کی علامت تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ انسانی جسم لمبی سی میز پر بے جان پڑا تھا۔میں اس میں جان ڈال سکتا تھا۔ مجھے اس میں روح پھونکنی تھی۔

چنانچہ اب میں اس کام کی طرف متوجہ ہوا۔



پانچواں باب

وہ نومبر کی ایک بھیانک رات تھی۔

اوراس رات میں نے اپنے تجربے کو مکمل کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ میں نے جان ڈالنے کے آلات جمع کئے۔ میز پر وہ جسم چت پڑا ہوا تھا۔ آلات میں نے مناسب جگہوں پر ٹھیک سے رکھ دیئے۔

گھڑی رات کے ایک بجارہی تھی۔

باہر زوروں کی بارش ہورہی تھی۔ بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر نہایت بھیانک آواز میں بج رہی تھیں۔ ہوا درختوں اور جھاڑیوں میں سیٹیاں بجارہی تھی۔ اور دور کوئی بھیگا ہوا کتا سردی محسوس کر کے ٹھٹھری ہوئی آواز میں رورہا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی موم بتی نصف کے قریب جل چکی تھی کہ میں نے اس کی لرزتی ہوئی مریضانہ روشنی میں دیکھا...... میں نے دیکھا...... کہ ''اس'' نے اپنے جذبات سے عاری، پیلی اور ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں...... ''اس'' کی غیر معمولی طور پر لانبی شہادت کی انگلی ذراسی ہلی...... ''اس'' کے اعضاء میں تشنج ساہوا۔ ''اس'' کا زبردست سینہ اٹھنے اور گرنے لگا۔

''وہ'' سانس لے رہا تھا...... ''وہ'' زندہ ہوگیا تھا۔

حیران ہوں کہ اپنی اس وقت کی حالت کی تصویر کن لفظوں میں کھینچوں!

''اس'' کا سراپا ''اس'' کی بھیانک شکل وصورت بیان کرنے کے لئے مجھے الفاظ مل نہیں رہے تھے۔ جسے میں نے بنایا تھا۔ جس میں مَیں نے روح پھونکی تھی...... کیا یہی تھا میری محنتوں کا ثمر؟۔ میرے خدا!...... میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ میں پتے کی طرح کانپنے لگا اور میری گھگھی بندھ گئی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے جو آدمی بنایا ہے وہ متناسب الاعضاء اور خوبصورت ہے۔ خوبصورت !اف میرے خدا!! اس سے زیادہ بدصورت اور بھیانک صورت کبھی کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔

اس کی زرد جلد پٹھوں اور رگوں کو پوری طرح ڈھانک نہ سکتی تھی۔ کھنچی ہوئی، باریک زرد جلد کے نیچے پٹھوں کی تہیں اور رگوں کے جال صاف نظر آرہے تھے ''اس'' کے بال چمکیلے، کالے اور تقریباً کھڑے تھے۔ دانت بڑے اور حیرت انگیز حد تک سفید، ڈبڈباتی ہوئی نیم وا آنکھوں نے''

اسے'' اور بھی زیادہ ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ آنکھیں زرد تھیں ''اس'' کی جلد کی طرح، اور ہونٹ......! ہونٹ پتلے، سیدھے اور کالے۔ مختصر یہ کہ میرے سامنے وہ ہیولا زندہ اور مجسم موجود تھا جس کا نام لے کر اور جس کا بھیانک حلیہ بیان کر کے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں۔

اس دیوتا کو بنانے اور اس میں جان ڈالنے میں دو سال لگ گئے تھے۔ میں دو سال تک لگا تار محنت کرتا رہا تھا۔ ان دو برسوں میں مجھے کھانے پینے تک کا ہوش نہ رہا تھا۔ ان دو برسوں میں مَیں نے دن کا آرام اور رات کی نیند اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ میں نے بڑی امیدوں سے ''اسے'' بنایا تھا۔ میں نے بڑے حسین خواب دیکھے تھے۔ لیکن اپنے ان خوابوں کی ایسی ہیبت ناک تعبیر دیکھ کے دم بخود رہ گیا اور خوف و کراہت نے میری روح تک کی بنیادیں ہلا دیں۔ یہ...... یہ...... دیو میری کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کیا یہی تھا میری دو سال کی محنتوں کا نتیجہ؟ میرے خدا! کتنا ہیبت ناک......! کتنا بھیانک......! میں ''اس'' کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے ڈرتا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر سی دوڑ رہی تھی۔ ایک طرح کا ناقابل برداشت خوف میرے وجود پر مسلط تھا۔ میں نہایت بدحواسی کے عالم میں، تقریباً بھاگتا ہوا، تجربہ گاہ سے نکل کر خواب گاہ میں پہنچا۔ الٹے سیدھے بھیانک خیالات ہجوم کر آئے تھے۔ میں بے تابی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ میری رگوں میں خون کے ساتھ ہی ساتھ خوف اور سنسنی کی لہریں گردش کر رہی تھیں جو دماغ میں جا کر آتشبازی کے انار کی طرح پھٹ پڑی تھیں اور میرا بدن تپنے اور دماغ جلنے لگا تھا، نیند کا کوسوں تک پتہ نہ تھا۔

میں اپنی خواب گاہ میں ٹہلتا رہا یہاں تک کہ پچھلے دو سال کی تھکن میرے پریشان جذبات پر غالب آ گئی اور میں کپڑے اتارے بغیر بستر پر دراز ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ نیند میں مجھے سکون ملے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ آنکھ لگتے ہی خوابوں کا تانتا بندھ گیا۔ بھیانک، جسم سرد کر دینے والے خواب۔

میں نے دیکھا کہ الزابیتھ، جو پہلے سے زیادہ حسین، جوان اور تندرست ہو گئی ہے۔ اینجلو اسٹیڈ کے بازاروں میں گھوم رہی ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی باہیں پھیلا کر میری طرف دوڑ پڑتی ہے۔ میں اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کے سرخ ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہوں...... لیکن...... میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کے ہونٹ مردے کے ہونٹوں کی طرح سرد اور کرخت ہیں۔ میں گھبرا کے اس کی طرف دیکھتا ہوں......اور دیکھتا ہوں، کہ میری آغوش میں بجائے الزابیتھ کے میری ماں کی لاش ہے۔ میں خوف سے چیخ کر اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ دفعتہً ایک زردی مائل سفید کفن کہیں سے آ کر اپنے آپ ہی میری ماں کی لاش کے گرد لپٹ جاتا ہے اور میں اس کی سلوٹوں میں گھناؤنے کیڑے کلبلاتے دیکھتا ہوں......!

خوف کی ایک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی اور بدن ٹھنڈے پسینے سے شرابور تھا۔ میرے دانت بج رہے تھے اور اعضاء میں تشنج سا ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے زرد رو چاند جھانک رہا تھا۔ اس کی مردہ چاندنی کمرے میں گھس آئی تھی اور چاندنی کی ایک موٹی سی لکیر میرے پلنگ تک پہنچتی تھی اور اس چاندنی میں میں نے کچھ دیکھا......

''وہ'' وہیں تھا...... میرے خدا! ''وہ'' وہیں تھا...... وہ اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے مچھر دانی کو دائیں بائیں ہٹائے، ذرا آگے کی طرف جھکا ہوا اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بیدار دیکھ کر ''اس'' کے جبڑے ہلے اور ''اس'' کے منہ سے ایک عجیب طرح کی، ناقابل فہم آواز نکلی اور ساتھ ہی دوزخ کے شیطانوں کی سی مسکراہٹ نے ''اس'' کے پیلے گالوں پر ان گنت سلوٹیں پیدا کر دیں...... ''وہ'' کچھ کہہ رہا تھا یا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں نے سننے اور سمجھنے کی کوشش نہ کی...... ''اس'' نے اپنا لمبا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں کانپ گیا۔ ''وہ'' مجھے پکڑنا یا شاید روکنا چاہتا تھا۔ لیکن میں غوطہ خور کی طرح اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکل گیا اور ایک ایک وقت میں دو دو سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے پہنچا اور صحن میں پناہ لی۔ بقیہ رات میں نے وہیں گزاری۔ لیکن اس طرح کہ صبح تک ٹہلتا رہا اور کانپتا رہا۔ اس وقت میری قوت سامعہ حیرت انگیز حد تک تیز ہو گئی تھی۔ میں ہلکی ہلکی سی آواز بھی سن سکتا تھا۔ میں ہوشیار اور چوکنا تھا کہ اگر ''اسے'' آتا ہوا محسوس کروں تو فوراً بھاگ کھڑا ہوں۔

ناممکن تھا کہ کوئی بھی انسان ''اسے'' دیکھتا اور خوف سے اس کی گھگھی نہ بندھ جاتی۔ مصر کے اہرام میں سے نکالی ہوئی صدیوں پرانی ممی میں بھی اگر جان ڈالی جائے تو وہ بھی ''اس'' کے جتنی ڈراؤنی نہ ہو گی میں نے ''اسے'' اس وقت بھی دیکھا تھا جب اس میں جان نہ پڑی تھی۔ اس وقت ''وہ'' بدصورت تو معلوم ہوا تھا لیکن ہیبت ناک معلوم نہ ہوا تھا۔ لیکن جب ''اس'' میں جان پڑ گئی۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو...... اف! دوزخ کے عفریت بھی اتنے بھیانک نہ ہوں گے۔ اگر عذاب کے فرشتے بھی ''اسے'' دیکھیں تو لرز اٹھیں۔

میری وہ رات عجیب عالم میں گزری۔ کبھی تو میری نبض اتنی تیز چلتی کہ میں ہر شریان میں اس کی دھڑکن محسوس کرتا اور کبھی یوں ہوتا کہ میں نقاہت سے لڑکھڑانے لگتا، میرا سر گھومنے لگا اور عجیب طرح کا خوف میرے دل کو سرد کر دیتا۔ اوپر سے مایوسی رہی سہی قوتوں کو کچلے ڈال رہی تھی مستقبل کے دل خوش کن خواب دفعتہً آسیب بن چکے تھے۔ میری امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ میں ناکام رہا تھا۔ میں نے قدرت سے ٹکر لینے کی کوشش کی اور شکست کھائی تھی۔ ایسی شکست جس کی یاد قیامت تک مجھے پریشان رکھے گی۔

آخر کار شبنم میں بھیگی ہوئی اداس صبح طلوع ہوئی۔ میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں مل کے اینجلو اسٹیڈ کے گھنٹہ گھر کی طرف دیکھا۔ گھڑی صبح کے چھ بجا رہی تھی۔ چوکیدار نے صحن کا دروازہ کھولا اور میں دیوانوں کی طرح بھاگ کر سڑک پر آ گیا۔ اور یوں تیز تیز چلنے لگا جیسے ''وہ'' میرا تعاقب کر رہا ہو میں ''اس'' سے ڈرنے لگا تھا۔ ہر موڑ اور ہر گلی کی طرف مَیں خوف بھری نظروں سے دیکھتا جیسے ''وہ'' وہاں سے نکل کر ابھی میرے سامنے آ جائے گا۔ میں اپنے کمرے میں جہاں ''وہ'' تھا، جانے کی ہمت نہ کر سکا اور یہ بھی نہ جانتا تھا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ بس میں تو اندھا دھند چلا جا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال نہ تھا کہ رات کی بارش نے میرے کپڑوں کا تار تار بھگو دیا تھا اکا دکا راہگیر حیرت سے میری طرف دیکھ ہی نہ رہے تھے بلکہ شاید مجھے پاگل سمجھ رہے تھے۔

میں اسی طرح جیسے نیند میں، چلتا رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں۔ میں اس خوف سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جو میری روح کو کھائے جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری اس بھاگ دوڑ کی تھکن میرے خوف پر غالب آ جائے گی اور میں کسی جگہ بیٹھ کر ذرا دیر کے لئے سولوں گا۔ میں ایک کے بعد دوسری سڑک کو طے کرتا رہا۔ میں دائیں بائیں دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ خود کو اس مسافر کی طرح محسوس کر رہا تھا جو تن تنہا کسی بھیانک اور آسیب زدہ جنگل میں سے گزر رہا ہو۔

میں اس سرائے کے سامنے پہنچا جو شاہراہ پر واقع تھی اور جہاں ایک دوسرے شہر کو جاتی ہوئی، گاڑیاں گھنٹے دو گھنٹے کے لئے ٹھہر جاتی تھیں کہ مسافر ستا لیں۔ جب میں وہاں پہنچا تو ایک گاڑی آ کر رکی۔ میرے قدم خود بخود رک گئے۔ میں غور سے اس گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ کوچوان نے اتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور ایک مسافر، اپنے کپڑوں سے دھول جھاڑتا ہوا باہر آیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ میرا دوست ہینری تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ خوشی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''وکٹر! تم! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں آ رہا ہوں؟''

ہینری کو دیکھتے ہی میں اپنا خوف اور پریشانی بھول گیا۔ مجھے اپنا وطن اور اپنے لوگ یاد آ گئے۔ اور اس یاد سے میں ایک عجیب طرح کا روحانی سکون محسوس کرنے لگا اور دو سال کے بعد آج پہلی دفعہ میں نے ایسا سکون محسوس کیا۔ میں ہینری سے لپٹ گیا۔ اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے کالج کی طرف چلے۔ ہینری ہمارے دوستوں اور عزیزوں کی خبریں سنانے لگا اور پھر قہقہہ لگا کے بولا کہ آخر کار اس کی ضد کے سامنے اس کے باپ نے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے اینجلو اسٹیڈ آنے کی اجازت مل گئی۔ ''لیکن یار! ابا بھی ایک ضدی آدمی ہیں۔'' اس نے کہا،

''چنانچہ تم سمجھ سکتے ہو کہ انہیں راضی کرنے کے لئے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ وہ راضی تو ہو گئے لیکن ناراض تھے چنانچہ میں انہیں ناراض ہی چھوڑ کر یہاں آیا ہوں۔''

''اچھا ہوا ہینری تم آ گئے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ ابا، الزابیتھ اور میرے بھائیوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا۔؟''

''سب مزے میں ہیں۔ لیکن یار برا نہ ماننا تم ان لوگوں پر واقعی ظلم کر رہے ہو۔ بندۂ خدا! کئی مہینوں سے تم نے انہیں کوئی خط نہ لکھا! واہ یار اچھے بیٹے ہو کہ یہاں آ کر اپنے باپ اور عزیزوں کو یکسر بھول گئے۔ بہر حال میں اس سستی، کاہلی اور بے پروائی پر تمہیں ایک زبردست لیکچر پلانے والا ہوں ۔لیکن یار، اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' تم کچھ بیمار معلوم ہوتے ہو اور تمہاری آنکھیں سرخ اور سوجھی ہوئی سی ہیں جیسے تم کئی راتوں سے جاگ رہے ہو۔''

''تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔ میں مصروفیت کی وجہ سے واقعی کئی راتوں تک سو نہ سکا تھا لیکن اب میری مصروفیت ختم ہو گئی۔ اب میں فرصت میں ہوں اور ٹانگیں پھیلا کر نہایت بے فکری سے سو سکوں گا۔''

لیکن آخری الفاظ کہتے وقت میں کانپ گیا..... فرصت میں ہوں؟ اطمینان اور بے فکری سے سو سکوں گا؟ کس طرح سو سکوں گا؟ کہاں سو سکوں گا؟ وہ..... میرے گھر میں زندہ موجود ہے...... آنے والی رات اپنے دامن میں خدا جانے میرے لئے کیا لائے؟ کیا آج رات بھی میں صبح تک صحن میں ٹہلتا رہوں گا.....؟ میں ''اس'' سے ڈرنے لگا ہوں..... میں اپنے کمرے میں کس طرح جاؤں گا ۔؟..... ان سوالات کا مجھے کوئی جواب نہ ملا چنانچہ اپنی ہر پریشانی چھپانے کے لئے میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

ہم کالج کے سامنے پہنچ گئے۔

خیالات پھر ہجوم کر آئے ..... ''وہ'' بڑی آزادی سے میرے کمروں میں گھوم رہا ہو گا۔ اور ہینری میرے ساتھ تھا۔ اگر کہیں ہینری نے ''اسے'' دیکھ لیا تو.....؟

''ہینری! تم یہیں ٹھہرو۔'' میں نے کہا اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلا۔ کمرے کے بند دروازے کے سامنے ٹھہر کر میں نے اپنے حواس بجا کئے اور اپنی ہمت بندھا کر لرزتے ہاتھوں سے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ اس بچے کی طرح جسے یقین ہو کہ دروازے کی دوسری طرف وہ کھڑا ہوا ہے..... میں نے دروازہ کھول دیا..... ''وہ'' وہاں نہ تھا میں نے دوسرے کمرے میں دیکھا اور پھر خواب گاہ میں..... ''وہ'' کہیں نہیں تھا۔ ''وہ'' کہیں چلا گیا تھا۔ میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ میں تیزی سے اتر کر نیچے پہنچا۔

''ہینری! آؤ نا یار۔ وہاں کیوں کھڑے ہو گئے؟'' میں نے بڑی بشاشت سے کہا۔ میں ہینری کو اپنے کمرے میں لے آیا جواب اس بھیانک وجود سے پاک تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ملازم ناشتہ لگا رہا تھا۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میری نبض خطرناک حد تک تیز چل رہی تھی۔ میں تالیاں بجا رہا تھا۔ کرسیوں پر اچک رہا تھا اور اب بات بات میں قہقہے لگا رہا تھا شروع میں تو ہینری یہی سمجھا کہ میں اس کی آمد پر خوشیاں منا رہا ہوں۔ لیکن میری حرکتیں ایسی تھیں کہ ہینری متفکر ہو گیا۔ غالباً اس نے میری آنکھوں میں وحشیانہ چمک دیکھی اور میرے قہقہے اسے کھوکھلے معلوم ہوئے۔ وہ بت بنا بیٹھا رہا۔ متفکر، حیران اور خائف۔

''وکٹر!'' آخر کار وہ چلّایا'' یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ خدا کے لئے اس طرح نہ ہنسو...... آخر اس......اس پاگل پنے کا مطلب کیا ہے۔؟''

''یہ نہ پوچھو...... بس یہ نہ پوچھو'' میں نے کہا اور پھر فوراً ہی اپنی آنکھوں پر ہاتھ ڈھانک لئے۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے ''وہ'' سامنے کھڑا تھا'' ہائے مجھ سے نہ پوچھو...... ''اس'' سے پوچھو...... ''اس'' سے بچاؤ...... بچاؤ خدا کے لئے...... مجھے بچاؤ۔''

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ''اس'' نے آگے بڑھ کر مجھ کو دبوچ لیا ''وہ'' میری پسلیاں توڑے ڈال رہا تھا۔ ''اس'' کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے میں تڑپنے اور دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اس وقت ہینری کے دل کی کیا حالت ہوئی ہوگی یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ بیچارہ خوشی خوشی گھر سے چلا تھا اور تمام راستے یہی سوچتا آیا ہوگا کہ مجھ سے یوں باتیں کرے گا اور یوں کہے گا۔ لیکن یہ کہ الٹا اسے میری تیمارداری کرنی پڑی بہر حال اس وقت چونکہ میں بے ہوش تھا اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ ہینری کی کیا حالت ہوگی۔

چند گھنٹوں کی بے ہوشی کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو اعصابی ہیجان اور بخار میں مبتلا تھا۔ اور میں کئی مہینوں تک بیمار رہا۔ اس پوری مدت میں ہینری میری تیمارداری کرتا رہا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے والد صاحب کو میری اس علالت کی اطلاع نہ دی اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور ایسے طویل اور تکلیف دہ سفر کے قابل نہ تھے۔

اور واقعی میں سخت بیمار تھا۔

''اس'' کی جسے میں نے بنایا تھا، بھیانک صورت کسی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتی نہ تھی۔ چنانچہ میں ہذیان بکتا اور ''اس'' کے متعلق بکتا اور میری یہ بڑبڑاہٹ ہینری کو حیرت زدہ کر دیتی۔ ابتدا میں اس نے میری اس بکواس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور یہی خیال کیا کہ بخار چونکہ

میرے دماغ پر چڑھ گیا ہے اس لئے میں اول فول بک رہا ہوں۔ لیکن میں ہر بار ''اسی'' کا ذکر کرتا اور ایک ہی موضوع کے متعلق بکتا تھا۔ چنانچہ ہینری یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میری اس بیماری کا کوئی بھیانک سبب ہے۔ کسی غیر معمولی اور ہیبت ناک واقعہ سے میرا دماغ متاثر ہوا ہے۔

اور یوں آہستہ آہستہ اور کئی دوروں کے بعد، جنہوں نے میرے دوست کو متعجب اور پریشان کر دیا، میں روبصحت ہونے لگا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب میری سوچنے سمجھنے کی قوتیں عود کر آئیں تو میں نے دیکھا کہ موسم خزاں گزر چکا تھا۔ اور درختوں پر کومل کومل کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ میرے دماغ پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی اور چند دنوں بعد ہی میں پہلے کی طرح بشاش تھا۔

''ہینری!'' میں نے کہا ''مجھے افسوس ہے کہ پورا موسم سرما تمہیں میری تیمارداری میں گزارنا پڑا۔ حیران ہوں کہ تمہارے اس احسان کا بدلہ کس طرح اتاروں۔''

''ارے یہ سب باتیں رہنے دو اور تندرست ہو جاؤ جلد از جلد اور تمہاری تندرستی میرے احسانوں کا بدلہ ہوگی۔ کیا سمجھے؟......آہ......وکٹر......اس وقت چونکہ تم نسبتاً بشاش اور تندرست معلوم ہوتے ہو اس لئے تم سے ایک درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

میں کانپ گیا۔

''درخواست! میرے خدا! ایک درخواست کرنا چاہتا ہے وہ مجھ سے؟ یقیناً وہ یہی پوچھنا چاہتا ہوگا کہ بخار میں جو بکا کرتا تھا اس کا مطلب کیا تھا؟ یقیناً وہ ''اسی'' کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہے جس کے متعلق میں سوچتے بھی ڈرتا ہوں۔''

''ارے! تمہارے چہرے پر تو ہوائیاں اڑنے لگیں!'' ہینری نے کہا ''خیر میں کچھ نہ کہوں گا۔ لیکن وکٹر! تمہارے والد اور الزابیتھ، دونوں ہی تمہاری اس طویل خاموشی سے متفکر و پریشان ہوں گے۔ اگر انہیں خود تمہارا لکھا ہوا ایک خط مل جائے تو ان کی پریشانی دور ہو سکتی ہے۔ یہ تو ان کو معلوم ہی نہیں کہ تم کتنے بیمار تھے۔''

''ہاں! ابھی لکھے دیتا ہوں ایک خط'' میں نے اطمینان کا سانس لے کے کہا۔

''ہاں یہ بات ہوئی۔ چونکہ تم پھر بشاش نظر آنے لگے ہو چنانچہ یقیناً اس خط کو پڑھنا پسند کرو گے جو کئی دنوں سے آیا پڑا ہے۔ یہ شاید الزابیتھ کا خط ہے۔



چھٹا باب

وہ واقعی الزابیتھ کا خط تھا۔اس نے لکھا تھا۔

''پیارے وکٹر......

میرا دل کہتا ہے کہ تم سخت علیل ہو گئے تھے ہینری کے خطوط مجھے اطمینان نہ دلا سکے۔کیونکہ تمہارا کوئی خط آیا ہی نہیں۔اگر تمہارا لکھا ہوا خط، خواہ اس میں ایک ہی سطر کیوں نہ ہوتی، آ جاتا تو ہمیں اطمینان ہو جاتا۔لیکن تمہارا ایک خط بھی ایسا نہ آیا جس کی وجہ سے میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں کہ تم اتنے بیمار تھے کہ قلم تک نہ پکڑ سکتے تھے۔

ایک عرصے تک میری تو یہ حالت رہی کہ میں بڑی بے تابی سے ڈاکیئے کی منتظر رہتی۔لیکن جب ڈاکیہ آتا تو تمہارا کوئی خط نہ لاتا۔چچا جان بہت زیادہ متفکر تھے۔اور میں بڑی کوششوں کے بعد ہی انہیں انجلو اسٹیڈ کے سفر سے باز رکھ سکی۔میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ میں اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔اگر میں تمہارے پاس آنے کے لئے چل پڑتی تو چچا جان بھی میرے ساتھ ہو لیتے۔اور اگر بفرض محال وہ یہیں رہتے تو ان کی دیکھ بھال کون کرتا۔ہینری نے تمہاری علالت کے متعلق تفصیل سے کچھ نہ لکھا تھا لیکن سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں، بہر حال ہینری کے پچھلے خط سے معلوم ہوا کہ تم رو بہ صحت ہو۔خدا کا شکر ہے۔ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔حالانکہ اب بھی دل تمہاری طرف ہی لگا ہوا ہے۔چنانچہ امید ہے خود تم ہمیں اپنی صحت کی اطلاع دو گے۔

جلد از جلد تندرست ہو کر یہاں آنے کی کوشش کرو۔چچا جان تمہیں دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں۔لیکن سب سے پہلے انہیں ایک خط لکھو تا کہ انہیں کچھ تو قرار آئے۔انہیں تسلی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں۔لیکن جو کام تمہارا خط کر سکتا ہے وہ میری کوششیں نہیں کر سکتیں۔

وکٹر! تم اپنے بھائی آرنسٹ کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔جب تم یہاں سے گئے تو وہ کیسا دبلا اور منا سا تھا۔اور اب تو وہ سولہ سال کا کڑیل جوان ہے بے حد ہنس مکھ اور باتونی اور جناب وہ دیس بھگت بھی ہے اور اپنے وطن کی خدمت کرنے کی غرض سے فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے۔لیکن چچا جان اسے اپنی نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتے۔چنانچہ وہ اس کے خلاف ہیں۔بہر حال تمہارے آنے کے بعد ہی آرنسٹ کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ البتہ میں تمہیں خبردار کئے دیتی ہوں کہ اگر ہم نے اس کی جلد خبر نہ لی اور اسے فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت نہ دی تو مجھے خوف ہے کہ ہمارا یہ

حد عمدہ بھائی سست و کاہل یا پھر ''بھٹکو'' بن جائے گا۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ وہ مطالعہ کو نہ صرف بے کار بلکہ تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ چنانچہ دن بھر یا تو پہاڑوں پر چڑھنے کی مشق کیا کرتا ہے یا پھر جھیل کے دوسرے کنارے پر بھٹکا کرتا ہے ہمارا یہ بھائی معلوم ہوتا ہے فطرتاً مہم جو ہے۔

تمہارے جانے کے بعد سے لے کر اب تک یہاں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کا ذکر کیا جا سکے۔ زندگی کی چھوٹی موٹی مشغولیات میں میرا وقت گزر جاتا ہے اور میں اپنے سامنے مسکراتے ہوئے محبت بھرے چہرے دیکھ کے اپنی تھکن بھول جاتی ہوں۔

وکٹر! جسٹائن مورنز تمہیں یاد ہے؟ لیکن شاید تمہیں یہ یاد نہیں کہ یہ لڑکی ہمارے یہاں کس طرح آئی تھی۔ اچھا مجھ سے سنو۔ مادام مورنز، یعنی جسٹائن کی ماں بیوہ اور چار بچوں کی ماں تھی۔ جسٹائن اس کی تیسری اولاد تھی۔ یہ لڑکی، یعنی جسٹائن، اپنے باپ کو بہت پیاری تھی۔ چنانچہ ایک عجیب نفسیاتی قسم کے حسد کی وجہ سے جسٹائن کی ماں اپنی اس بیٹی سے نفرت کرتی تھی۔ چنانچہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد مادام مورنز کی اپنی بیٹی سے یہ نفرت قائم رہی اور اب چونکہ کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں تھا اس لئے وہ جسٹائن پر مظالم ڈھایا کرتی تھی۔ چچی جان نے اس معصوم کے اوپر مادام مورنز کے یہ مظالم دیکھے تو وہ بے تاب ہو گئیں اور انہوں نے مادام مورنز سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو ہمارے یہاں بھیج دے۔ مادام مورنز نے چچی جان کی یہ درخواست بخوشی منظور کر لی اور اس طرح جسٹائن ہمارے یہاں آ گئی۔ اس وقت اس کی عمر بارہ سال کی ہوگی۔ چچی جان نے اس کی تربیت کی۔ وہ گھر کے سارے کام کیا کرتی تھی لیکن ہم نے کبھی اسے ذلیل نوکرانی نہ سمجھا۔

تمہیں یاد ہوگا وکٹر کہ یہی جسٹائن تمہاری منظور نظر تھی۔ (خدا کے لئے اس لفظ کو غلط معنی نہ پہنا دینا میں نے یہ لفظ دوسرے ہی معنی میں استعمال کیا ہے) تمہارا یہ کہنا مجھے یاد ہے کہ جب تم مغموم اور اداس ہوتے ہو تو جسٹائن کی صورت کو دیکھتے ہی تمہاری ساری اداسی اور بیزاری دور ہو جاتی ہے۔ خیر تو چچی بھی اس لڑکی کو بہت پسند کرتی تھیں اور اسے اپنی بیٹی کی طرح رکھتی تھیں۔ جسٹائن چونکہ شریف لڑکی ہے اس لئے وہ چچی جان کے احسانوں کو فراموش نہ کر سکی۔ چنانچہ جب چچی کا انتقال ہوا تو ہم سب اپنے حالوں اتنے پریشان تھے کہ بچاری جسٹائن کی طرف متوجہ نہ ہوئے جس نے چچی کی تیمارداری میں رات دن ایک کر دیئے تھے۔ اور خود اپنی صحت تباہ کر لی تھی۔ چچی کے انتقال کے بعد وہ چپکے ہی چپکے آنسو بہاتی رہی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چچی پر صحیح معنوں میں فدا تھی اور ہم سب کی نہ صرف بہت عزت کرتی تھی۔ بلکہ ہمیں اپنا محسن سمجھتی تھی۔ چچی کے انتقال کا ہی صدمہ کیا کم تھا کہ یکے بعد دیگرے اس کے بھائی چل بسے اور مادام مورنز یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ اس کی دوسری اولادیں اس لئے مر گئیں کہ اس نے جسٹائن پر ظلم کیا تھا۔ اس کے وہم کو گرجے کے پادری نے جو

اقرار گناہ سنا کرتا ہے، اور ہوا دی ۔ اب تو مادام مورنز کو یقین ہو گیا کہ واقعی یہ قدرت نے اس کے مظالم کا، جو اس نے بیٹی جسٹائن پر روا رکھے تھے، بدلہ دیا ہے۔ چنانچہ اس نے توبہ کی اور جسٹائن کو اپنے پاس بلا لیا۔ کہ اب اس سے نیک سلوک کر کے پچھلے مظالم کا کفارہ ادا کرے۔ جسٹائن جب ہمارے گھر سے رخصت ہوئی تو زاروقطار رو رہی تھی۔ چچی کے انتقال کے بعد جسٹائن کی کچھ ایسی حالت ہوگئی ہے کہ بات بات میں اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔ لیکن ادھر مادام مورنز کی حالت بھی، اپنے بچوں کی موت کے بعد، کچھ پاگلوں سی ہوگئی تھی۔ چنانچہ توبہ تلاّ کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو نہ روک سکی اور جسٹائن کو تلخ باتیں سنانے لگی۔ وہ اسے ڈائن اور چڑیل کہتی کہ وہی اس کے بچوں کو اور اپنے بھائیوں کو کھا گئی۔ لیکن پھر وہ رو رو کر جسٹائن سے اپنے پچھلے مظالم کی معافی مانگتی۔ جسٹائن سب کچھ دیکھتی، سنتی اور خاموش رہتی تھی۔ آخر کار مادام مورنز کو شاید ہسٹریا ہو گیا۔ وہ چیخنے چلانے لگی اور اسی حالت میں پچھلی سردیوں کے ابتدائی دنوں میں اس کا انتقال ہو گیا۔

چنانچہ جسٹائن پھر ہمارے یہاں آ گئی ہے۔ وکٹر! اس بے چاری کی حالت سچ مچ دیکھی نہیں جاتی۔ یہ لڑکی پتہ نہیں کون سی منحوس ساعت میں پیدا ہوئی ہے کہ جب سے پیدا ہوئی ہے غم اور دکھ برداشت کر رہی ہے۔ میں اسے بہت پسند کرتی ہوں۔ بلکہ چاہتی ہوں کہ اتنی رحمدل، مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی میرے خیال میں دنیا میں دوسری تو ہوگی نہیں۔ اس کی عادتیں، باتیں اور اس کے کام چچی جان کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ مجھے تو یہ دوسری چچی ہی معلوم ہوتی ہے۔

اب ہمارے منے بھائی ولیم کے متعلق سنو۔ کاش کہ اس وقت تم اسے دیکھ رہے ہوتے۔ افوہ! اتنی چھوٹی عمر میں اس نے کیا قد نکالا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ عمر کے لحاظ سے وہ بے حد طویل قامت ہے۔ یا یوں سمجھو کہ اس کا قد اس کی عمر کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ بغاوت کر کے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں جو پہلے ہی سے سبز تھیں اب پہاڑی جھیل کی مانند شفاف معلوم ہوتی ہیں۔ بال سیاہ ہیں اور ان میں گھونگر بھی پڑنے لگے ہیں اور جب وہ ہنستا ہے تو اس کے گالوں میں بڑے پیارے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ بڑا عاشق مزاج ہے۔ چنانچہ ابھی سے اپنی بیوی تلاش کرنے لگا ہے۔ ہمارے اس ننھے بھائی جان کے پیچھے دو تین لڑکیاں ہمیشہ لگی رہتی ہیں۔ البتہ وہ خود ایک لڑکی کو جس کی عمر پندرہ سال ہے اور جس کا نام لوسی ہے۔ بہت زیادہ پسند کرتا ہے۔

اب ہمارے محلے والوں کے متعلق بھی کچھ سن لو۔ مس منسفلڈ، ایک خوبصورت انگریز سے بہت جلد شادی کرنے والی ہے۔ چنانچہ شادی شدہ عورتیں خوش ہو کر اور کنواری لڑکیاں جل بھن کر اسے مبارک باد دیتی ہیں۔ (ان کنواری لڑکیوں میں میں شامل نہیں ہوں) منسفلڈ کی بدصورت بہن نے ایک کروڑ پتی بوڑھے سے شادی کر لی ہے۔ تمہارے ہم جماعت اور تمہارے ہینری دوست مانویل

کے متعلق بھی ایک افواہ گرم ہے۔ کئی جگہ سے ناکام لوٹنے کے بعد اب سنا گیا ہے کہ ایک نٹ کھٹ فرانسیسی لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔ چنانچہ ان لڑکیوں کی، جنھوں نے اس کا پیغام قبول نہ کیا تھا، خجالت چھپائے نہ چھپتی۔ بچاری لڑکیاں!۔

میں ایک انبساط کے عالم میں یہ خط اب تک لکھتی رہی تھی۔ لیکن اب جبکہ یہ خط ختم کرنے والی ہوں۔ میری بے چینی عود کر آئی ہے۔ چنانچہ وکٹر! خدا کے لئے ہمیں خط لکھو اور فوراً لکھو، ہینری کی مہربانیوں اور خلوص کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا جان نثار دوست ملا ہے۔ خدا حافظ وکٹر۔ خدا تمہیں جلد صحت عطا فرمائے۔

الزابیتھ

''میں ابھی اور اسی وقت خط لکھتا ہوں'' میں نے کہا۔

اور میں نے خط لکھا اور اتنی سی دماغی محنت نے مجھے ٹھکا مارا۔ افوہ کتنا کمزور ہو گیا تھا میں۔ بہرحال پندرہ دنوں تک بستر پر پڑے رہنے کے بعد میں اپنے کمرے سے نکلنے کے قابل ہو سکا۔

صحت یاب ہونے کے بعد میرا پہلا فرض یہ تھا کہ میں ہینری کا تعارف یونیورسٹی کے پروفیسروں سے کراتا۔ لیکن یہ فرض انجام دیتے ہوئے مجھے کافی سے زیادہ روحانی اذیت برداشت کرنا پڑی۔ پروفیسروں کی صورت دیکھتے ہی وہ یادیں تازہ ہو گئیں جنہیں میں بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس منحوس رات کے بعد، جب میں نے اپنے خوابوں کی ایسی بھیانک تعبیر دیکھی تھی، مجھے طبیعات سے نفرت ہو گئی تھی۔ بظاہر میں تندرست تھا۔ لیکن کیمیا کے آلات دیکھتے ہی میں لرزنے لگتا اور میرا رنگ زرد ہو جاتا۔ ہینری نے میری یہ حالت دیکھی اور کچھ سمجھ کے سارے آلات میرے کمرے سے ہٹا لئے۔ اسی پر بس نہ کرتے ہوئے اس نے مجھے اپنا کمرہ بدل ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ میں اپنا کمرہ چھوڑ کے دوسرے کمرے میں اٹھ آیا۔ لیکن ہینری کی یہ احتیاطی تدابیر اس وقت کچھ کام نہ آئیں جب میں اس کے ساتھ یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ملا۔ جب پروفیسر والڈن نے میری ترقیوں کی تعریف کی اور مجھے مبارک باد دی تو میں برداشت نہ کر سکا۔ دہشت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ بدن کانپنے لگا اور میرے بشرے سے حد درجہ خوف و ہراس اور نفرت کا اظہار ہوا۔ پروفیسر صاحب سمجھے کہ میں اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتا اور یہ کہ میری حالت محض میری خاکساری کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ موضوع بدل کر سائنس کی ترقیوں کا ذکر کرنے لگے۔ خدایا! میں کیا کروں؟ وہ مجھے خوش کرنا چاہتے تھے میری ہمت بندھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن اس کے برخلاف یقیناً بے خبری میں، مجھے شدید روحانی اذیت پہنچا رہے تھے۔ لیکن ہینری نے جو میری دلی کیفیت کو ایک حد تک سمجھ چکا تھا، بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔ میں نے دل ہی دل

میں اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا۔ ہینری میری حالت دیکھ کر حیران ضرور ہوا۔ لیکن یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرا مخلص اور سچا دوست ہے میں نے اسے اپنا رازدار نہ بنایا اور یہ ایک ایسی غلطی تھی جو میری تباہی کا باعث بنی۔ اگر میں نے ہینری کو اپنا رازدار بنایا ہوتا تو ہم دونوں مل کے کوئی تدبیر کرتے اور وہ نہ ہوتا جو ہو گیا۔ خیر۔ تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔

پروفیسر کریمپ میرے لئے بڑے غیر محتاط اور سنگدل ثابت ہوئے۔

''مبارکباد کا مستحق ہے ہمارا یہ نوجوان سائنسداں۔ کسی کو بھی ایسا قابل فخر شاگرد نہ ملا ہوگا'' انہوں نے کہا ''مسٹر ہینری تمہارا یہ دوست ہم سے بھی زیادہ بازی لے گیا۔ ارے بھائی حیران کیوں ہو رہے ہو اور یوں آنکھیں پھاڑے اپنے دوست کی طرف کیا دیکھ رہے ہو! میں نے جو کچھ کہا حقیقت ہے۔ اس میں مبالغے کا شائبہ تک نہیں۔ وہ نوجوان جو چند مہینوں پہلے اگریپا جیسے لغو سائنسدان کی باتوں کو الہامی سمجھتا تھا۔ اب پورے شہر میں عزت و احترام اور حیرت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر اس کی ترقیوں کا یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا یہ شاگرد ساری دنیا میں مشہور ہوگا۔ ''ارے وکٹر تم تو شرما رہے ہو بھئی'' انہوں نے میرے متغیر چہرے کو دیکھ کر کہا ''کبھی میرا بھی یہی حال تھا۔''

اور وہ اپنی نوجوانی کے حالات سنانے لگے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہینری سائنس کی تعلیم حاصل کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہفت زبان، بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت سیکھنے لگا جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے سائنس سے نفرت ہو گئی تھی۔ چنانچہ اب دوست کے ساتھ ہی ساتھ میں بھی یہ زبانیں سیکھنے لگا۔ یہ علم قطعی بے ضرر تھا اور دلچسپ بھی۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے پچھلے خیالات سے بھی ایک حد تک چھٹکارا مل گیا۔ عربی میں واقعی کوئی خاص بات ہے۔ کیونکہ میں عربی پڑھ کے ایک عجیب طرح کا روحانی سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

موسم گزر گیا۔ میرے مشتعل اعصاب سکون پذیر ہو گئے۔ موسم خزاں رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا جبکہ میں نے اپنے وطن جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن چند وجوہ کی بنا پر اپنے اس فیصلے پر فوراً ہی عمل نہ کر سکا یہاں تک کہ موسم سرما کی ابتدا ہو گئی اور پھر برف گرنے لگی جس کی وجہ سے راستے بند ہو گئے اور مجھے مجبوراً برف پگھلنے تک، انجلو اسٹیڈ میں رکنا پڑا۔ یہ تاخیر میرے لئے بڑی آزمائش ثابت ہوئی۔ کیونکہ میں جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

موسم سرما بھی گزر گیا۔ اور اس تمام عرصے، میں پریشان کن خیالات سے محفوظ اور بہلا رہا۔ موسم بہار ذرا دیر سے آیا لیکن دیر آید درست آید کے مصداق مسحور کن حسن لے کر آیا۔

مئی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور میں اس خط کا انتظار کر رہا تھا جو میرے سفر کی تاریخ مقرر کر دے گا۔ ایک دو ہی دن میں اس خط کے آنے کی توقع تھی۔ اس اثناء میں ہینری نے اینجلو اسٹیڈ کے مضافات کی سیر کی تجویز پیش کی تا کہ میں اس جگہ کے مناظر کو، جہاں میرا قیام ایک مدت تک رہا تھا۔ الوداع کہہ سکوں۔ میں نے اس کی یہ تجویز مان لی۔ شروع ہی سے میں اس قسم کی سیروں کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ جب اپنے وطن میں تھا تو اکثر اپنے گھر سے نکل پڑتا اور کئی کئی دنوں تک واپس نہ لوٹتا تھا۔

چنانچہ میں اور ہینری پندرہ دنوں تک مضافات میں بھٹکتے رہے۔ دیہاتوں کی کھلی فضا اور فرحت بخش ہواؤں نے میری صحت پر حیرت انگیز اثر کیا۔ میری بشاشت اور خوش مزاجی عود کر آئی۔ پچھلے کئی مہینوں سے میں تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ قدرتی مناظر بھی میرے لئے اپنا حسن اور جاذبیت کھو چکے تھے۔ مطلب یہ کہ میری ساری حسیں مردہ ہو گئی تھیں۔ لیکن ہینری نے اپنی باتوں اور کوششوں سے ان میں دوبارہ جان ڈال دی۔ ہرے بھرے کھیت، نیلا آسمان، نرمل جھیلیں، گنگناتے ہوئے چشمے اور جھرنے شور مچاتی ہوئی ندیاں اور گھنے درختوں میں چہچہاتے ہوئے پرندے مجھے روحانی مسرت اور الوہی سکون پہنچانے لگے۔ میرے رخساروں کی زردی پر حیات بخش سرخی غالب آنے لگی۔ وہ مسکراہٹ، جس سے میرے ہونٹ ایک عرصے سے نا آشنا تھے، پھر میرے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی اور وہ قہقہے جو پتہ نہیں کہاں دفن ہو گئے تھے، پھر ابل پڑے اور مجھے یوں خوش دیکھ کر ہینری بھی بشاش ہو گیا۔

اور وہ پندرہ دن گزار کر ہم واپس لوٹے۔

اور آتے وقت میں نے دیکھا کہ کھیتوں میں کسان ناچ اور گا رہے تھے۔ راہگیر، جو ہمیں ملتے تھے، بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ پرندے جوشن سے ہمارے سروں پر سے نکل جاتے تھے، ایک سرخوشی کے عالم میں چہچہا رہے تھے۔ چاروں طرف مسرتیں تھیں اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے آسمان بدل چکا ہے، زمین بدل چکی ہے، زمانہ بدل گیا ہے، اور لوگ بدل گئے ہیں۔ ہر طرف مسرتیں تھیں، خوشیاں تھیں اور میری روح پر سکون کے فرشتے سایہ فگن تھے۔



ساتواں باب

گھر پہنچتے ہی والد صاحب کا خط ملا۔

''جانِ پدر۔

یقیناً تمہیں میرے اس خط کا سخت انتظار رہا ہوگا۔ کیونکہ یہی خط تمہارے سفر کی تاریخ مقرر کرنے والا تھا۔ میں اتنا بے تاب ہوں کہ صرف ایک سطر کہ ''فلاں دن ہم تمہارے منتظر رہیں گے'' لکھ دینے کو جی چاہا۔ لیکن میں اتنا ظالم نہیں بن سکتا کہ تمہیں اندھیرے میں رکھوں۔ تم یہ سطر پڑھ کے خوش وخرم گھر آ ؤ۔ لیکن جب یہاں پہنچو تو ہمیں روتا ہوا پاؤ۔ نہیں وکٹر! میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں پہلے ہی سے تمہیں ساری باتیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک ایسا واقعہ ہو گیا ہے جس نے ہمارے دل میں نہ مٹنے والے ناسور ڈال دیئے ہیں، ایک ایسا غمناک حادثہ ہوا ہے کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ کم سے کم ہمارے خاندان میں نہ ہوا تھا۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید میں نے اس لئے باندھی ہے کہ تم اس واقعہ کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرسکو جس کے سننے اور پڑھنے کے لئے پتھر کا دل اور لوہے کا کلیجہ درکار ہے۔

سنو میرے بیٹے! ہمارا بے حد پیارا اور ننھا ولیم اب ہم میں نہیں رہا۔ وہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی ہے جس سے الفاظ پھولوں کی طرح جھڑتے تھے۔ وہ آنکھیں ہمیشہ کے بند ہوگئی ہیں جو پہاڑی جھیل کی مانند نیلی تھیں اور وہ ہونٹ سرد ہو گئے ہیں جن پر فرشتوں کا سا تبسم رہا کرتا تھا۔

وکٹر! کسی ظالم نے ہمارے اس پیارے بچے کا خون کر دیا ہے۔ میں تمہیں تسلی دینے کی کوشش نہ کرتے ہوئے پورا واقعہ بیان کئے دیتا ہوں۔

گزشتہ جمعرات کو (اور وہ مئی کی پہلی تاریخ تھی) ہم سب...... یعنی میں الزابیتھ اور تمہارے دونوں بھائی، شام گزارنے کے لئے ''پلین پالس'' گئے تھے شام گرم تھی، ہوا بند تھی اور فضا میں گھٹن۔ چنانچہ ہم گھومتے گھامتے کچھ زیادہ ہی دور نکل گئے۔ اندھیرا اتر رہا تھا جب ہمیں واپس لوٹنے کا خیال آیا۔ اور اس وقت معلوم ہوا کہ ولیم اور آرنسٹ، جو ہم سے آگے چل رہے تھے، وہاں نہ تھے۔ چنانچہ میں اور الزابیتھ ایک جگہ بیٹھ کے ان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد آرنسٹ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے پوچھا کہ ولیم ہمارے پاس آیا تو نہیں یا ہم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ دونوں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ چنانچہ ولیم بھاگ کر کہیں چھپ گیا اور اب تک اس کا کہیں پتہ نہ چلا

حالانکہ آرنسٹ نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ آرنسٹ تھک ہار کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا کہ ولیم آپ ہی جہاں چھپا ہوگا وہاں سے نکل آئے گا۔ لیکن وہ نہ آیا۔

آرنسٹ کی باتوں نے ہمیں گھبرا دیا اور ہم رات کا گاڑھا اندھیرا اترنے تک ولیم کو تلاش کرتے رہے۔ لیکن وہ نہ ملا۔ الزابیتھ نے کہا شاید وہ اکیلا ہی گھر چلا گیا ہو، ہم گھر پہنچے۔ وہ وہاں بھی نہ تھا۔ ہم لالٹین لے کر پھر اسی جگہ واپس آئے جہاں ولیم گم ہوا تھا۔ جب تک مجھے میرا بچہ نہ مل جاتا مجھے نیند آ سکتی تھی بھلا؟ الزابیتھ بھی میرے ساتھ تھی۔ ساری رات کی دیوانہ وار تلاش کے بعد صبح پانچ بجے میرا ولیم مجھے مل گیا۔

لیکن کس حال میں ......؟ وہ پیارا بچہ، جو گزشتہ شام ہی قہقہے لگا رہا تھا اور بھاگ دوڑ رہا تھا، گھاس پر پڑا تھا اور اس کے نازک حلق پر خونی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ اف! کس بے دردی سے اس ظالم نے میرے ولیم کا گلا دبایا ہوگا......!

میں ولیم کی لاش گھر لے آیا۔

میرے بشرے سے عیاں انتہائی کرب اور غم نے ولیم کی موت کا راز فاش کر دیا۔ چنانچہ الزابیتھ نے اس کی لاش دیکھنا چاہی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن الزابیتھ نے میری ایک نہ مانی۔ وہ اس کمرے میں جا گھسی جس میں ولیم کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ الزابیتھ چند ثانیوں تک ولیم کے گلے پر انگلیاں پھیرتی اور کچھ ٹٹولتی رہی اور پھر ایک چیخ مار کر بولی۔

''ہائے میں نے اس کی جان لے لی ہے۔''

پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ بڑی کوششوں کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ کچھ دیوانی سی ہو گئی۔ وہ بری طرح رونے اور سر پیٹنے لگی۔ پھر اس نے بتایا کہ اس شام، جب ہم تفریح کو جانے کی تیاریاں کر رہے تھے، ولیم نے الزابیتھ سے وہ لاکٹ طلب کیا جو تمہاری والدہ نے الزابیتھ کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا اس لاکٹ میں الزابیتھ کی تصویر تھی۔ الزابیتھ نے پہلے تو ولیم کو خوب ستایا اور پھر وہ لاکٹ اسے پہننے کے لئے دے دیا۔ جب پلین پالس گئے تو وہ لاکٹ ولیم کی گردن میں پڑا ہوا تھا۔ الزابیتھ نے کہا کہ اس لاش کی گردن میں وہ لاکٹ نہیں ہے چنانچہ اس نے کہا کہ اس سنہرے لاکٹ کے لالچ میں کسی ظالم نے ہمارے ولیم کا گلا گھونٹ دیا۔ الزابیتھ کہتی ہے کہ اگر وہ ولیم کو لاکٹ نہ دیتی تو وہ آج زندہ ہوتا چنانچہ وہ اپنے آپ کو ولیم کی قاتل کہتی اور روتی اور دیوانوں کی طرح بال نوچتی ہے خونی کا اب تک کوئی سراغ نہ ملا۔

وکٹر! میرے بیٹے فوراً آ جاؤ تم، صرف تم ہی الزابیتھ کو تسلی دے سکتے ہو۔ وہ رو رو کر ہلکان ہوئی جاتی ہے۔ اگر اس کی یہی حالت رہی تو مجھے خوف ہے کہ وہ پاگل ہو جائے گی۔

فوراً آؤ۔
غم نصیب
انفانسے فرنکسٹائن

بجلی گرنا کس کو کہتے ہیں یہ مجھے والد صاحب کا خط پڑھ کر معلوم ہوا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا اور پھٹ پڑا۔ ہینری، جو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہو گیا ہے، بھونچکا رہ گیا۔ چند ثانیوں تک وہ خاموشی سے مجھے روتے دیکھتا رہا اور پھر اس نے پوچھا۔

''کیا بات ہے وکٹر؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا، نہ دے ہی سکتا تھا، اس نے میرے ہاتھ سے خط گھسیٹ لیا اور ابھی چند سطور بھی پڑھنے نہ پایا تھا کہ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

''حیران ہوں کہ کیا کہوں وکٹر!'' اس نے کہا ''کیا یہ کہوں کہ صبر کرو...... خدایا! کیسے کیا جائے صبر......''

''ہینری! میں اسی وقت جینوا جاؤں گا۔''

''بے شک جاؤ۔ چلو چل کر گھوڑے تیار کرنے کو کہہ آئیں۔''

راستے میں وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جلد ہی بے قابو ہو کر بولا ''کتنا پیارا اور بھولا بھالا تھا ہمارا ولیم!...... میں یہ سوچ کر ہی کانپ جاتا ہوں کہ خونی کی ظالمانہ گرفت میں وہ کتنا تڑپا ہو گا...... ولیم کا گلا گھونٹنے والا انسان نہیں ہو سکتا۔''

ہینری کے آخری الفاظ میرے دل و دماغ پر نقش ہو گئے...... ''ولیم کا گلا گھونٹنے والا انسان نہیں ہو سکتا......'' کس قدر سچ کہا تھا ہینری نے۔

سائیس نے گھوڑے جوتے اور میں اپنے دوست کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔

اور میرا یہ سفر بے حد طویل ثابت ہوا۔ راستہ تھا کہ کسی طرح کٹتا ہی نہ تھا۔ اور پھر دماغ غیر واضح خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ راستے کے دلچسپ قدرتی مناظر بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے پھر خدا جانے کیا ہوا کہ اچانک ایک طرح کا انجانا سرد خوف میرے رگ و ریشے میں سرائیت کر گیا۔ میں یوں محسوس کرنے لگا کہ وہاں، جہاں میں جا رہا ہوں، میرے لئے خطرہ ہے۔ کیوں ہے اور کس کی طرف سے ہے، یہ میں نہ جانتا تھا۔ اس احساس نے اتنی شدت اختیار کی کہ میں گھر جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ چنانچہ لوسیانہ میں رک گیا۔

اور دو دن تک میں لوسیانہ میں ٹھہرا رہا۔ اپنے قیام کے ان دو دنوں میں سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا رہا۔ اس خلفشار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میں نے اس تالاب کے کئی چکر لگائے جس

کے مناظر پہلے مجھے مسحور کر دیا کرتے تھے۔جھیل کا پانی نیلا اور شفاف تھا۔دور برف پوش پہاڑ سر بلند کیئے، کھڑے تھے اور پھر دوسری طرف جنگلات تھے۔

آہستہ آہستہ میرے اعصاب سکون پذیر ہونے لگے۔وہ کھنچاؤ جو میں اپنی رگ رگ میں محسوس کر رہا تھا، رفتہ رفتہ کم ہونے لگا اور پھر غائب ہو گیا تیسرے دن میں جنیوا کی طرف روانہ ہوا۔راستہ جھیل کے کنارے کنارے اور اس کا چکر کاٹتا ہوا جاتا ہے۔جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی راستہ تنگ اور ناہموار ہوتا جا رہا تھا۔دوپہر کو کوہ جورا اور بلانک کی چوٹیاں نظر آنے لگیں...... میرے وطن کے پہاڑ...... انہیں دیکھتے ہی بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہی انجانا سرد خوف پھر میرے وجود پر مسلط ہونے لگا۔

رات کا اندھیرا اتر آیا۔پہاڑوں کی چوٹیاں اندھیرے میں غائب ہو گئیں میرا خوف شدت اختیار کرنے لگا۔میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسا اور کاہے کا خوف تھا...... تاہم مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرا غم مکمل نہ ہوا تھا۔ابھی کچھ اور ہونا باقی تھا۔ولیم کی موت میرے لئے کافی نہ تھی۔ابھی کچھ اور ہونے والا تھا۔کوئی غیر متوقع واقعہ...... کوئی انکشاف۔

اندھیرا گاڑھا ہو چکا تھا۔جب گاڑی جنیوا کے مضافات میں داخل ہوئی شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے اور صبح سے پہلے کھلوائے نہ جا سکتے تھے، چنانچہ ایک گاؤں میں، جو شہر سے نصف میل کے فاصلہ پر ہے اور شارول کہلاتا ہے، رات گزارنے کے لئے ٹھہر گیا۔وہ رات بڑی بھیانک، آسمان بادلوں سے سیاہ ہو رہا تھا۔مجھے نیند نہ آ رہی تھی۔چنانچہ میں نے اس جگہ جانے کا فیصلہ کیا۔جہاں ولیم کا خون کیا گیا تھا۔وہ جگہ شارول سے زیادہ دور نہ تھی، ایک راستہ شہر سے پلین پالس تک جاتا تھا اور وہ خشکی کا راستہ ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔چنانچہ اب صرف یہی راہ رہ گئی تھی کہ میں کشتی لے کر تالاب عبور کرتا اور پھر پلین پالس پہنچتا۔میں نے یہی کیا اور جب میں تالاب عبور کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ کوہ بلانک پر بجلی کوندر ہی تھی۔طوفانِ بادوباراں کوہ بلانک سے چل کر اسی طرف آ رہا تھا اور بڑی تیزی سے۔جب میں نے تالاب کے دوسرے کنارے پر قدم رکھا تو آگے بڑھنے کے بجائے ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ طوفان کی آمد کا تماشہ دیکھ سکوں، بجلی مسلسل چمک رہی تھی اور اب میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز بھی سن رہا تھا۔کالے کالے بادلوں کے دَل کوہ بلانک کے عقب سے دفعتہً اٹھے اور آسمان پر چھانے لگے۔رات تاریک سے تاریک تر ہو گئی۔بارش کی بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں۔بجلی چمکی۔کڑک اور گرج کی آوازوں سے میدان، جنگل اور پہاڑ گونج اٹھے اور پھر یوں معلوم ہوا جیسے آسمان چھلنی ہو گیا ہو۔

اور میں موسلا دھار بارش میں کھڑا تھا۔

بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ بجلی برابر چمک رہی تھی۔ کڑک اور گرج کی آوازوں میں دہلا دینے والی شدت آ گئی تھی۔ لیکن یہ چیزیں مجھے روک نہ سکیں۔ میں ٹیلے پر سے اتر کر آگے بڑھا۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد میں رک گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر چلایا۔

''ولیم...... دیکھ عناصر تیرا ماتم کر رہے ہیں۔''

ابھی میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ قریب کے درختوں میں سے دفعتہً ایک سایہ نکل آیا۔ میں سمجھا کہ میرا وہم تھا۔ میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں میں نے کچھ دیکھا...... وہ میرا وہم نہ تھا۔ بجلی کی روشنی میں مَیں نے ''اسے'' دیکھا...... ہیبت ناک اور دیو قامت۔ یقیناً وہ میرا وہم نہ تھا...... وہ واقعی درختوں میں سے نکل آیا تھا...... ''وہ'' وہی تھا جسے میں نے بنایا تھا اور جسے میں نے حیات بخشی تھی۔...... ''وہی''...... لیکن ''وہ'' یہاں کیا کر رہا تھا؟ اور پھر مجھے خیال آیا...... کہیں ''وہی'' تو میرے بھائی کا قاتل نہیں؟...... اور دوسرے لمحے میرا یہ شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔ ہینری نے کہا تھا...... ''ولیم کا گلا گھونٹنے والا انسان نہیں ہو سکتا۔''

ٹھیک ہے...... ''وہ'' انسان کہاں تھا۔...... بے شک ''وہی'' میرے بھائی کا قاتل ہے......'' خونی، ظالم...... میرا سر گھومنے لگا اور گرنے سے بچنے کے لئے میں ایک درخت کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ خونی...... خونی ''وہ'' میرے سامنے تھا۔ میرے بھائی کا قاتل اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے ''اس'' سے انتقام لینے اور ''اس'' کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اب اس کا وقت نہ تھا۔ کیونکہ جب دوسری دفعہ بجلی کوندی تو میں نے دیکھا کہ ''وہ'' وہاں نہ تھا۔ بلکہ سامنے والی پہاڑی پر، جو سایول کہلاتی ہے اور پلین پالس کو شمالی خطے سے جوڑتی ہے، حیرت انگیز اور غیر انسانی تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ چوٹی پر پہنچ کر شاید دوسری طرف اتر گیا۔

میں بت بنا کھڑا تھا۔ کڑک وگرج کی آوازیں خاموش ہو چکی تھیں لیکن بارش نہ تھمی تھی اور گردو پیش کا منظر اندھیرے کی گیلی چادر میں لپٹا ہوا تھا اور میں بارش میں کھڑا وہ واقعات یاد کر رہا تھا جنہیں اب تک میں نے بھولنے کی کوشش کی تھی۔

میرا انسانی ڈھانچہ بنانا، پھر اس میں جان ڈالنا، میرا خوف، تجربہ گاہ سے میرا فرار، صبح بیدار ہوتے ہی میرا اس کو دیکھنا، اس طرح کہ وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا اور کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر ہینری کے ساتھ میرا واپس آ کر ''اس'' کو یہاں نہ پانا...... اور ''اسے'' میرے یہاں سے رخصت ہوئے تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے اور اس طویل عرصے میں وہ کیا کرتا رہا تھا؟ ولیم کا قتل...... کیا اس کا پہلا جرم تھا؟ میں کانپ گیا اور مجھے ایک بھیانک احساس ہوا۔ میں نے۔ وکٹر فرنکسٹائن نے...... ایک شیطان کو دنیا میں آزاد چھوڑ دیا تھا جو معصوموں کے گلے دبا کر مسرت حاصل کرتا تھا۔ میں نے اپنے

جیسا ایک انسان بنانا چاہا تھا۔لیکن اس کے بجائے میں نے ایک شیطانی ہیولا اور خونی انسان تخلیق کیا۔

''وہی'' میرے بھائی کا قاتل تھا۔

اور میں نے وہ رات وہیں گزاری۔صبح تک میں بارش میں بھیگتا اور سردی سے ٹھٹھرتا رہا۔میں خود اپنے بھائی کا قاتل ہوں...... میرا ہی ''وہ'' بنایا ہوا تھا۔وہ گویا میری ہی ناپاک روح تھی جو دنیا میں آزاد گھوم رہی تھی، جو معصوموں کی جان لے رہی تھی اور خود مجھے ہی غم دے رہی تھی۔

آخر کار بھیگی ہوئی سرد اور اداس صبح طلوع ہوئی اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے شہر کی طرف چلا۔ شہر کے دروازے کھل چکے تھے۔میں شہر میں داخل ہو کر اپنے گھر کی طرف چلا اور گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ چونکہ میں خونی کو جانتا ہوں اس لئے پہلا کام یہ کروں گا کہ چند لوگوں کو ساتھ لے کر ''اس'' کا تعاقب کروں گا۔''لیکن'' میں نے سوچا اس طرح پوری کہانی سنانی پڑے گی......لیکن کیا لوگ میری اس کہانی کو مجذوب کی بڑ، نہ سمجھیں گے؟ کیا کوئی بھی اس پر یقین کرے گا؟ نہیں۔کوئی یقین نہ کرے گا سب مجھے پاگل تصور کریں گے۔اگر میرے بجائے کوئی دوسرا ''اس'' کا خالق ہوتا اور مجھے اپنی کہانی سناتا تو کیا میں اس پر یقین کر لیتا؟ نہیں......اور بلفرض محال میرے عزیزوں نے میری بات مان بھی لی تو کیا ہم اس کا تعاقب کر سکیں گے؟ کیا ''اسے'' گرفتار کر سکیں گے؟ شاید نہیں۔وہ عمودی چٹانوں پر غیر انسانی تیزی سے چڑھ سکتا ہے۔اسے گرفتار کرنا ممکن نہیں چنانچہ فی الحال میں نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔

صبح کے پانچ بج رہے تھے کہ میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔ملازمین میرے استقبال کو دوڑ پڑے۔میں نے ان سے کہا کہ کسی کو بھی بیدار نہ کیا جائے۔وہ لوگ جب اپنی نیند پوری کر کے اٹھیں گے تو میں ان سے مل لوں گا۔چنانچہ میں مطالعہ گاہ میں چلا گیا۔

چھ سال...... پورے چھ سال بعد میں عین اسی جگہ کھڑا تھا جہاں والد صاحب نے مجھے آخری دفعہ گلے لگایا تھا۔پورے چھ سال بیت گئے تھے۔لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ کل کا واقعہ ہو ...... آتشدان پر والدہ کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔یہ تصویر والد صاحب نے اپنے ایک مصور دوست سے بنوائی تھی اور اس وقت کی تھی جب والدہ کی شادی نہ ہوئی تھی۔تصویر یوں تھی کہ والدہ اپنے والد، بوفرٹ، کے تابوت کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھیں۔اس تصویر کے قریب ہی ولیم کی تصویر تھی وہ مسکرا رہا تھا۔اس تصویر پر نظر پڑتے ہی میرے آنسو بہنے لگے۔ابھی میں تصویر کے سامنے سے ہٹا نہ تھا کہ آرنسٹ آ گیا۔ملازموں سے اسے میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔چنانچہ وہ بستر سے نکل کر سیدھا مطالعہ گاہ میں آیا تھا۔

''آ گئے بھائی جان!'' اس نے کہا'' کاش کہ آپ تین مہینے پہلے آئے ہوتے اس وقت آپ ہمیں مسرور پاتے۔ اب تو آپ ہمیں غمگین اور آنسو بہاتے دیکھ رہے ہیں۔ بہر حال اچھا ہوا کہ آپ آ گئے۔ شاید آپ کی موجودگی ابا کی ڈھارس بندھا سکے اور آپ الزابیتھ کو تسلی دے سکیں۔ وہ تو جیسے دیوانی ہوگئی ہے۔ بس ہر دم روتی رہتی ہے اور اپنے آپ کو ولیم کی قاتلہ کہتی ہے۔''

اور آرنسٹ رو پڑا۔ میں اپنا غم بھول کر اسے تسلی دینے لگا اور پھر والد صاحب اور الزابیتھ کے متعلق پوچھا۔

''الزابیتھ کی حالت قابل رحم ہے'' اس نے کہا'' وہ اپنے آپ کو ولیم کی قاتلہ سمجھتی ہے۔ لیکن اب چونکہ خونی کا پتہ چل گیا ہے اور اسے گرفتار......

''پتہ چل گیا ہے! گرفتار کر لیا گیا ہے!'' میں نے حیرت سے کہا'' یہ کیسے ممکن ہے...... سیل بے پناہ کو ایک تنکے سے روکنا ممکن ہے لیکن ''اسے'' گرفتار کرنا ناممکن ہے...... میں نے بھی ''اسے'' دیکھا ہے۔ گزشتہ رات ہی ''وہ'' آزاد تھا۔

''خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کس کے متعلق کہہ رہے ہیں!'' آرنسٹ نے حیرت سے کہا'' لیکن یہ حقیقت ہے بھائی جان کہ جرم ثابت ہو چکا ہے اور خلاف توقع انکشاف نے ہمارا غم دو چند کر دیا ہے۔ ناقابل یقین سی بات ہے۔ لیکن چند ثبوت ایسے ٹھوس مل گئے ہیں کہ اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ لیکن الزابیتھ کسی طرح اسے خونی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بھائی جان کہ کون یقین کرے گا کہ جسٹائن، جو ہمارے یہاں پلی بڑھی، جسے والدہ نے اپنی بیٹی کی طرح رکھا، دفعتہً ایسی سنگدل بن جائے گی کہ اسی کا گلا گھونٹ دے گی جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھی تھی۔''

''جسٹائن! خونی! یہ کیسے کہہ رہے ہو آرنسٹ! ولیم کی قاتلہ جسٹائن اور...... اور...... تم نے یقین کر لیا؟''

اور کیا کرتے بھائی جان؟ یقین کرتے ہی بنا۔ کیونکہ چند ٹھوس ثبوت مل گئے اور پھر جسٹائن کی حالت کچھ ایسی مشکوک رہی کہ جو تھوڑا بہت شک تھا وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے خوف ہے کہ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آج جسٹائن پر مقدمہ چلے گا...... اور آپ خود اپنے کانوں سے سب کچھ سن لیں گے۔''

اور پھر آرنسٹ نے بتایا کہ اسی صبح، جس صبح کہ ولیم کی لاش ملی، جسٹائن اچانک بیمار ہوگئی اور کئی دنوں تک پلنگ پر سے نہ اٹھ سکی۔ اس عرصے میں ہمارے ایک ملازم نے اتفاقاً جسٹائن کے ان کپڑوں کی تلاشی لی، جنہیں وہ اس رات پہنے ہوئے تھی جس رات کو ولیم کا خون کیا گیا تھا۔

جسٹائن کے اسکرٹ کی جیب سے اسے وہ سنہرا لاکٹ مل گیا جو ولیم نے الزابیتھ سے لے کر

اپنے گلے میں ڈال لیا تھا۔اس ملازم نے وہ لاکٹ دوسرے ملازموں کو دکھا کر پورا واقعہ بیان کیا اور وہ سب کے سب گھر والوں کو خبر کئے بغیر تھانے پہنچے۔قصہ مختصر جسٹائن گرفتار ہوگئی۔جب اسے گرفتاری کا سبب بتایا گیا تو جسٹائن نے اپنی بڑھی ہوئی گھبراہٹ اور بے ربط باتوں سے پولیس کا شک اور بھی پختہ کر دیا۔

یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔لیکن یہ انکشاف میرا یقین ڈانوا ڈول نہ کر سکا۔

''خدا کے لئے آرنسٹ ایسا نہ کہو۔تم لوگ ایک زبردست غلط فہمی کے شکار ہو۔میں جانتا ہوں کہ خونی کون ہے......اور جسٹائن بے گناہ ہے۔''

عین اس وقت والد صاحب مطالعہ گاہ میں داخل ہوئے اور میں نے دیکھا کہ وہ بہت زیادہ بوڑھے اور کمزور نظر آرہے تھے۔ان کی آنکھیں پرنم تھیں انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔

''ابا'' آرنسٹ نے کہا ''بھائی جان خونی کو جانتے ہیں۔''

''افسوس! ہم بھی جانتے ہیں اسے'' انہوں نے کہا'' کاش کہ ہم اسے نہ جانتے ہوتے۔کاش ولیم کے خونی کا پتہ چلا نہ ہوتا۔ایک ولیم کی موت کا ہی غم کیا کم تھا کہ جسٹائن مجرمہ ثابت ہوئی۔ہم سب اسے چاہتے ہیں لیکن......''

''جسٹائن بے گناہ ہے۔''میں نے بڑے وثوق سے کہا۔

''اگر ایسا ہی ہے تو خدا اس کی حفاظت کرے۔آج مقدمہ چلے گا اور میں یہی چاہتا ہوں،خدا کی قسم یہی چاہتا ہوں کہ اس کا جرم ثابت نہ ہو اور وہ بری ہو جائے۔خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔''

''ہم سب بھی یہی چاہتے ہیں۔'' آرنسٹ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

میں جانتا تھا کہ جسٹائن بے گناہ ہے۔میں جانتا تھا کہ خونی کون تھا۔چنانچہ اس طرف سے میں مطمئن تھا کہ جسٹائن کے خلاف ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملے گا جو اسے قطعی طور پر گنہگار ثابت کردے۔چنانچہ اسے بچانے کے لئے مجھے اپنی کہانی نہ سنانی پڑے گی۔اور سچ تو یہ ہے کہ میری کہانی پر کوئی یقین کر بھی نہ سکتا تھا۔

تھوڑی دیر میں الزابیتھ بھی آ گئی۔اس الزابیتھ میں، جسے میں نے چھ سال پہلے دیکھا تھا، اور آج کی الزابیتھ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ان چھ برسوں میں وہ پوری جوان ہوگئی تھی۔بچپنے کے معصوم حسن پر جوانی کا پختہ حسن غالب آچکا تھا۔اس کے بشرے سے پہلے کا سا ہی خلوص، زندہ دلی اور زیرکی عیاں تھی۔لیکن اب ان جذبات میں پختگی آ گئی تھی۔اس نے بڑی گرم جوشی سے لیکن مغموم مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

''خدا کا شکر ہے تم آ گئے وکٹر!'' اس نے کہا'' تمہارے آنے سے میری ڈھارس بندھی ہے۔

شاید تم کسی طرح جسٹائن کو بے گناہ ثابت کرسکو، اس خیال نے، کہ وہ بے گناہ پکڑی گئی ہے، مجھ سے میرا سکون چھین لیا ہے۔ اگر اس کی بے گناہی ثابت نہ ہوئی تو وکٹر، میں مرتے دم تک سکون نہ پا سکوں گی میں جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔"

"بے شک جسٹائن بے گناہ ہے۔" میں نے کہا "فکر نہ کرو۔ وہ بری کر دی جائے گی۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ سبھی اسے مجرمہ سمجھتے ہیں اور لوگوں کا یقین مجھے اور بھی زیادہ پریشان اور مایوس کئے دیتا ہے۔ یہ ناممکن ہے...... وکٹر یہ ناممکن ہے۔ جسٹائن کسی طرح ولیم کا خون نہیں کر سکتی۔ لوگ تو اندھے اور بے وقوف ہیں کہ انہوں نے یقین کر لیا۔"

اور وہ رونے لگی۔

"اپنے آنسو پونچھوالزابیتھ" والد صاحب نے کہا "اگر جسٹائن واقعی بے گناہ ہے تو خدا اس کی مدد کرے گا۔ اگر لوگ اندھے اور بے وقوف ہیں تو قانون پر بھروسہ کرو جو اندھا اور بے وقوف نہیں ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں جسٹائن کے خلاف کوئی بیان نہ دوں گا۔ بلکہ اسے بچانے کی کوشش کروں گا ولیم اب ہمیں واپس نہیں مل سکتا۔ چنانچہ جسٹائن کو گنہگار ثابت کرنے سے ہمیں کیا مل جائے گا؟ ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ وہ بری کر دی جائے۔ وہ بے حد پیاری لڑکی ہے جس طرح تم میری بیٹی ہو اس طرح وہ بھی میری بیٹی ہے۔ آؤ ہم سب مل کر دعا کریں کہ جسٹائن رہا کر دی جائے۔"



آٹھواں باب

مقدمہ گیارہ بجے شروع ہونے والا تھا۔ ہمارا اس وقت تک کا وقت بڑا آزمائشی گزرا۔ والد صاحب اور گھر کے دوسرے افراد کو بطور گواہ طلب کیا گیا۔ چنانچہ میں بھی عدالت میں گیا اور تمام عرصے میں جبکہ قانون اور انصاف کے منہ پر کالک لگائی جاتی رہی، میں سخت روحانی اضطراب میں مبتلا رہا۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ میں خاموش رہوں یا سب کچھ بتا دوں؟ ''وہ'' آزاد گھوم رہا تھا۔ ''وہ'' خونی تھا۔ جسٹائن بے گناہ تھی۔ ایک جان جا ہی چکی تھی اس بچے کی جو موت کے ناٹک سے ناواقف تھا۔ اور اب جسٹائن کی جان خطرے میں تھی۔ وہ جوان تھی۔ اس کے سامنے مستقبل تھا، اس کی زندگی خوشگوار بن سکتی تھی، وہ ہنسی خوشی زندگی کے دن پورے کر سکتی تھی۔ ابھی اس نے دنیا میں کچھ نہ دیکھا تھا۔ وہ بچپن سے دکھی تھی اور یہ آخری اور کاری وار تھا جو قسمت نے اس پر کیا تھا۔ خدا جانے جسٹائن نے مستقبل کے متعلق کتنے ہی حسین خواب دیکھے ہوں گے۔ لیکن اب اس کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا اور میں...... میں ہی جسٹائن کی موت کا باعث بنوں گا...... میری وجہ سے میرے بھائی کی جان گئی...... میرا شوق تجسس، جس کا ہیبت ناک نتیجہ دنیا میں آزاد گھوم رہا تھا، ایک معصوم کی جان لے چکا تھا اور اب دوسرے کی جان لینے والا تھا۔ اور کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آئندہ کتنی جانیں اور جائیں گی...... میں اس جرم کا اقرار کر لیتا جس کا الزام جسٹائن کے سر منڈھ دیا گیا تھا۔ لیکن میں اس وقت جنیوا میں تھا۔ چنانچہ میرا اقرار میری پچھلی اعصابی علالت کا سبب سمجھا جاتا۔ اور میرا یہ اقرار یقیناً جسٹائن کو رہا نہ کرا سکتا۔ جسٹائن پرسکون تھی۔ وہ سیاہ ماتمی لباس پہنے تھی، اس کے بشرے سے حد درجہ غم والم کا اظہار ہو رہا تھا، اور اس عالم میں وہ بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اسے اپنی بے گناہی کا یقین تھا چنانچہ وہ نہ تو گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی اور نہ ہی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے گو عدالت میں موجود ہر شخص غصہ، نفرت اور حقارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

جب اسے عدالت کے کمرے میں لایا گیا تو اس نے دروازے کے کے قریب رک کے چاروں طرف دیکھا۔ ہمیں دیکھ کے مسکرائی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اس نے سر کے اشارے سے ہمیں سلام کیا اور آگے بڑھ گئی۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔

مجرمہ پر عائد کردہ الزام کی تفصیل سنانے کے بعد گواہ طلب کئے گئے اور جسٹائن کے خلاف چند

عجیب وغریب واقعاتی ثبوت پیش کیے گئے۔ اگر میں خونی کو نہ جانتا ہوتا تو میں بھی جسٹائن کو ہی مجرمہ تسلیم کر لیتا...... جس رات ولیم کا خون کیا گیا اس رات جسٹائن صبح تک غائب رہی اور علی الصبح اس جگہ دیکھی گئی جو موقع واردات سے دور نہ تھی۔ ایک عورت نے، جو سبزی بیچنے شہر کی طرف جا رہی تھی، جسٹائن کو وہاں دیکھا تھا۔ اس عورت نے جسٹائن سے پوچھا کہ وہ وہاں کیا کر رہی تھی لیکن جسٹائن کی حالت، کہا گیا، دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ اس نے عورت کے سوال کا کچھ اوٹ پٹانگ جواب دیا۔ وہ صبح آٹھ بجے گھر پہنچی اور جب کسی نے پوچھا کہ وہ ساری رات کہاں رہی تو اس نے جواب دیا کہ وہ ولیم کو تلاش کر رہی تھی۔ اور پھر جسٹائن نے پوچھا کہ ولیم کا کوئی پتہ چلا یا نہیں۔ اور جب اسے ولیم کی لاش دکھائی گئی تو اس پر ہسٹریا کے سے دورے پڑے اور وہ کئی دنوں تک بستر پر سے اٹھ نہ سکی...... پھر وہ لاکٹ وکیلوں اور ججوں کو دکھایا گیا جو ایک ملازم کو جسٹائن کے کپڑوں میں سے ملا تھا اور جب الزابیتھ نے اقرار کیا کہ وہ وہی لاکٹ ہے جو ولیم نے اس سے، الزابیتھ سے لے کر اپنے گلے میں ڈال لیا تھا تو عدالت کا کمرہ مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھنا اٹھا۔

اور اب جسٹائن کو بلایا گیا۔

عدالت کی کارروائی جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی جسٹائن کے بشرے سے حیرت اور خوف کا اظہار ہوتا جا رہا تھا اور بعض دفعہ وہ بڑی مشکلوں سے اپنے آنسو روک سکی۔ جب اس سے کہا گیا کہ وہ اپنی صفائی میں اگر کچھ کہنا چاہے تو کہہ سکتی ہے تو اس نے بے حد دھیمی مگر صاف آواز میں یوں کہا۔

''خدا گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ تاہم جانتی ہوں کہ میرا بیان اور میرا احتجاج مجھے رہا نہ کرا سکے گا۔ اس کے باوجود میں اپنا بیان دوں گی وکلاء اور جج صاحب سے میری درخواست ہے کہ وہ میرا بیان غور سے سنیں اور میری پچھلی زندگی اور اس گھر سے، جہاں میں رہتی ہوں، میرے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے متعلق فیصلہ کریں، یقین ہے کہ عدالت میرے متعلق کوئی غلط فیصلہ نہ کرے گی......''

اس نے کہا کہ رات، جس رات کو ولیم کا خون کیا گیا، وہ اپنی چچی کے یہاں تھی۔ اس کی چچی شین نامی گاؤں میں، جو شہر سے ایک فرسخ کے فاصلے پر ہے، رہتی ہے، اس نے اپنی چچی کے یہاں جانے کی اجازت الزابیتھ سے لے لی تھی۔ رات کو نو بجے وہ واپس آ رہی تھی کہ راستے میں اسے ایک آدمی ملا جس نے اس سے پوچھا کہ اس نے کہیں ولیم کو تو نہیں دیکھا۔ یہ سن کر کہ ولیم کہیں گم ہو گیا ہے وہ بہت پریشان ہوئی اور کئی گھنٹوں تک اسے تلاش کرتی رہی اس عرصے میں شہر کے دروازے بند ہو گئے۔ چنانچہ بقیہ رات وہ مویشیوں کے ایک ڈیرے میں جو کسی کاشتکار کی جھونپڑی سے ملحق تھا، گزارنے پر مجبور ہو گئی وہ کاشتکار اور اس کی بیوی کو جانتی تھی۔ لیکن اتنی رات گئے انہیں بیدار کرنا اس

نے مناسب نہ سمجھا۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے اس کی آنکھ لگ گئی۔ یہ اسے نہیں معلوم کہ کب تک سوتی رہی۔ البتہ اتنا اسے یاد ہے کہ اس نے بھاری قدموں کی آواز، چاپ سنی تھی۔ کچھ عجیب سی چاپ تھی وہ جیسے کوئی بہت ہی بڑا درندہ چل رہا ہو۔ اس آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی لیکن اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی نہ تھا، چنانچہ اس نے کہا، یہ یقیناً اس کا وہم ہوگا۔

بہرحال وہ بیدار ہوئی تو پو پھٹ رہی تھی وہ باڑے میں سے باہر آ گئی کہ پھر ولیم کو تلاش کرے۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ کیا واقعہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ ولیم کو تلاش کرتی ہوئی اس جگہ تک گئی جہاں ولیم کا خون کیا گیا تھا۔ جس جگہ اسے سبزی فروش عورت نے دیکھا تھا۔ چونکہ وہ رات بھر سو نہ سکی تھی اور پھر ولیم کی گمشدگی سے پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی اس لئے سبزی فروش عورت کے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکی۔ اب رہا وہ لاکٹ تو اس کے متعلق جسٹائن کچھ نہ جانتی تھی کہ وہ اس کے کپڑوں میں کہاں سے آ گیا۔ ”میں جانتی ہوں۔“ اس بے گناہ لڑکی نے کہا ”کہ یہ لاکٹ میرے خلاف کتنا زبردست ثبوت پیش کر رہا ہے لیکن! افسوس کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی کہ وہ میرے کپڑوں میں کہاں سے آ گیا۔ البتہ ایک بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کوئی شخص یہ لاکٹ میرے اسکرٹ کی جیب میں رکھ گیا ہوگا۔ لیکن وہ شخص کون ہو سکتا ہے؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟...... جہاں تک میں جانتی ہوں میرا کوئی دشمن نہیں۔ میں نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں کہ اس نے مجھ سے بدلہ لینے کے لئے یہ ترکیب کی ہو۔ تو پھر کیا وہ ہے کہ خونی وہ لاکٹ میری جیب میں رکھ گیا؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس لئے کہ وہ میرا دشمن تھا اور مجھے برباد کرنا چاہتا تھا؟ لیکن میں کہہ چکی ہوں کہ میرا کوئی دشمن نہیں۔ اور پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ سونے کے اس لاکٹ کو، جس کے لالچ میں اس نے ایک معصوم کا گلا گھونٹ دیا، اپنے ساتھ لے جانے کے بجائے میری جیب میں رکھ گیا۔“

چنانچہ چند ایسے گواہ طلب کے گئے جو جسٹائن کو بچپن سے جانتے تھے انہوں نے جسٹائن کی تھوڑی بہت تعریف کی۔ لیکن میں یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ ان گواہوں کو بھی جسٹائن کے مجرمہ ہونے کا یقین تھا اور ان کی آنکھوں سے نفرت وحقارت کے جذبات عیاں تھے۔ چنانچہ عدالت سے انہوں نے جسٹائن کی تعریف میں جو کچھ کہا گویا جبراً کہا۔ الزابیتھ نے جب یہ حالت دیکھی تو برداشت نہ کر سکی اور کھڑے ہو کر عدالت سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔

”میں اس لڑکے کی“ الزابیتھ نے کہا ”جس کا خون کیا گیا ہے۔ ایک طرح بہن ہوں۔ میری پرورش اسی گھر میں ہوئی ہے اور میں ولیم کی پیدائش سے پہلے اس گھر کی ایک فرد بن چکی تھی اور جو کچھ بھی ہوں ولیم کے والدین کی مہربانیوں احسانوں اور محبت کی وجہ سے ہوں، چنانچہ ملزمہ کی حمایت

میں میرا کچھ کہنا نامناسب سمجھا جائے گا۔لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ قانون ایک بے گناہ کو پھانسی پر لٹکانا چاہتا ہے اور وہ لوگ، جو ملزمہ کو جانتے ہیں اور اس کی شرافت کے قائل ہیں، بے جا تعصب سے اندھے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ملزمہ کے متعلق وہ باتیں نہیں کہیں جو انہیں کہنی چاہئیں تھیں ''۔

''میں ملزمہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کیونکہ ہم دونوں کئی سال تک ایک ہی گھر میں رہے ہیں۔ پہلی دفعہ وہ پانچ اور دوسری دفعہ، یعنی اس کی والدہ کے انتقال کے بعد، دو سال تک ہمارے ساتھ رہی ہے۔اس تمام عرصے میں اس نے ہمیں کسی طرح کی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ وہ بے حد مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی ثابت ہوئی ہے۔ اس نے مادام فرنکسٹائن کے آخری دنوں میں ان کی ایسی خدمت کی ہے جیسی کہ خود ان کی اولاد بھی نہ کرسکتی تھی پھر وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہی اور ان کی خدمت کرنے میں بھی اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ حالانکہ مرحومہ کا سلوک اپنی بیٹی کے ساتھ بڑا ہی ظالمانہ تھا۔اپنی والدہ کے انتقال کے بعد وہ ہمارے یہاں آ گئی۔ملزمہ کو ولیم سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ ایک ماں کی سی نظر سے اسے دیکھتی تھی۔ چنانچہ ملزمہ کے خلاف بہت ثبوت مل جانے کے باوجود، میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ بے گناہ ہے۔ وہ کبھی ایسا مذموم اور ظالمانہ کام نہیں کرسکتی۔ دنیا کا کوئی لالچ اسے اپنے کام کے لئے اکسا نہیں سکتا...... جسٹائن بے گناہ ہے۔ سراسر بے گناہ ہے۔ وہ سو جنم لے کر بھی ایسے کام کے لئے خود کو تیار نہیں کرسکتی۔''

ایک بار پھر عدالت کا کمرہ مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھنا اٹھا۔لوگ الزابیتھ کی تقریر کی تعریف کررہے تھے لیکن افسوس کہ ان کے دل جسٹائن کی طرف سے صاف نہ ہوئے۔اس کے برخلاف وہ اسے احسان فراموش، محسن کش کہنے لگے۔ الزابیتھ کی تقریر کے درمیان جسٹائن روتی رہی تھی۔

اب رہا میں......تو میری عجیب حالت ہو رہی تھی میں خونی کو جانتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جسٹائن بے گناہ ہے......تو پھر کیا ''وہ'' اس معصوم کو بھی پھانسی پر لٹکتا دیکھنا چاہتا تھا؟ کیوں؟ اور اس ''کیوں'' کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ جسٹائن کو پھنسانے والا بھی وہی ہے...... جب وکیلوں اور جج کے چہروں کے جذبات سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جسٹائن کو ہی خونی سمجھتے ہیں تو میں برداشت نہ کرسکا۔ اور عدالت کے کمرے سے باہر آ گیا۔ جسٹائن جس روحانی اذیت میں مبتلا تھی اس اذیت میں، جس میں میں مبتلا تھا اور یہ یقین اس کی اذیت میں کچھ تخفیف کر رہا تھا۔لیکن میں خونی کو جانتا تھا۔ میں ''اس'' کا خالق تھا۔ وہی شیطان میرے بھائی کا خونی تھا اور اب ''وہ'' اپنی دورخی ہوشیاری سے میرے گھر کی ایک بے گناہ لڑکی کو پھانسی کے تختے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ چنانچہ ندامت، پشیمانی اور ضمیر کی ملامت مجھے دیوانہ کئے دے رہی تھی۔

تمام رات میں عجیب روحانی کرب میں مبتلا رہا اور صبح ہوتے ہی سیدھا عدالت پہنچا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس لئے باوجود کوشش کے وہ بات نہ پوچھ سکا جو پوچھنے گیا تھا اور وہ کہہ نہ سکا جو کہنا چاہتا تھا۔ وکیل مجھے جانتے تھے چنانچہ انہوں نے میرے وہاں جانے کا مقصد سمجھ لیا۔

''جیوری اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ جسٹائن گناہ گار قرار دی جا چکی تھی۔

حیران ہوں کہ اپنی اس وقت کی حالت کا بیان کن لفظوں میں بیان کروں پہلے بھی کئی دفعہ میں نے خوف اور سنسنی محسوس کی تھی، پہلے بھی کئی بار میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہریں دوڑی تھیں لیکن پہلے میں نے ان پر قابو حاصل کر لیا تھا ان پر دوسرے جذبات غالب آ گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد کہ جسٹائن گنہگار قرار دے دی گئی ہے۔ میری کچھ ایسی حالت ہوگئی۔ جسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ پھر ایک دوسرا حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ اس شخص نے، جس سے میں مصروف گفتگو تھا، بتایا کہ جسٹائن نے اقبال کر لیا ہے۔ میں ایک سناٹے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

''اور یہ اچھا ہی ہوا کہ اس نے اقبال جرم کر لیا'' وہ شخص بولا۔ ''آپ جانتے ہیں محض واقعاتی ثبوت کی بنا پر کسی کو مجرم قرار دینا اور پھر سزا سنانا ناممکن سی بات ہے چنانچہ جسٹائن نے اقبال جرم کر کے ہماری بہت بڑی مشکل آسان کر دی ہے۔''

''میرے خدا! یہ کیا ہو گیا! جسٹائن نے اقبال جرم کر لیا؟ کیوں! اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور کیا ساری دنیا اندھی ہو گئی ہے۔ یا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ کیا میں خونی کا پتہ بتا دوں؟ کیا میں اپنی کہانی سنا دوں؟ کیا لوگ اس کہانی پر یقین کریں گے؟ خصوصاً اب جبکہ جسٹائن نے اپنے جرم کا...... میرے خدا! میں کیا کروں؟ کیا کروں؟۔''

اور پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔

''کیا ہوا؟'' الزابیتھ نے، جو میری منتظر تھی، بڑی بے تابی سے پوچھا۔

''جسٹائن نے اقبال جرم کر لیا ہے'' میں نے کراہ کے ساتھ جواب دیا۔

الزابیتھ پر جسے جسٹائن کی بے گناہی کا یقین تھا، سکتہ طاری ہو گیا چند ثانیوں تک وہ کچھ بول نہ سکی۔

''جسٹائن ......خونی!'' وہ رک رک کر بولی ''میرے خدا! آدمی کس پر یقین کرے! لیکن...... یقین نہیں آتا......جسٹائن نے ولیم کو...... دنیا کا خون سفید ہو گیا ہے......''

تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ جسٹائن الزابیتھ سے ملنا چاہتی ہے۔ والد صاحب چاہتے تھے کہ الزابیتھ اس سے ملنے نہ جائے۔ لیکن انہوں نے اسے مجبور نہ کیا۔

''میں اس سے ملنے جاؤں گی'' الزابیتھ نے کہا ''وکٹر! تم بھی چلو۔''

میں جانا نہ چاہتا تھا لیکن انکار نہ کر سکا۔

ہم قید خانے کی نیم تاریک گزرگاہ میں سے ہوتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں جسٹائن تھی۔ وہ بھوسی سے بھرے گدے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں آہنی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھی۔ آہنی بیڑیوں کی جھنکار سے وہ نیم تاریک کمرہ گونج اٹھا۔ محافظ ہمیں وہاں پر چھوڑ کے چلے گئے۔ تو جسٹائن الزابیتھ کے قدموں پر گر کے پھوٹ پڑی۔ موخرالذکر بھی رو رہی تھی۔

''آہ جسٹائن یہ تم نے کیا کر دیا؟'' الزابیتھ نے کہا ''مجھے تمہاری بے گناہی کا یقین تھا اور یہ یقین میری امید بندھائے ہوئے تھا۔ تم نے اقبال جرم کر کے میری آخری امید بھی توڑ دی۔''

''تو کیا...... تو کیا...... آپ بھی مجھے خونی سمجھتی ہیں۔''

''اٹھو جسٹائن! میرے قدموں پر ماتھا رگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

میں تمہیں آخر تک بے گناہ سمجھتی رہی۔ لیکن خود تم اقبال جرم کر چکی ہو۔''

''بے شک کر چکی ہوں۔ لیکن یہ غلط ہے...... میں جھوٹ بولی ہوں میں نے اقبال جرم کیا نہیں بلکہ مجھ سے کروایا گیا ہے۔ میں عدالت کے منکر نکیر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ آپ نہیں جانتیں کہ وہ شیطان مجھے کتنا پریشان کر رہے تھے اور کس طرح ڈرا دھمکا رہے تھے۔ وہ مجھے دنیا اور عاقبت کے عذابوں سے ڈرا رہے تھے اور مجھے یقین دلا رہے تھے کہ میں ہی خونی ہوں۔ ان کی یہ کوششیں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ میں اس سادہ لوح دیہاتی کی طرح، جس نے چار سازشی اچکوں کی باتوں میں آ کر بھیڑ کو بھیڑیا سمجھ لیا تھا، ان کی باتوں میں آ گئی۔ پھر پادری صاحب تشریف لائے اور انہوں نے کہا کہ اگر میں نے اقبال جرم نہ کیا تو میری جان سخت تکلیف سے نکلے گی اور پھر عاقبت کا عذاب تو کہیں گیا نہیں۔ ان لوگوں کی باتوں نے مجھے دہلا دیا۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو گئی۔ کوئی میری ڈھارس بندھانے والا نہ تھا۔ کوئی مجھے تسلی دینے والا نہ تھا۔ سبھی مجھے نفرت و حقارت سے دیکھتے تھے۔ سبھی مجھے برا بھلا کہہ رہے تھے، چنانچہ میں مجبور ہو گئی اور عدالت کے منکر نکیر سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لئے ایک جھوٹ گھڑا۔ لیکن یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جھوٹ مجھے اور بھی زیادہ کرب میں مبتلا کر دے گا۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال تھا الزابیتھ کہ تم اپنی جسٹائن کو غلط نہ سمجھو گی لیکن افسوس کہ تم بھی مجھے قاتلہ سمجھتی ہو۔ ہائے میں کہیں کی نہ رہی...... الزابیتھ ولیم کو کوئی شیطان

ہی مار سکتا ہے۔ کیسے یقین کر لیا تم نے کہ جسٹائن جو احسان فراموش نہیں ہے اور جو ولیم کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی تھی اس کا گلا گھونٹ سکتی ہے...... ولیم! میرے بچے! میں بہت جلد تجھ سے آ ملوں گی۔ اس دنیا میں اب میرا کوئی نہیں رہ گیا ہے۔ یہی ایک خیال کہ میں تیرے پاس آ رہی ہوں، میری ڈھارس بندھا رہا ہے اور یہی ایک خیال میری موت آسان کرے گا......تو جانتا ہے ولیم میں بے گناہ ہوں۔" اور وہ یوں سسک کر روئی کہ میں لرز گیا۔

"جسٹائن! میری پیاری! مجھے معاف کر دو...... جسٹائن! میں نے واقعی تمہیں غلط سمجھا تھا" الزابیتھ نے رو کر کہا "لیکن تم نے جھوٹا اقبال کیا ہی کیوں؟ لیکن گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔ تم نہ مرو گی۔ تمہیں ابھی مرنا نہیں ہے......"

جسٹائن نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں موت سے نہیں......ڈرتی......خدا مجھے آخر تک ثابت قدم رکھے اگر تم نے مجھے دعائے خیر سے یاد کیا تو مجھے میری بے گناہی کا صلہ مل جائے گا۔" اور میں اس تمام عرصے میں ایک کونے میں خاموش کھڑا رہا تھا کہ اپنا جرم جس کا اظہار میرے بشرے سے ہو رہا تھا، ان دونوں لڑکیوں سے چھپا سکوں اور پھر میں اس بے گناہ لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالنے کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ جو کل زندگی کی سرحد پار کر جائے گی اور یہ......سب میری وجہ سے ہو رہا تھا......ولیم کی جان میری وجہ سے گئی تھی اور اب جسٹائن......میں نے اپنے دانت بھینچ لئے لیکن میرے منہ سے آہ نکل ہی گئی۔ جسٹائن نے جو میری موجودگی سے بے خبر تھی، چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر مجھے پہچان کر میرے قریب آئی۔

"شکریہ! آپ مجھ بدنصیب سے ملنے آئے۔ کیا آپ بھی مجھے خونی سمجھتے ہیں؟"

میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

"نہیں جسٹائن!" میرے بجائے الزابیتھ نے جواب دیا۔ "انہیں تمہاری بے گناہی کا مجھ سے زیادہ یقین ہے۔ حتیٰ کہ تمہارا اقبال جرم بھی ان کے یقین کو نہ ڈگمگا سکا۔"

"شکریہ! میرے آقا! شکریہ۔ اب میں اطمینان اور سکون سے مروں گی اگر آپ لوگ مجھے خونی تصور کر لیتے تو میں کہیں کی نہ رہتی۔ دنیا کی مجھے پرواہ نہیں۔ اس کا جو جی چاہے سمجھا کرے۔ اب میں خاموشی سے جان دوں گی اور مسکرا کر اپنے ولیم سے ملوں گی۔"

اور ایسی بہت سی باتیں کہہ کے وہ ہماری اور خود اپنی ڈھارس بندھاتی رہی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ پرسکون تھی۔ لیکن میں، اصلی مجرم، بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ سکون اور اطمینان میرے لئے عنقا ہو چکا تھا۔ میں، ولیم کی موت کا باعث، زندہ تھا اور ایک بے گناہ کے لئے پھانسی تیار کی جا رہی تھی۔ مایوسی، خوف اور احساس گناہ میرے دل کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ میرے دل میں

ایک دوزخ سی روشن ہوگئی تھی جس کی تپش میرے جسم وجان کو بھونے ڈال رہی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ کرسکتا تھا۔ کسی کے سامنے اپنی اذیت کو ظاہر نہ کرسکتا تھا۔

''شاید تین گھنٹوں تک ہم جسٹائن کے پاس بیٹھے رہے۔ الزابیتھ بڑی کوششوں کے بعد رخصت ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرسکی۔ جسٹائن نے الزابیتھ کو گلے لگالیا اور مسکرائی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کے لئے اس بچاری کو کتنا جبر کرنا پڑا ہوگا۔

''خدا حافظ الزابیتھ...... میری بہن...... خدا تمہیں خوش اور شاد کام رکھے۔ خدا کرے کہ میرا غم آخری غم ہو...... اس کے بعد تمہیں کسی غم سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ الوداع! میری بہن۔''

اور پھر وہ منحوس گھڑی آن پہنچی...... جسٹائن کو پھانسی دے دی گئی۔

الزابیتھ کے آنسو اور اس کی التجائیں منصفوں کے دل نہ پگھلا سکیں وہ ایک ہی بات کہتے رہے...... ''ملزمہ اپنے جرم کا اقبال کرچکی ہے۔'' خود میں نے لاکھ لاکھ انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جسٹائن بے گناہ ہے۔ عاجز آکر میں اپنی کہانی سنانے ہی والا تھا لیکن ان کے چہروں پر نظر کی تو مجھے اپنا ارادہ بدل دینا پڑا۔ ان کے بشرے سے حد درجہ خشونت اور بیزاری عیاں تھی۔ وہ جسٹائن ہی کو قاتلہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ میری کہانی سن کر میرا مضحکہ اڑاتے اور مجھے پاگل تصور کرتے۔

اور یوں ایک بے گناہ لڑکی پھانسی پر لٹکا دی گئی اور اب میری گردن پر دو خون تھے۔ پہلا ولیم کا دوسرا جسٹائن کا۔

میری حالت پاگلوں کی سی ہوگئی اور دماغ سن ہوگیا۔ اور ولیم اور جسٹائن کی صورتیں کسی طرح میری نظر کے سامنے سے ہٹتی نہ تھیں۔ لیکن الزابیتھ کی حالت اتنی خراب ہورہی تھی کہ سب کچھ بھول کر اس طرف متوجہ ہوا اور ہر طرح اسے تسلی دینے اور اس کی دل جوئی کرنے لگا۔

دراصل الزابیتھ اور والد صاحب کو یہ غم میں نے دیئے تھے۔ میں نے ''اسے'' حیات بخشی تھی اور پھر اسے دنیا میں آزاد چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس گھر میں، جہاں مسرتوں کے پھول کھلتے تھے اب غم کی آندھیاں چل رہی تھیں، جس گھر میں قہقہے گونجتے تھے۔ وہاں سے اب آہ و بکا کی آوازیں بلند ہورہی تھیں اس گھر میں دو موتیں ہوچکی تھیں اور ابھی اور ہونے والی تھیں۔



نواں باب

جسٹائن مرچکی تھی۔

اور میں زندہ تھا۔خون میری رگوں میں بدستور گردش کر رہا تھا۔میرا دل بدستور دھڑک رہا تھا۔ میرے جسم میں جان بدستور موجود تھی۔لیکن احساس گناہ عذاب جان بنا ہوا تھا۔اور ایک ایسا راز میرے سینے میں بند تھا جو مجھے ہر دم مضطرب رکھتا تھا۔نیند جیسے مجھ سے روٹھ گئی تھی۔چنانچہ میں راتوں کو آوارہ روح کی طرح بھٹکا کرتا۔مجھے کسی پل سکون نہ ملتا تھا۔کسی طرح میرے دل کو قرار نہ آتا تھا۔دو جانیں میری وجہ سے جا چکی تھیں اور ابھی اور جانیں جانا باقی تھیں۔میرا ماضی ڈراؤنا تھا اور مستقبل ایک خوفناک ہوا بن چکا تھا۔میں مسرت کی لہریں محسوس کر کے نہ تو خود اعتمادی سے ماضی کے متعلق سوچ سکتا تھا اور نہ مستقبل کے متعلق۔ماضی کی تصویر جس سے میں واقف تھا، بھیانک تھی اور مستقبل کی تصویر ،جس سے میں ناواقف تھا ہیبت ناک تھی۔اپنے کئے کا پچھتاوا میری روح کو ایک نہ بجھنے والے جہنم میں جھونک چکا تھا۔میری روح پشیمانی اور احساس گناہ کے شکنجے پر کھنچی تڑپ رہی تھی اور مسلسل غمناک واقعات نے میرے دل و دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔چنانچہ میری حالت پاگلوں کی سی ہوگئی۔میں انسانوں اور ان کی نظروں سے ڈرنے لگا۔خوشی اور مسرت کی ہر آواز مجھے لرزا دیتی ...... ہر مسکراہٹ جسے میں دیکھتا تھا اور ہر قہقہہ جسے میں سنتا تھا، میرے سامنے ایک ہیبت ناک تصویر اور میرے دماغ میں ایک بھیانک خیال کو جنم دیتا ...... چنانچہ رفتہ رفتہ میں تنہائی پسند بن گیا۔میں لوگوں اور ان کی نظروں سے بچنے لگا۔تنہائی ......قبر کی سی تنہائی ......قبر کی سی تنہائی میں مجھے سکون مل سکتا تھا۔

والد صاحب نے درد وغم کی ایک اور ٹیس محسوس کر کے میری اس تبدیلی کو دیکھا۔میری زرد ہوتی ہوئی رنگت اور گھلتے ہوئے جسم کو دیکھا اور اس کا کچھ اور ہی مطلب لیتے ہوئے بولے۔

''وکٹر!تم سمجھتے ہو کہ مجھے ولیم کی موت کا غم نہیں ہے۔خدا کی قسم جتنی مجھے اس سے محبت تھی شاید کسی کو اپنے بیٹے سے رہی ہو...... (ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے)......''لیکن خدا کی مرضی پوری ہوئی۔ہمارے غم کرنے سے ولیم ہمیں واپس نہ مل جائے گا۔بے شک یہ سخت غم ہے جو ہمیں ملا ہے۔لیکن وکٹر!کسی کی موت سے دنیا کے کاروبار رک نہیں جاتے کسی کی ایک موت کے ساتھ خاندان کے دوسرے افراد کی زندگیاں ختم نہیں ہو جاتیں ...... چنانچہ بیٹے ولیم کے ساتھ ہماری زندگیاں نہ تو ختم ہوئی ہیں اور نہ ہی ہمیں انہیں ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔اگر تم اسی طرح

کھوئے کھوئے رہے تو خدانخواستہ پاگل ہو جاؤ گے۔ لیکن بیٹے! صرف غم کے ہو کر نہ رہ جاؤ اس دنیا میں تم پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں، انہیں فراموش نہ کر جاؤ، دنیا کے کاروبار چلتے رہتے ہیں اور تمہیں ان میں حصہ بٹانا ہے۔"

لیکن والد صاحب کی اس نصیحت کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں۔ اگر وہ منحوس راز میرے سینے میں دفن نہ ہوتا، اگر میں ولیم اور جسٹائن کے خونی سے واقف نہ ہوتا، اگر میرا ماضی بھیانک اور مستقبل تاریک نہ ہوتا تو میں پہلا وہ شخص ہوتا جو اپنا غم بھول کر اپنے والد صاحب اور الزابیتھ کو تسلی دیتا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ چنانچہ اب میری یہ کوشش تھی کہ اپنے آپ کو والد صاحب سے دور رکھوں۔

اسی زمانے میں ہم دوسرے مکان میں اٹھ آئے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ مکان بیلرائیوں میں تالاب کے کنارے تھا۔ چنانچہ وہاں مجھے آزادی ملی، جب ہم شہر میں موجود تھے تو شہر کے دروازے رات کو بند ہو جاتے تھے اور میں آبادی سے باہر کہیں جا نہ سکتا تھا۔ لیکن بیلرائیوں میں یہ بات نہ تھی۔ چنانچہ اکثر راتوں کو، جب گھر کے لوگ سو رہے ہوتے، میں گھر سے نکل پڑتا اور ایک کشتی میں بیٹھ کر اسے کھیتا ہوا تالاب کے بیچ لے جاتا اور پھر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ ہیبت ناک اور مایوس کن خیالات ہجوم کر آتے۔ آدھی رات کا وقت ہوتا چاروں طرف بھیانک اندھیرا اور سکوت ہوتا اور میں ایک کشتی میں کسی بھوت کی طرح سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا رہتا۔ اور اکثر میرا جی چاہتا کہ تالاب میں پھاند کر اس کی سرد تہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاؤں۔ لیکن الزابیتھ اور اس کے غم کا خیال مجھے ایسا کرنے سے باز رکھتا...... اور پھر مجھے ایک اور خیال آتا...... "اگر میں مر گیا تو الزابیتھ، والد صاحب اور آرنسٹ "اس" کے رحم و کرم پر ہوں گے جس کے وجود سے وہ لوگ واقف نہیں۔"

چنانچہ میں خودکشی کر کے اپنے دکھوں سے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں میں رو پڑتا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ اس کے باوجود کہ میری زندگی میرے لئے ایک عذاب بن گئی تھی۔ میں اس کا خاتمہ نہ کر سکتا تھا۔ سکون اور مسرتیں میرے لئے ایک بھولا ہوا افسانہ ہو کر رہ گئی تھیں اور میں دنیا کا سب سے زیادہ بدنصیب انسان بن چکا تھا۔

میں نے خود اپنی اور اپنے عزیزوں کی تباہی کا سامان پیدا کیا تھا۔ ہر لمحہ، جو گزرتا تھا، میرے لئے خوف میں اضافہ کر جاتا تھا۔ کیونکہ "وہ" زندہ اور آزاد تھا۔ چنانچہ خوف تھا کہ مبادا "وہ" پھر کوئی شیطنت کرے۔ پھر اپنے کسی ظالمانہ کام سے ہمارے غم دوبالا کر دے۔

میرا یہ احساس شدت اختیار کرتا جا رہا تھا کہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، ولیم اور جسٹائن کی موت کافی نہیں ہے...... "وہ" پھر کوئی جرم کرے گا اور "اس" کا یہ جرم پچھلے جرائم سے زیادہ بھیانک

ہو گا۔ جب تک میرے عزیز زندہ ہیں یا ''وہ'' زندہ ہے میں راتوں کو سو نہ سکوں گا۔ مجھے ''اس'' سے نفرت تھی۔ سخت نفرت۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا وہ مافوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور آزاد تھا۔ اور جب میں ''اس'' کے متعلق سوچتا، غصہ سے دانت پیسنے لگتا۔ میری آنکھیں جلنے لگتیں اور دماغ سنسنانے لگتا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ میں ''اس'' کے ٹکڑے اڑا دوں...... میں اس شیطنت اور جرائم کے متعلق سوچتا اور میرا غصہ ساری اخلاقی حدود توڑ دیتا...... میں ''اس'' سے انتقام لینے کے لئے بے تاب ہو جاتا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت اس کی تلاش میں نکل پڑوں اور پھر اس سے ایسا انتقام لوں کہ عذاب کے فرشتے تک کانپ اٹھیں، لیکن ''وہ'' کہاں تھا؟...... خدا جانے کہاں تھا۔ اینجلو اسٹیڈ سے جنیوا آتے ہوئے ایک طوفانی رات میں، میں نے اسے صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ جب وہ پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد ''وہ'' نہ تو مجھے نظر آیا تھا اور نہ کسی اور کو۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر پناہ گزیں ہے تو میں وہاں بھی پہنچ جاؤں گا۔

حالیہ واقعات نے والد صاحب کی صحت پر اثر کیا۔ ان کی صحت دن بدن گرنے لگی۔ ادھر الزابیتھ مغموم، اداس اور چپ تھی۔ اب الزابیتھ پہلی سی نہ رہی تھی۔ پہلے وہ بات بات میں قہقہے لگایا کرتی تھی، ہر دم مسکراتی رہتی تھی اور تالاب کے کنارے گھاس پر بیٹھ کر گھنٹوں ہمارے مستقبل کے متعلق باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اب اس کی نظروں میں دنیا تاریک تھی اور مایوسیاں اور غم اس کے دل میں نوحہ گر تھے۔

''وکٹر!'' الزابیتھ نے کہا ''جب میں جسٹائن کی بے گناہی اور اس کی بے بسی کی موت کا تصور کرتی ہوں تو دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو جاتی ہے۔ ناانصافی اور مظالم کے متعلق میں نے کتابوں میں پڑھا تھا لیکن اب آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ انسان مجھے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے ہیں لیکن شاید میرا خیال غلط ہو۔ ہر شخص جسٹائن ہی کو خونی سمجھتا ہے۔ اگر وہ واقعی خونی ہے تو پھر میں سمجھتی ہوں کہ یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں رہ کر ہم خود اپنی ذات پر بھی اعتبار نہیں کر سکتے...... لیکن وکٹر! مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ جسٹائن ایسا ظالمانہ کام کر سکتی ہے۔ اس کو ولیم سے بہت زیادہ محبت تھی...... اف! میرے خدا! خونی کوئی اور ہے اور جسٹائن بے چاری بے گناہ ماری گئی...... خونی فرار ہو گیا...... اور آزاد گھوم رہا ہے...... میرے خدا کون ہو گا وہ...... کون ہو گا؟''

اور میں نے اپنے دل میں ٹیس محسوس کر کے الزابیتھ کی باتیں سنیں۔ ایک طرح سے میں ہی خونی تھا۔ غالباً میرے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کیونکہ الزابیتھ نے فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے نرم لہجے میں بولی۔

''وکٹر! میرے دل کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری حالت

بہت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ تمہاری آنکھوں میں بعض اوقات ایسی مجنونانہ چمک آ جاتی ہے کہ میں اسے دیکھ کے کانپ جاتی ہوں۔ وکٹر! خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو۔ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے وکٹر! دیکھو میری طرف دیکھو...... کیا تمہیں میری حالت پر رحم نہیں آتا خدا کے لئے ہنسو بولو...... کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہنس بول سکیں۔ زندگی میں دکھ سکھ تو لگے ہی ہوئے ہیں۔ یوں اپنے آپ کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ یہ زمانہ بھی گزر جائے گا۔ سب دن یکساں نہیں ہوتے۔ نہ کوئی دن اداس ہوتا ہے نہ کوئی دن مسرت بخش۔ ہم اپنے باطنی جذبات سے اسے جیسا چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں۔ ابھی ہمارے سامنے کافی لمبی زندگی پڑی ہے۔ ہمارا حال غمناک ہے تو مستقبل یقیناً بے حد خوشگوار ہو گا۔''

لیکن الزابیتھ کی ان باتوں نے مجھ پر الٹا اثر کیا۔ بجائے اس کے کہ میری ڈھارس بندھتی میں خوف سے چیخ کر اس سے لپٹ گیا۔ خدا جانے کیوں مجھے محسوس ہو جیسے ''وہ'' الزابیتھ کو مجھ سے چھینے لے رہا ہے۔

الزابیتھ حیران رہ گئی۔

الزابیتھ کا پیارا چہرہ، اس کی باتیں اور اس کی محبت مجھے اپنے خوف سے نجات نہ دلا سکی...... اپنے جرم کا احساس دن بدن شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور یہ خیال مجھے ہر وقت بے چین و بے قرار رکھتا تھا کہ میرے گھر پر یہ آفت میری وجہ سے ٹوٹی ہے۔ والد صاحب میرے کرتوتوں کی وجہ سے بیمار ہیں اور الزابیتھ اداس۔ میرے دل کو اداسی و مایوسی کا گاڑھا اندھیرا بادل سا بنا ہوا اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا اور مسرت و امید کی ایک کرن بھی اس بادل کو نہ چیر سکتی تھی۔ میری حالت اس ہرن کی سی ہو رہی تھی جس کے کسی حصہ، جسم میں شکاری کا تیر پیوست ہو اور وہ شکاری سے بچنے کے لئے جھاڑی کی طرف جا رہا ہو لیکن وہاں اور بھی زیادہ بھیانک موت گھات لگائے بیٹھی ہو۔

میں شدید روحانی کرب میں مبتلا تھا۔ چنانچہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں گھر سے نکل پڑتا اور جنگلوں یا پہاڑوں میں بھٹکا کرتا۔ ایک دن اسی طرح شدید بے تابی کے عالم میں، میں گھر سے نکلا اور کوہ الپس کی، وادیوں کی طرف چلا کہ شاید وہاں مجھے کچھ سکون میسر آئے یا شاید وہاں کے قدرتی مناظر میرا دھیان ہٹا سکیں...... اور یوں آوارہ گردی کرتے ہوئے میرے قدم خود بخود شاموکس کی طرف اٹھ گئے۔ انجلو اسٹیڈ جانے سے کچھ دن پہلے میں اس طرف آخری دفعہ گیا تھا۔ اور اسے چھ سال گزر چکے تھے۔

میں نے اپنے اس سفر کا پہلا حصہ گھوڑے پر سوار ہو کر طے کیا اور پھر دوسری منزل سے ایک خچر کرائے پر لیا کہ وہ ڈھلوانوں پر گھوڑے کی بہ نسبت آسانی سے چڑھ سکتا ہے۔ موسم خوشگوار تھا۔ ماہ

اگست نصف کے قریب گزر چکا تھا اور جسٹائن کی موت کو دو مہینے گزر چکے تھے۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا بے چینی کم ہوتی جا رہی تھی، میرا خچر نہایت اطمینان سے ڈھلانیں چڑھ اور اتر رہا تھا۔ کبھی تو میں کسی ڈھلان کی چوٹی پر کھڑا اپنے قدموں میں بچھی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا ہوتا اور کبھی گہرے گہرے نیم تاریک دروں میں سے اور کبھی پتلی سی پر پیچ پگڈنڈی سے گزر رہا ہوتا۔ چاروں طرف خاموشی اور سکون تھا اور سامنے الپس کی برف پوش چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں شاموکس گاؤں میں پہنچا تو ایک سرائے میں رات گزارنے کے لئے ٹھہر گیا۔ دماغی اور جسمانی تھکن سے میں نڈھال ہو رہا تھا۔ لیکن سورج غروب ہونے کا پس منظر اتنا مسحور کن تھا کہ میں کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ سورج کا بڑا سا نارنجی گولا نصف کے قریب چھپ گیا تھا اور مونٹ بلانک کی برف پوش چوٹیوں پر آگ سی لگی ہوئی تھی...... سورج تیزی سے غروب ہو گیا مونٹ بلانک کی چوٹیوں پر کی برف سمندری جھاگ کی طرح سفید معلوم ہونے لگی اور اس کے برعکس سے ایک عجیب سی روشنی نیچے وادی میں پھیل گئی۔ جو تھوڑی دیر تک قائم رہی۔ دریائے آروے کا شور سنائی دیا...... جو قریب ہی پہاڑیوں پر سے اتر کر وادی میں آ گیا ہے۔ اور دریا کے اسی شور نے گویا مجھے لوریاں دیں اور میں تکئے پر سر رکھتے ہی بے خبر سو گیا۔



دسواں باب

میرا دوسرا دن بھی آوارہ گردی کرتے گزرا۔
اچانک میں نے اپنے آپ کو ایک گھاٹی میں کھڑا پایا۔ وہاں سے چٹانوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ چٹانیں بتدریج بلند ہوتی ہوئی آخر کار اتنی بلند ہوگئی تھیں کہ ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میرے دونوں طرف بے حد بلند مضبوط چٹانی دیواریں تھیں اور اوپر برف پوش چوٹیاں۔ وہاں کسی معبد کا سا سکوت طاری تھا۔ کبھی کوئی برف کی سل گھڑگھڑا کر اوپر سے پھسلتی تو تھوڑی دیر کے لئے یہ سکوت درہم برہم ہو جاتا۔ بہرحال وہاں سکون تھا جو میرے جذبۂ خوف میں تخفیف کر رہا تھا اور میرے وہ خیالات، جنہوں نے پچھلے دو مہینوں سے مجھے پریشان کر رکھا تھا، رفتہ رفتہ غائب ہوتے جا رہے تھے۔
دو چار قدم آگے پہاڑیوں پر سے ایک ٹھنڈا چشمہ نیچے گر رہا تھا اور اس کے ہلکے سے شور میں ربانی کی سی تاثیر تھی، میں مسحور ہوا جا رہا تھا برف پوش چوٹیوں پر بکھری سورج کی کرنوں کا عکس گھاٹی تک پہنچ رہا تھا اور وہاں جہاں میں کھڑا تھا، کچھ عجیب سی مقدس روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکے، جو برف پوش چوٹیوں پر سے گزر کر آ رہے تھے اور جو ٹھنڈے تھے، مجھے روحانی سکون اور فرحت بخش رہے تھے۔
میں سارا دن ان خاموش گھاٹیوں میں بھٹکتا رہا اور شام ہونے سے کچھ پہلے سرائے میں آ گیا۔ دو مہینوں کے بعد اس دن پہلی دفعہ میں نے رغبت سے کھانا کھایا اور پھر بستر پر لیٹا تو فوراً سو گیا اور اس رات مجھے بھیانک خواب نظر نہ آئے۔
لیکن صبح بیدار ہوا تو دل میں پھر وہی مایوسی اور خوف جاگزیں تھا...... آسمان نے گویا اپنی ساری کھڑکیاں کھول دی تھیں اور موسلا دھار بارش میرے لئے اداسی کا تحفہ لے کر آئی تھی۔ لیکن اب میری قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اب میں اس خوف اور اداسی کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں پھر ان پرسکون گھاٹیوں میں جانا چاہتا تھا جہاں مجھے سکون ملتا تھا...... بارش مجھے روک نہ سکتی تھی......
چنانچہ میرا خچر لایا گیا اور میں کوہ ورٹ کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ جانے کا ارادہ کر کے چل پڑا۔ میں پہلے بھی اس چوٹی پر گیا تھا۔ اس لئے راستے سے واقف تھا...... اس کے علاوہ میں تنہائی چاہتا تھا اس لئے میں نے کوئی راہبر اپنے ساتھ نہ لیا۔

چڑھاؤ عمودی اور خطرناک تھا۔ پگڈنڈی چکر کھاتی ہوئی اوپر پہنچی تھی اور اس کے دونوں طرف گہرے گہرے کھڈ اور برساتی نالے تھے۔ خچر کی ٹھوکر سے کبھی کوئی پتھر کھڈ میں لڑھک جاتا تو دیر تک اس کا دھماکہ گونجتا رہتا موسم سرما میں اس راستے سے اوپر جانا گویا خود اپنی موت کو دعوت دینا تھا کیونکہ ہر گھڑی برف کی زبردست سلیں اوپر سے نیچے کی طرف پھسلا کرتی ہیں اور ہر اس چیز کو، جوان کی راہ میں حائل ہو، کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ اور پھر ان سلوں کے ساتھ نہایت پر شور آواز سے بڑے بڑے پتھروں کا سیل بھی رواں رہتا ہے جس کے نیچے قافلے کے قافلے دب جائیں اور ان کا پتہ بھی نہ چلے۔ چنانچہ اس ''سیل برف'' کے آثار وہاں موجود تھے۔ درخت ٹوٹے پڑے تھے اور پگڈنڈی پر پڑے ہوئے سنگریزے اور پتھروں کا سرمہ موسم سرما کے تباہ کن طوفان کا پتہ دے رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر پگڈنڈی برف کی بلند دیواروں کے بیچ میں سے گزر رہی تھی ایک جگہ یہ دیواریں بے حد خطرناک تھیں اور وہاں کی فضا میں اگر ذرا سا ارتعاش ہو، وہاں اگر کوئی ذرا اونچی آواز میں کچھ کہے تو دونوں طرف کی دیواریں ڈھے جائیں...... چنانچہ وہاں پہنچ کر میں خچر پر سے اتر پڑا اور اسے آہستہ آہستہ لے چلا اور منٹوں کا راستہ گھنٹوں میں طے کرنے کے بعد میں برف کی ان پرخطر دیواروں کے دوسری طرف تھا اور وہاں پہنچ کر میں نے نیچے نظر کی۔ نیچے..... بہت نیچے، ندی پر دھند منڈلا رہی تھی۔

دوپہر ہو رہی تھی جب میں چوٹی پر پہنچا اور ایک بلند پتھر پر بیٹھ گیا تو میرے قدموں کے عین نیچے برف کا سفید اور ٹھوس سمندر سا تھا اور اس سمندر پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا بادلوں کو اپنے ساتھ اڑا لے گیا۔ اور میں تھوڑی کوشش کے بعد بچھی ہوئی برف پر اتر آیا جس کی سطح طوفانی سمندر کی طرح ناہموار تھی۔ برف کے اس میدان میں قدم قدم پر بلندیاں تھیں اور پستیاں جیسے برف کے اس سمندر میں کوہ پیکر موجیں، اٹھ رہی ہوں۔

برف کا یہ میدان ایک فرسخ سے زیادہ وسیع نہ ہوگا لیکن اسے عبور کرنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ سامنے کا پہاڑ، جو برف کے اس میدان کے کنارہ پر تھا، عمودی اور ننگا تھا، یعنی اس پر برف نہ تھی۔ پھر میرے سامنے کوہ ورٹ سر بلند کئے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں مونٹ بلانک بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ میں مسحور کھڑا ان عظیم بلندیوں کو دیکھتا رہا۔ ایسی ہی عظیم، اور مقدس بلندیاں دیوتاؤں کا مسکن بنی رہتی ہوں گی۔ ایسی بلندیوں پر بیٹھ کے وہ حقیر انسانوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہوں گے اور ایسی ہی بلندیوں پر مقدس روحیں رہتی ہوں گی...... ان خیالات نے مجھے بے قابو کر دیا اور میں نے اپنے دل میں مسرت کی لہریں اٹھتے ہوئے محسوس کیں اور بے تاب ہو کر اونچی آواز میں کہا۔

''دیوتاؤ! اور مقدس روحو! یا تو میرے لئے مسرت کی ان لہروں کو غیر فانی کر دو یا مجھے اپنے پاس

بلا کے دنیا اور اس کی مسرتوں سے بے نیاز کر دو۔"

اور ابھی میرے الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ میں چونک پڑا۔ کہیں سے کوئی آدمی نکل کے حیرت انگیز تیزی سے، جسے غیر انسانی کہہ سکیں، میری طرف آتا نظر آیا۔ ابھی وہ مجھ سے کافی دور تھا اور برف کے اس مواج میدان کو بڑی احتیاط سے عبور کر رہا تھا جسے عبور کر کے میں مونٹ بلانک کے سامنے پہنچا تھا کبھی تو وہ کسی تودے کے پیچھے جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور کبھی ان کا چکر کاٹ کر میری طرف بڑھتا نظر آتا۔

وہ ذرا قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ عام انسانوں سے زیادہ طویل قامت تھا اور اس کے اعضاء بھی بڑے بڑے تھے۔ مجھ پر دہشت سی طاری ہونے لگی اور آنکھوں کے سامنے دھواں سا چھانے لگا۔ اگر ہوا کے جھونکوں میں نمی اور ٹھنڈک نہ ہوتی تو شاید میں بیہوش ہو گیا ہوتا۔ میں دم بخود کھڑا اسے آتے دیکھتا رہا۔

اور دفعتہً میں نے اسے پہچان لیا۔

"وہ" وہی تھا۔ ولیم کا قاتل۔ وہی، جسے میں نے بنایا تھا۔ جسے میں نے حیات بخشی تھی۔ غصہ اور نفرت سے میرا خون کھولنے لگا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسی وقت "اس" کا خاتمہ کر دوں گا یا خود اپنی جان دے دوں گا وہ میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں منتظر تھا۔

لحہ بہ لحہ وہ قریب آتا جا رہا تھا۔ دیو قامت، ہیبت ناک اور دہشت انگیز، مجھے شک سا ہوا کہ اس کے غیر انسانی چہرے سے نفرت غصہ اور کینے کے جذبات ہویدا تھے، لیکن اس وقت میں غصہ و نفرت سے ایسا دیوانہ ہو رہا تھا کہ میں نے اس کے چہرے سے ہویدا جذبات کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔

وہ بہت قریب آ گیا۔

چند ثانیوں تک میں بت بنا کھڑا رہا۔ میری مٹھیاں بند تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ آخر کار میں نے ایک جھرجھری سی لی اور میرے منہ سے تیز و تلخ الفاظ کا سیلاب سا پھوٹ نکلا۔

"شیطان! خونی!" میں چیخا "تو نے میرے سامنے آنے کی جرأت کیونکر کی؟ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تجھ سے انتقام نہ لوں گا؟ چلا جا یہاں سے ...... لیکن نہیں ...... ٹھہر جا تا کہ میں تجھ سے وہ حیات چھین لوں جو خود میں نے تجھے عطا کی ہے۔ میں تجھ سے ان معصوموں کا انتقام لوں گا۔ سخت انتقام...... جن کی جان تو نے لی ہے۔"

"میں جانتا تھا کہ میرا استقبال اسی طرح کیا جائے گا" اس نے عجیب سی کھردری اور غیر قدرتی آواز میں کہا "ساری دنیا مجھ سے نفرت کرتی ہے حتیٰ کہ میرا خالق بھی۔ اے میرے بنانے والے! میں جو کچھ بھی ہوں، خونی اور شیطان تمہاری وجہ سے ہوں۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم میرے خالق ہو۔

چنانچہ مجھے حیات بخشنے کے بعد تم پر چند فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن سے اب تک تم چشم پوشی کرتے آئے ہو۔ میں یہ نہیں جانتا کہ تم نے ایسا قصداً کیا ہے یا بلا قصد۔ بہر حال تم اپنا وہ فرض پورا کرو جو مجھے زندگی عطا کرنے کے بعد تم نے اپنے اوپر عائد کرلیا ہے اور پھر تمہارا یہ بندہ اپنا فرض پورا کرے گا۔ اگر تم نے میری درخواست قبول کرلی، اگر میرا مطالبہ مان لیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اور انہیں، جنہیں تم عزیز رکھتے ہو، انہیں پریشان نہ کروں گا۔ لیکن اگر تم نے میرا مطالبہ نہ مانا تو یاد رکھو میں موت کی بھوک تمہارے عزیزوں سے مٹاؤں گا۔ میں بہت کچھ کرچکا ہوں اور بہت زیادہ کرسکتا ہوں اور ابھی میں نے کیا ہی کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں کیا...... میں تمہیں دھمکا نہیں رہا ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ چنانچہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرے خالق ہو، لیکن تمہیں مجھ سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔"

"خونی! خبیث! دوزخی!" میں نے دانت پیس کر کہا۔

اور غصہ سے ایسا بے قابو ہوا کہ یہ سوچے بغیر کہ کیا کررہا ہوں "اس" پر جھپٹ پڑا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے ایک معمولی سے اشارے سے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔

"ٹھہرو" اس نے کہا "کسی بھی معاملے میں جلد بازی اچھی نہیں ہوتی، پہلے میری کہانی سن لو اور یہ بھی جان لو کہ میری زندگی میرے لئے ایک عذاب ہی کیوں نہ ہو پھر بھی مجھے عزیز ہے۔ چنانچہ میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا خواہ اس کے لئے مجھے اپنے خالق کی گردن ہی کیوں نہ مروڑ ڈالنی پڑے...... یاد رکھو میرے خالق کہ تم نے مجھے ہر انسان سے زیادہ قوی بنایا ہے۔ چنانچہ میں تم سے بھی زیادہ قوی ہوں۔ میرا قد تمہارے قد سے اور میرے اعضاء تمہارے اعضاء سے بڑے اور طاقت ور ہیں۔ میں چاہوں تو درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں اور تم جیسے آدمیوں کو چیونٹی کی طرح مسل دوں لیکن نہیں۔ میں تم سے بغاوت نہ کروں گا۔ تم جیسے بھی ہو میرے خالق ہو اور میں تمہارا بندہ۔ چنانچہ میں تمہاری ہر زیادتی خاموشی سے برداشت کرنے کی کوشش کروں گا...... فرنکسٹائن! تم میرے خالق ہو چنانچہ مجھے تمہارا آدم ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے برخلاف تم نے مجھے اس فرشتے جیسا بنادیا ہے جو راندۂ درگاہ ہے...... تم نے اپنے آدم کو جنت بخشنے کے بجائے جہنم دی۔ تم نے اپنے آدم کو خوشیاں اور مسرتیں عطا کرنے کے بجائے اداسیاں و گناہ دیئے۔ دنیا میں، میں ہر چہار طرف مسرتیں دیکھ رہا ہوں لیکن ان میں میرا حصہ نہیں۔ میں ان سے محروم کردیا گیا ہوں۔ میں اچھا تھا۔ مخلص اور محبت کرنے والا اور رحمدل تھا۔ لیکن انسان کی ناانصافیوں، خودغرضی اور پھر میری مایوسی نے مجھے برا اور شیطان بنادیا۔ میرے خالق! مجھے وہ مسرتیں دے دو جن سے میں محروم ہوں اور پھر دیکھو میں مخلص اور رحمدل بن جاؤں گا۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ میں تیرا خالق سہی لیکن تیرا دشمن بھی ہوں تیری بہتری اسی میں ہے کہ

چلا جا یہاں سے اور اگر تو مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا ہی چاہتا ہے تو یوں ہی سہی۔ میں بھی تو دیکھوں کتنی طاقت ہے تجھ میں؟''

''حیران ہوں کہ کس طرح تمہیں سمجھاؤں...... یقین کرو فرنکسٹائن میں اتنا برا نہ تھا۔ میری روح، بشرطیکہ وہ ہو، ہمدردی اور انسانیت کے جذبات سے خالی نہ تھی لیکن میرے خالق! تم اپنے خالق کی قسم کھا کر کہو کہ کیا میں اس بھری دنیا میں اکیلا نہیں ہوں؟ کیا کوئی ایسا ہے جو مجھ سے محبت نہ سہی محض ہمدردی کر سکے؟ تعجب تو یہ ہے کہ خود میرے خالق کو مجھ سے نفرت ہے پھر میں دوسروں سے کیا امید رکھوں؟ انسان مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے میں راندۂ درگاہ ہوں ٹھکرایا ہوا ہوں اور دیکھو پہاڑوں کے سرد غار اور ان برف پوش چوٹیوں میں جہاں انسان کی گزر ممکن نہیں، میری پناہ گاہیں ہیں۔ کئی دنوں سے میں یہاں بھٹک رہا ہوں۔ دن کو اداس بیٹھا رہتا ہوں اور رات کو سرد غاروں میں سو رہتا ہوں۔ میں بادلوں اور نیلے آسمان کو پیار اور محبت سے دیکھتا ہوں کیونکہ یہ انسانوں کی طرح ظالم نہیں ہیں۔ دن کو سورج اور رات کو چاند اور تارے مجھے دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھ سے نفرت نہیں کرتے۔ مجھے ستاتے نہیں، اس کے برخلاف اگر انسان کو میرے وجود کا علم ہو جائے تو وہ ٹکڑے اڑا دیں۔ چنانچہ تم ہی بتاؤ کیا میں ان سے نفرت نہ کروں جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں......؟ میں غمگین ہوں، دکھی اور اداس ہوں چنانچہ دوسروں کو مسرور نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے غم بخشنے کے بعد انسانوں کو ہنسنے اور خوش ہونے کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ میں انسانوں کو غم دوں گا۔ ان کے دلوں کو ٹھیس پہنچاؤں گا۔ ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نوچ لوں گا۔ ان کے قہقہوں کو ان کے گلے میں گھونٹ دوں گا۔ وہ نہیں ہنس سکتے۔ نہیں ہنس سکتے۔ لیکن فرنکسٹائن! اگر تم چاہو تو ہزاروں انسانوں کی زندگیاں عموماً اور اپنے عزیزوں کی خصوصاً بچا سکتے ہو۔ میرے غصے، انتقام اور نفرت کی آگ کو تم، صرف تم بجھا سکتے ہو۔ جلد بازی نہ کرو فرنکسٹائن! پہلے میری کہانی سنو۔ ٹھنڈے دل سے سنو اور اس کے بعد جیسا چاہو فیصلہ کرو...... تمہاری دنیا کا قانون خونی کو بھی اپنے بچاؤ کا موقع دیتا ہے۔ فرنکسٹائن! تم مجھے خونی کہتے ہو اور مجھے اقرار ہے کہ میں خونی ہوں۔ لیکن میری طرف دیکھو...... دیکھو میں تمہاری شب و روز کی ان تھک محنتوں کا نتیجہ ہوں...... کیا تم اپنی محنتوں کے اس ثمر کو تباہ کر دو گے؟ کیا تم کر سکو گے؟ شاید نہیں۔ ہر شخص کو اپنی بنائی ہوئی چیز خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، عزیز ہوتی ہے...... لیکن نہیں۔ میں تم سے اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں، اپنے کیے کی معافی نہیں طلب کر رہا ہوں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کوئی احمقانہ فیصلہ کرنے سے پہلے میری کہانی سن لو۔''

''لعنت ہے اس دن پر جس دن تو نے اس دنیا میں پہلا سانس لیا۔ لعنت ہے ان ہاتھوں پر جنہوں نے تجھے بنایا۔ مجھے تجھ سے نفرت ہے۔ سخت نفرت...... دور ہو جا میری نظروں کے سامنے

سے۔ میں تیری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"تو میں کب کہتا ہوں دیکھو میری صورت" اس نے کہا اور اپنے بڑے بڑے گھناؤنے ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیئے۔ میں غصے اور نفرت سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

"چاہے نہ دیکھو میری صورت۔ لیکن تمہیں بہر حال میری کہانی سننا پڑے گی۔" اس نے کہا" مجھے یقین ہے کہ میری طویل کہانی میں تمہیں اپنی دلچسپی کا سامان بھی مل جائے گا۔ آؤ، میرے خالق! میرے ساتھ ساتھ میرے جھونپڑے میں آؤ۔ وہاں میں اپنی کہانی تمہیں سناؤں گا۔ کیونکہ یہاں تو تمہارے اعضاء اکڑ جائیں گے۔ سورج ابھی خاصہ بلند ہے۔ اس کے غروب ہونے تک میں اپنی کہانی ختم کر چکا ہوں گا۔ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے میرے خالق کہ میں انسانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کے اپنی ایک الگ دنیا بنا لوں یا تباہی و بربادی کا دیوتا بن کر دنیا میں گھومتا رہوں اور سب سے پہلے تم پر اور تمہارے گھر والوں پر میرا قہر نازل ہو۔"

اور "وہ" میرے جواب کا انتظار کیے بغیر برف کا میدان عبور کرنے لگا۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا اور اس وقت میں ان باتوں پر غور کر رہا تھا جو "اس" نے کہی تھیں...... آخر کار میں نے اس کی کہانی سننے کا فیصلہ کر لیا۔ اوّل اس لئے کہ اس کی باتوں نے میرے دل میں شوق تجسس پیدا کر دیا تھا میں "اسے" ہی ولیم کا قاتل سمجھتا تھا اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے اور دوئم اس لئے کہ اس کی باتوں سے پہلی دفعہ مجھے "خالق" کے فرائض کا احساس ہوا تھا اور ان فرائض کا تقاضہ تھا کہ میں اپنے "بندے" کو سزا دینے سے پہلے اس کا بیان سن لوں اور اگر ممکن ہو تو اسے معاف کر کے اس کا مطالبہ مان لوں، بشرطیکہ وہ قابلِ قبول ہو۔

ہم برف کا میدان عبور کرنے کے بعد سامنے والی چٹان پر چڑھنے لگے بارش پھر ہونے لگی تھی اور ہوا کے جھونکوں میں استرے کی سی کاٹ تھی۔

جب میں اس کے پیچھے اس کی جھونپڑی میں داخل ہوا تو اس دیو کے مکروہ ہونٹوں پر کامیاب مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور میں خیالات کے بھنور میں غوطے کھا رہا تھا۔ میں اس الاؤ کے قریب بیٹھ گیا جو میرے بھیانک "بندے" نے روشن کیا تھا...... میں اس کی کہانی سننے کے لئے تیار تھا۔

"اس" نے کھردری اور غیر قدرتی آواز میں کہانی سنانی شروع کی۔



دوسرا حصہ

فرنکسٹائن کی کہانی

اُس کی زبانی

گیارھواں باب

کافی غور و خوض اور کئی دفعہ الجھنے کے بعد میں اپنی پیدائش کا زمانہ اور اپنی اصلیت سمجھ سکا۔ اس دور کے سارے واقعات آپس میں گڈمڈ تھے اور میرے دماغ پر دھندسی چھائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں کوئی بات ٹھیک طور سے سوچ نہ سکتا تھا۔ اور نہ ہی کوئی یاد واضح تھی۔ ابتدا میں مختلف احساسات نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ میں بیک وقت دیکھ اور سن سکتا تھا، سونگھ سکتا تھا، اور کسی چیز کو چھو کر محسوس کر سکتا تھا۔ بہت دنوں بعد میں قوت باصرہ اور سامعہ اور قوت شامہ اور لامسہ میں تمیز کر سکا۔ آہستہ آہستہ میری حسیّں بیدار ہونے پر مجھے احساس ہوا کہ تیز روشنی میری آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔ چنانچہ میں نے آنکھیں کھولیں تو اُجالے کو پہچانا اور اس طرح اندھیرے اور اجالے میں تمیز کر سکا۔ چنانچہ اس طرح میں تمہارے گھر سے نکلا اور غالباً کوئی ڈھلان اترا اور پھر پہلی دفعہ میرے احساسات میں تغیر ہوا۔ پہلے اندھیرا روشنی اور ایسی دوسری غیر ذی روح چیزیں میرے سامنے تھیں جو میرے وجود سے متاثر نہ ہوتی تھیں۔ لیکن تمہارے گھر سے نکلنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں اور یہ کہ بہت سی چیزیں مجھے اور میں ان کو متاثر کر سکتا ہوں۔ روشنی اور گرمی میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئیں اور روشنی اور گرمی میرے اعصاب پر سوار ہونے لگے۔ چنانچہ مجھے سایہ دار جگہ کی تلاش ہوئی۔ اور ایسی جگہ وہ جنگل تھا جو انجلو اسٹیڈ سے زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ اس جنگل میں ایک چشمے کے کنارے میں اس وقت تک پڑا رہا جب تک کہ بھوک اور پیاس کی شدت نے مجھے بے تاب نہ کر دیا۔

چنانچہ میں نے شاہ دانے، جو گھاس پر پڑے تھے اور درخت پر لٹک رہے تھے کھائے اور چشمے کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی اور اس طرح میں بھوک اور پیاس سے واقف ہوا اور میں نے یہ جانا کہ بھوک اور پیاس کس طرح مٹائی جاتی ہے۔

پھر میں وہیں سو گیا۔

جب بیدار ہوا تو اندھیرا تھا۔ میں نے سردی محسوس کی اور خوف کا احساس میرے لئے نیا تھا اور یوں میں خوف کے جذبے سے واقف ہوا۔ تمہارے گھر سے نکلتے وقت بھی میں نے سردی محسوس کی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو چند کپڑوں میں لپیٹ لیا تھا۔ لیکن اس جنگل میں وہ کپڑے ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔ میں اکیلا تھا لیکن اس وقت میں نہ جانتا تھا کہ اکیلا پن کیا ہوتا ہے۔ سخت سردی

اور اپنے اعضاء میں درد کے باعث میں سو نہ سکا۔ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

پھر آسمان پر اجالا پھیلنے لگا اور میں نے مسرت کی لہریں محسوس کیں اور میں ایک نئی سنسنی سے واقف ہوا اور میں نے دیکھا کہ ایک چمکتا ہوا گولا درختوں کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ میں حیرت اور خوشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ابھی وہ بہت زیادہ بلند نہ ہوا تھا تاہم اس نے جنگل کو روشن کر دیا تھا۔ مجھے بھوک معلوم ہوئی اور میں اپنی غذا کی تلاش میں چل پڑا۔ سردی ناقابل برداشت تھی۔ اتفاقاً ایک درخت کے نیچے سے مجھے ایک پرانا چغہ پڑا ہوا مل گیا۔ غالباً کوئی مسافر اسے وہاں بھول گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس چغے میں لپیٹ لیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ میرا کوئی خیال اور کوئی احساس واضح نہ تھا۔ میں اندھیرا اور اجالا دیکھ سکتا تھا اور بھوک اور پیاس محسوس کر سکتا تھا۔ مختلف آوازیں جن سے جنگل گونج رہا تھا، سن سکتا تھا اور خودرو جنگلی پھولوں کی بو سونگھ سکتا تھا لیکن کسی چیز میں تمیز نہ کر سکتا تھا۔ درختوں اور پودوں کی پہچان نہ کر سکتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ اسے کیا کہتے ہیں۔ البتہ ایک چیز کو پہچان سکا تھا اور اسی سے مجھے دلچسپی تھی اور وہ چاند تھا جو آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا اور جنگل میں روشنی پھیلا رہا تھا اور مجھے مسرت بخش رہا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ کئی راتیں گزر گئیں اور اس کے بعد ہی میں اپنے مختلف و متضاد جذبات میں تمیز کر سکا اور انہیں پہچان سکا۔ میں نے چاند کو پہچانا جو مجھ پر مہربان تھا کہ جنگل میں روشنی بکھیرتا تھا۔ میں نے چشمے کو پہچانا اور اسے اپنا مہربان جانا کہ وہ اپنے پانی سے میری پیاس بجھاتا تھا۔ پھر میں نے ان درختوں کو پہچانا جن کی چھاؤں میں میں سوتا تھا اور جو میرے ان داتا تھے کہ ان کے پھلوں سے میں اپنی بھوک مٹاتا تھا اور پھر ایک نئی طرح کی سرخوشی محسوس کر کے میں نے معلوم کیا کہ وہ میٹھی آواز جو ہر رات مجھے لوریاں دیتی تھی ایک چھوٹے سے جاندار کی تھی اور اس جاندار کے بازو تھے جن سے وہ ہوا میں اڑتا اور ایک سے دوسرے درخت تک پہنچتا تھا اور وہ آوازیں جن سے علی الصباح جنگل گونج اٹھتا تھا، ایسے ہی ننھے ننھے اور رنگ برنگے جانداروں کی تھیں۔ بہت بعد میں معلوم کر سکا کہ ان جانداروں کو پرندے کہتے ہیں۔ میں ان پرندوں کی آوازوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتا لیکن میرے حلق سے ایسی بھیانک آوازیں نکلتیں کہ ان سے میں خود سہم کر خاموش ہو جاتا۔

چاند غروب ہو گیا۔ اور ابھی میں جنگل میں ہی تھا...... میں...... اپنے چند احساسات میں تمیز کرنے لگا تھا اور دن بدن میرے احساسات میں دوسرے احساسات کا اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ میری آنکھیں جو پہلے روشنی میں چندھیا جاتی تھیں اب روشنی کی عادی ہو چلی تھیں اور چیزوں کو صحیح روپ میں دیکھنے لگی تھیں۔ اب میں پودوں اور درختوں میں اور کیڑوں اور پرندوں میں تمیز کر سکتا تھا۔

پہلے کوئل اور کوے کی آوازیں میرے لئے یکساں تھیں، صرف آوازیں، لیکن اب میں پیاری اور مکروہ آواز کو پہچاننے لگا تھا۔

چاند طلوع و غروب ہوتا رہا۔

ایک دن میں ایسی جگہ پہنچا جہاں انگارے جل رہے تھے۔ کسی مسافر یا شاید بھکاریوں نے وہ آگ جلائی تھی اور اسے بجھائے بغیر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ میں سردی سے کانپتا ہوا شوق تجسس میں ان انگاروں کے قریب پہنچا اور جب انہوں نے میرے بدن میں گرمی پہنچائی تو خوشی سے بے قابو ہو کر میں نے اپنا ایک ہاتھ دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیا۔ لیکن فوراً ہی ایک بھیانک چیخ کے ساتھ واپس کھینچ لیا۔ بہر حال میں نے آگ اور ان چیزوں کا، جن سے وہ پیدا ہوئی تھی، اپنے طور پر مطالعہ کیا اور اس دریافت سے پھولا نہ سمایا کہ وہ گرمی دراصل لکڑیوں سے پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ بہت سی لکڑیوں کا مجموعہ آگ۔ میں نے سوچا اور درختوں کی بہت ٹہنیاں جمع کر کے انگاروں پر رکھ دیں۔ لیکن وہ گیلی تھیں اس لئے نہ سلگیں۔ میں الاؤ کے قریب مایوس بیٹھ رہا وہ لکڑیاں جو میں نے انگاروں کے بہت قریب رکھی تھیں خشک ہو کر خود بخود جل اٹھیں میں نے اس بات پر غور کیا۔ لکڑیوں کو دیر تک الٹ پلٹ کر کے دیکھتا رہا اور اس کا سبب معلوم کر لیا۔ پھر فوراً ہی لکڑیاں جمع کرنے میں مصروف ہو گیا کہ انہیں خشک کر سکوں اور آگ بجھنے نہ پائے۔

جب رات ہوئی اور میرے پپوٹے بوجھل ہو کر بند ہونے لگے تو یہ خوف دامن گیر ہوا کہ میں سوتا ہی رہوں گا اور آگ بجھ جائے گی۔ چنانچہ میں نے یہ ترکیب کی کہ انگاروں پر میں نے خشک لکڑیاں رکھیں، ان پر پتے بچھا دیئے اور پھر پتوں پر گیلی لکڑیاں رکھ دیں اور پھر الاؤ کے قریب چغہ بچھا کر اس پر دراز ہو گیا تھوڑی دیر بعد ہی میں بے خبر سو رہا تھا۔

بیدار ہوا تو صبح ہو چکی تھی۔ بیدار ہوتے ہی میں آگ کی طرف متوجہ ہوا اوپر سے گیلی لکڑیاں اور پتے ہٹائے۔ نسیم سحری نے پنکھا جھلا اور انگارے جو مدھم پڑ گئے تھے، چمک اٹھے اور یہ میری نئی دریافت تھی کہ ہوا کے جھونکوں سے انگارے روشن ہوئے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک پتوں بھری ٹہنی سے پنکھے کا کام لیا۔ جب آگ بجھنے لگتی تو میں اس ٹہنی سے پنکھا جھلتا۔ دن ڈھلا اور رات آئی تو ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ آگ صرف گرمی ہی نہیں روشنی بھی دیتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے آگ کا صحیح فائدہ بھی معلوم کیا۔ وہ مسافر یا بھکاری جنہوں نے آگ جلائی تھی، وہاں بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھی پھینک گئے تھے، میں نے وہ ٹکڑے کھائے تو بڑے لذیز معلوم ہوئے۔ یہ معلوم کرتے مجھے دیر نہ لگی کہ گوشت بھونا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے بہت سے شاہ دانے بھونے لیکن وہ بدمزہ ہو گئے۔ البتہ بعض درختوں کے پھل اخروٹ بھونے جانے کے بعد مزیدار ہو گئے۔

لیکن اس جنگل میں شاہ دانے اور لذیز پھل زیادہ نہ تھے۔ چنانچہ میری خوراک کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا جارہا تھا۔ میں دن بھر ایسے پھلوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا لیکن جو پھل ملتے وہ کڑوے کسیلے ہوتے چنانچہ میں نے وہ جنگل چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جانے کا فیصلہ کیا جہاں میری وہ ضروریات جنہیں میں اس وقت تک سمجھ سکا تھا پوری ہوسکیں۔ لیکن اس ہجرت سے مجھے آگ سے، جو مجھے گرمی اور روشنی دیتی تھی، محروم ہونا پڑا تھا۔ آگ اور اس کے فائدے میں نے اتفاقاً معلوم کر لئے تھے۔ لیکن اسے جلانے کی ترکیب معلوم نہ کرسکا تھا۔ چنانچہ میں اس کے جلانے کی ترکیب اور صورت حال پر غور کرتا رہا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ محض آگ کی خاطر میں اس جنگل میں نہ رہ سکتا تھا، کیونکہ بھوکوں مرنے کا خوف تھا۔ چنانچہ اپنے آپ کو جبے میں لپیٹ کر اس سمت میں چل پڑا جس سمت سورج کو غروب ہوتے دیکھا تھا۔ میں تین دن شب و روز چلتا رہا اور ایک میدان میں پہنچا جہاں رات کو برف باری ہوئی تھی چنانچہ میدان میں برف بچھی ہوئی تھی۔ میں نے برف پر ڈرتے ڈرتے قدم رکھا اور ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس سفید چیز کی ٹھنڈک سے میرے پاؤں سن ہوگئے۔

اس وقت صبح کے سات بجے ہوں گے۔ مجھے کسی سایہ دار جگہ اور غذا کی تلاش تھی۔ آخرکار مجھے دور پرے ایک جھونپڑی نظر آئی جو ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھی اور غالباً کسی چرواہے کی تھی کہ وہاں بیٹھ کر میدان میں چرتی ہوئی اپنی بھیڑوں پر نظر رکھ سکے۔ یہ میرے لئے ایک نیا منظر تھا۔ پہلے میں نے جھونپڑی نہ دیکھی تھی۔ میں حیرت اور دلچسپی سے جھونپڑی کی انوکھی بناوٹ دیکھتا رہا۔

میں جھونپڑی کے قریب پہنچا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا۔ چنانچہ میں جھونپڑی میں گھس پڑا۔ ایک بوڑھا آگ کے سامنے اکڑوں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ آہٹ سن کر اس نے گردن گھمائی اور میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں، منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس کے بدن میں لرزہ پڑ گیا۔ پھر اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ اٹھ کر دیوانوں کی طرح چیختا ہوا اتنی تیزی سے بھاگا کہ میں دم بخود رہ گیا۔ وہ جلدی سے جھونپڑی سے باہر نکلا۔ ڈھلان اترتے وقت اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا، چنانچہ گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے جا پہنچا۔ یقیناً اسے چوٹ بھی آئی ہوگی۔ لیکن وہ حیرت انگیز پھرتی سے اٹھا اور دونوں ہاتھ ہلاتا اور چیختا ہوا ایسی بدحواسی سے بھاگا کہ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ایسی تیزی سے برف سے ڈھکے ہوئے میدان میں بھاگا جارہا تھا کہ جیسے ہوا کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔ جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی مجھے دو باتوں نے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اول یہ کہ اس بوڑھے کے خدوخال نہ مجھ جیسے تھے اور نہ اس کا قد ہی میرے قد جتنا تھا۔ دوئم یہ کہ وہ مجھ سے ڈر کے بھاگا تھا، بہرحال اس وقت میں نے ان دونوں باتوں پر غور زیادہ نہ کیا اور

جھونپڑی کی طرف متوجہ ہو گیا میں نے دیکھا کہ اس میں بارش کا پانی اور برف داخل نہ ہوئی تھی اس کا فرش خشک اور آرام دہ تھا۔ چنانچہ وہ جھونپڑی میرے لئے جنت کی طرح تھی۔ میں نے رغبت سے وہ کھانا کھایا جو اس بوڑھے نے اپنے لئے تیار کیا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی ڈر کے بھاگ گیا تھا۔ میرے لئے وہ کھانا بھی نیا تھا۔ روٹی، دودھ، مکھن اور شراب۔ شراب مجھے پسند نہ آئی۔ اس کے ذائقے نے دودھ اور مکھن کے ذائقے کا بھی ناس مار دیا۔ شکم سیر ہو کر کھانا کھا چکا تو تھکن کا احساس ہوا چنانچہ میں بھوسی کے ایک ڈھیر پر لیٹ گیا جو مجھے بڑا ہی آرام دہ معلوم ہوا چند منٹوں بعد میں گہری نیند سو رہا تھا۔

بیدار ہوا تو دو پہر ہو چکی تھی۔ میں نے بچا ہوا کھانا ایک تھیلی میں جو جھونپڑی میں ہی مل گئی تھی، بھر لیا اور آگے روانہ ہوا۔ کئی گھنٹوں تک ویران اور غیر آباد علاقے میں چلتا رہا اور سورج غروب ہوتے وقت ایک گاؤں میں پہنچ گیا، اے میرے خالق! تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس منظر نے مجھے کتنا حیرت زدہ کر دیا۔ بہت سی جھونپڑیاں، ان کے بیچ میں کہیں کہیں اینٹوں کے مکانات، سیدھے اور صاف راستے اور ان راستوں پر دانا دنکا چگتی ہوئی مرغیاں اور چرتی ہوئی بھیڑیں۔ جھونپڑیوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے باغات اور جھونپڑیوں میں رکھی ہوئی روٹیاں اور مکھن۔ میرے لئے تو گویا جنت تھی۔ میں خوشی سے بے تاب ہو کر ایک نسبتاً بڑی جھونپڑی کی طرف چلا۔ ابھی میں نے اس کے دروازے پر قدم رکھا ہی تھا کہ بچے مارے خوف کے چیخ اٹھے اور ایک عورت بے ہوش ہو گئی۔ بچوں کی مسلسل چیخوں سے پورے گاؤں میں ایک کھلبلی مچ گئی لوگ اس جھونپڑی کی طرف دوڑ پڑے۔ چند آدمی تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ گئے، چند کھڑے کانپتے رہے اور بقیہ نے، چونکہ زیادہ بہادر تھے، مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھے پتھروں اور لاٹھیوں سے پیٹنے لگے حالانکہ وہ بھی ڈرے ہوئے تھے یہاں تک کہ میں وہاں سے بھاگا۔ گاؤں سے نکل کر سیدھا بھاگتا رہا اور ایک اصطبل میں، جو بہت نیچا اور غلیظ تھا، پناہ لی، یہ اصطبل ایک صاف اور خوبصورت جھونپڑی سے ملحق تھا۔ ایک حالیہ تجربے کے بعد میں اس جھونپڑی میں جانے کی جرأت نہ کر سکا۔ میری وہ پناہ گاہ اور اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ میں اس میں آرام سے بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ چوبی تختوں سے بنائی گئی تھی حالانکہ چوبی دیواروں کی ان گنت جھریوں سے ہوا اندر داخل ہو رہی تھی تاہم وہ جگہ جنگل اور میدانوں کی بہ نسبت آرام دہ تھی۔ وہاں مجھے بارش اور برف پریشان نہ کر سکتی تھی۔ اور وہاں، اس اصطبل میں مقیم ہو گیا۔ میں خوش تھا کہ مجھے سر چھپانے کی جگہ مل گئی اور مطمئن تھا کہ وہاں انسان کے مظالم سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

صبح ہوئی تو میں اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا کہ جھونپڑی اور گرد و پیش کا معائنہ کر کے اندازہ لگا سکوں میں وہاں قیام کر سکتا تھا یا نہیں۔ اصطبل جھونپڑی کے پچھواڑے تھا، چاروں طرف باڑ لگی ہوئی تھی، ایک طرف سور خانہ تھا، سامنے کی باڑ ٹوٹ گئی تھی اور اسی طرف سے وہاں پہنچا تھا۔ میں نے

اصطبل میں واپس آ کے بڑے بڑے سوراخ اور جھریاں بند کر دیں کہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔ میں پھر باہر آیا، ڈرتے ڈرتے چند قدم آگے بڑھا لیکن پھر فوراً ہی بھاگ کر اپنی پناہ گاہ میں گھس گیا۔ کیونکہ مجھے دور سے ایک آدمی آتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دن کا کھانا میرے پاس تھا ہی اور ٹوٹا ہوا ایک لوٹا بھی باہر پڑا مل گیا تھا۔ چنانچہ میں اس سے پانی پی سکتا تھا۔ پانی لینے بھی مجھے دور نہ جانا تھا۔ سور خانے کے قریب ایک چھوٹے سے حوض میں پانی موجود تھا۔

چنانچہ میں وہاں رہنے لگا اور میں نے اس وقت تک وہاں رہنے کا فیصلہ کیا جب تک کہ کوئی واقعہ مجھے وہاں سے نکلنے پر مجبور نہیں کر دیتا۔ میں نے بڑی رغبت سے روٹی کھائی اور اس طرح ناشتے سے فارغ ہو کر تالاب سے پانی پینے کے لئے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ پیروں کی چاپ سنائی دی۔ چنانچہ میں نے ایک جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا کہ ایک لڑکی اپنے سر پر پانی کی گاگر رکھے اصطبل کے قریب سے گزر رہی ہے۔ وہ نوجوان تھی، حسین تھی (کم از کم مجھے تو بے حد حسین معلوم ہوئی) اور اس کے چہرے سے ویسے جذبات عیاں نہ تھے جیسے کہ میں نے ظالم گاؤں والوں کے چہروں پر دیکھے تھے۔ وہ ادھ میلے اور ناکافی کپڑے پہنے تھی۔ سر پر سنہرے بال تھے جن کی دو چار لٹیں اس کے بلند ماتھے پر لہرا رہی تھیں۔ اور پشت پر چوٹی بل کھا رہی تھی۔ وہ کچھ ملول اور اداس سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جھری کے سامنے سے، جس سے میں آنکھ لگائے تھا، گزر کر میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ واپس آئی تو گاگر دودھ سے چھلک رہی تھی۔ وہ گاگر کا بوجھ سنبھالے چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک نوجوان کہیں سے نکل کر اس کے قریب آیا۔ وہ بھی ملول اور فلاکت زدہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لڑکی سے کچھ کہا اور اس کے سر پر سے گاگر اتاری اور ہاتھ میں لٹکائے جھونپڑی کی طرف چلا۔ لڑکی اس کے پیچھے تھی۔ وہ دونوں میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اس نوجوان کو پھر دیکھا۔ اس دفعہ وہ اپنے ہاتھ میں چند آلات لئے ہوئے تھا۔ وہ جھونپڑی کے عقبی میدان کو عبور کر کے آگے بڑھ گیا۔ لڑکی بھی مصروف تھی۔ وہ کبھی تو جھونپڑی میں جاتی اور کبھی سور خانے میں۔ میں کھڑبڑ کی آوازیں برابر سن رہا تھا۔

میں نے دوبارہ اپنی قیام گاہ کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ جھونپڑی کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کبھی اصطبل میں کھلتی تھی۔ لیکن اب تختے ٹھونک کر بند کر دی گئی تھی۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے ان تختوں میں بھی ایک سوراخ مل گیا اور اس سوراخ سے میں نے آنکھ چپکا دی۔ دوسری طرف ایک کمرہ تھا جس کی دیوار پر سفیدی پھیری ہوئی تھی۔ وہاں کسی قسم کا فرنیچر نہ تھا۔ ایک کونے میں آگ کے قریب ایک بوڑھا اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے یوں بیٹھا تھا جیسے دنیا سے بیزار ہو۔ لڑکی کمرے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ اس سے فرصت پا کے اس نے ایک غلیظ سی الماری میں سے کوئی چیز نکال کر بوڑھے

کے سامنے رکھ دی اور پھر خود بھی بوڑھے کے قریب بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے وہ چیز اٹھائی وہ دراصل ایک ساز تھا۔ بوڑھا اسے بجانے لگا، اس میں سے ایسی ایک آواز نکلی جو بلبل کی آواز سے زیادہ شیریں تھی۔ بوڑھا سر ہلا ہلا کے وہ ساز بجا رہا تھا۔ اس کے بشرے سے کچھ ایسی اداسی عیاں تھی کہ مجھے اس پر رحم آ گیا۔ اس کے سفید بالوں نے میرے دل پر ایک خاص اثر کیا۔ وہ کوئی غمناک دھن بجا رہا تھا کیونکہ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ لیکن بوڑھا ساز بجانے میں اتنا منہمک تھا کہ لڑکی کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوا جب تک موخر الذکر کے منہ سے ہچکی نہ نکل گئی۔ بوڑھے نے ساز رکھ دیا، لڑکی کو گھسیٹ کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس منظر نے میرے بدن میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ اس قسم کی سنسنی کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ میں زیادہ دیر تک اس سنسنی کو برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ سوراخ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد نوجوان واپس آیا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے تھا۔ لڑکی دوڑ کر دروازے پر پہنچی۔ نوجوان کے سر پر سے گٹھا اتارنے میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ لڑکی نے گٹھے میں سے دو چار لکڑیاں گھسیٹ کر آگ پر رکھ دیں۔ پھر وہ دونوں جھونپڑی کے ایک کونے میں گئے۔ نوجوان نے ایک لپٹے ہوئے رومال کو کھول کر لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ رومال میں ڈبل روٹی اور مکھن تھا۔ لڑکی مسکرائی۔ پھر وہ جھونپڑی سے باہر گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سبزی تھی۔ یہ چیزیں اس نے ہنڈیا میں ڈال کر اوپر سے تھوڑا سا پانی ڈالا اور ہنڈیا چولہے پر چڑھا دی۔ وہ آگ کے قریب مصروف رہی۔ نوجوان جھونپڑی سے نکل کر سامنے والے باغیچے میں پہنچا اور پودے اکھاڑتا اور کچھ بوتا رہا۔ وہ دونوں کوئی ایک گھنٹے تک اسی طرح مصروف رہے پھر لڑکی نوجوان کے پاس پہنچی۔ اس سے کچھ کہا اور وہ دونوں جھونپڑی میں واپس آ گئے۔

اس تمام عرصے میں بوڑھا خاموش اور اداس بیٹھا رہا۔ لیکن جب وہ دونوں بوڑھے کے قریب پہنچے تو بوڑھا مسکرایا اور پھر مل کے کھانا کھانے لگے۔ اس سے فارغ ہوئے تو لڑکی پھر جھونپڑی کی صفائی کرنے لگی۔ بوڑھا نوجوان کے کندھے کا سہارا لئے جھونپڑی کے سامنے دھوپ میں تھوڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ میرے لئے وہ بے حد دلچسپ اور انوکھا منظر تھا اور ان دو آدمیوں میں عجیب تضاد تھا ۔جس سے میں پہلی دفعہ واقف ہو کر عمر کے فرق کو سمجھ سکا تھا۔ ان میں سے ایک کے بال سفید تھے، چہرے پر جھریاں تھیں اور بشرے سے مسکینیت، رحمدلی، ہمدردی، اداسی اور ساتھ ہی بزرگی عیاں تھی۔ اس کے برخلاف دوسرے کے بال کالے تھے۔ چہرے پر جھریاں نہ تھیں اور خدوخال بڑے دلکش تھے، لیکن وہ بھی اداس اور ملول تھا۔

بوڑھا پھر جھونپڑی میں آ کر اپنی مخصوص جگہ بیٹھ گیا۔ اور نوجوان اوزار لے کر باہر آیا اور میدان

عبور کر کے کہیں چلا گیا اور وہ اوزاران اوزاروں سے جو میں نے اس کے ہاتھ میں صبح دیکھے تھے، مختلف تھے۔

رات نے اپنے گیسو بکھرائے اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ میرے پڑوسیوں کے پاس روشنی کا سامان موجود تھا۔ انہوں نے ایک لمبی سی چیز ایک تختے پر چپکا رکھی تھی اور اس چیز کی چوٹی پر شعلہ لرز رہا تھا اور اس کی روشنی جھونپڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت میں اس لمبی سی چیز کو پہچانتا نہ تھا۔ لیکن میرے خالق! تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ وہ موم بتی تھی۔

شام سے رات تک لڑکی اور اس کا ساتھی کچھ ایسے کام کرتے رہے جنہیں میں سمجھ نہ سکا۔ بوڑھا وہ ساز بجانے لگا جس کی سریلی آواز نے صبح مجھے مسحور کر دیا تھا۔ اس کے بعد نوجوان اپنے منہ سے کچھ عجیب طرح کی آوازیں نکالنے لگا اور اس کے منہ سے نکلتی ہوئی آوازیں نہ تو پرندوں کے نغموں جیسی تھیں اور نہ ساز سے نکلتی ہوئی آواز جیسی۔ اس کے منہ سے نکلتی ہوئی آواز میں اتار چڑھاؤ تھا، ایک خاص قسم کی لے تھی۔ جوش تھا لیکن ترنم اور نغمگی نام کو نہ تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ لیکن اس وقت میں حروف والفاظ کے علم سے واقف نہ تھا۔ میں بولنا جانتا ہی نہ تھا۔ میں نے بولنا سیکھا ہی نہ تھا۔ کیونکہ میرے خالق نے مجھے بولنا سکھایا ہی نہ تھا۔ وہ تو مجھ سے ڈر کے اور مجھے اکیلا چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان خاموش ہوا، لڑکی نے اٹھ کے بتی بجھائی اور وہ تینوں اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔

اور اس طرح، اے میرے خالق! میری زندگی کا پہلا یادگار دن ختم ہوا۔



نواں باب

میری پناہ گاہ کا فرش ننگا اور سخت تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر گھاس اور بھوسی وغیرہ بچھا کے اپنا بستر پہلے ہی سے تیار کر لیا تھا۔ اور اب میں اس بستر پر دراز تھا لیکن نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میں آج کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ میرے پڑوسیوں کے رہن سہن کا طریقہ ان کا ایک دوسرے سے محبت بھرا سلوک تھا۔ میں ان کے ساتھ رہنے اور ان کی محبت و ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ لیکن ان کے سامنے جانے کی جرأت نہ کر سکا۔ میں گاؤں والوں کے ظالمانہ سلوک کو بھولا نہ تھا۔ ممکن تھا کہ میرے پڑوسی مجھ سے ڈر جاتے یا مجھے ضرر پہنچانے کی کوشش کرتے چنانچہ میں نے اس وقت تک اصطبل میں ہی چھپے رہنے کا فیصلہ کیا جب تک کہ میں اپنے پڑوسیوں کی طرح بولنا اور ان کے طور طریقے نہیں سیکھ جاتا۔

دوسرے دن منہ اندھیرے ہی میرے ہمسائے بیدار ہو گئے۔ لڑکی جھونپڑی کی صفائی اور ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ نوجوان ناشتہ کر کے حسب معمول کہیں چلا گیا۔ ان کا دوسرا دن بھی گزشتہ دن کی طرح مصروف گزرا۔ نوجوان کہیں باہر اور لڑکی جھونپڑی میں مصروف رہی۔ بوڑھا، جو بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اندھا تھا، آگ کے قریب یا تو سر جھکائے بیٹھا رہا یا اپنا ساز بجاتا رہا۔

لڑکی اور نوجوان اس بوڑھے کا جتنا خیال رکھتے تھے اور اس کا جتنا احترام کرتے تھے اور بوڑھا ان سے جتنی محبت کرتا تھا اس نے مجھ پر ایک خاص اثر کیا۔ میرا دل، بشرطیکہ اے میرے خالق تم نے میرے سینے میں دل رکھا ہو، ان کی طرف کھنچنے لگا۔ میں بھی ان کے ساتھ رہنا اور ان کی محبت اور ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک طرح کا خوف اور گاؤں والوں کے ظالمانہ سلوک کی یاد میرے پاؤں پکڑے تھی۔ کاش کہ میں تمہارا بندہ ہونے کے بجائے وہ اندھا بوڑھا ہوتا۔

میرے پڑوسی خوش اور سکھی نہ تھے۔ لڑکی اور اس کا نوجوان ساتھی اکثر ایک کونے میں بیٹھ کر چپکے چپکے رویا کرتے تھے۔ مجھے ان کے دکھ کا کوئی سبب نظر نہ آتا تھا اور میں ان کے آنسوؤں کا مطلب سمجھتا نہ تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں اس طرح رویا کرتے ہیں۔ تاہم میں ان کے یوں رونے سے بے حد متاثر تھا اگر ایسے محبت کرنے والے لوگ دکھی تھے تو اس میں کوئی تعجب نہ تھا کہ مجھ جیسا تنہا اور راندۂ درگاہ جاندار دکھی ہو...... لیکن ان شریف اور رحمدل آدمیوں کو کیا دکھ تھا؟ کون سی بات انہیں رُلا رہی تھی؟ وہ ایک بے حد آرام دہ (کیونکہ ان کی جھونپڑی مجھے ایسی معلوم ہوئی) گھر کے مالک

تھے۔ان کے پاس آگ تھی رات کے لئے روشنی کا سامان تھا اور کھانے کے لئے لطیف غذا۔وہ میلے تاہم مناسب کپڑوں سے اپنا جسم ڈھانکے ہوئے تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ انہیں ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی میسر تھی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ سے اور آوازوں سے لطف اندوز ہو سکتے تھے...... یہ سب ہوتے ہوئے وہ روتے کیوں تھے؟ کیا مطلب تھا ان کی اُداسی کا؟ کون سا غم تھا انہیں؟ ابتدا میں مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملا۔لیکن جیسے جیسے میں اپنے پڑوسیوں کا مطالعہ کرتا گیا وہ باتیں سمجھنے لگا جو پہلے سمجھ نہ سکا تھا۔

کئی دنوں بعد میں ان کے دکھ کا پہلا سبب معلوم کر سکا۔وہ غریب تھے بے حد غریب۔ان کی غذا جو ابتدا میں مجھے بے حد لذیذ معلوم ہوئی تھی، اس سبزی پر جوان کے چھوٹے سے باغ میں اگتی تھی، اور ان کی ایک مریل گائے کے دودھ پر مشتمل تھی۔گائے کا دودھ کم ہوتا جارہا تھا کیونکہ اسے پیٹ بھر کے چارہ نہ ملتا تھا۔خصوصاً موسم سرما میں تو وہ اس سے بمشکل دودھ حاصل کر سکتے تھے۔چنانچہ ان کے اکثر دن فاقے کرتے گزرتے تھے۔خصوصاً لڑکی اور اس کے نوجوان ساتھی کے۔کیونکہ وہ خود بھوکے رہ کے تھوڑا بہت کھانا، جو کچھ ہوتا، بوڑھے کے سامنے رکھ دیتے، بوڑھا، اندھا تھا، یہ سمجھ کر کہ لڑکی اور نوجوان کھا چکے، کھانا کھالیتا۔

ان دونوں کے بوڑھے سے اس رحمدلانہ سلوک نے مجھے بے حد متاثر کیا میں ہر رات، خود اپنی بھوک مٹانے کے لئے ان کا کھانا چرالیا کرتا تھا۔لیکن، جب مجھے معلوم ہوا کہ میری یہ حرکت میرے پڑوسیوں کو بھوکا رکھتی ہے تو میں ان کا کھانا چرانے کے بجائے پھر شاہ دانوں اور جنگلی پھلوں پر گزر بسر کرنے لگا۔رات کو جب میرے ہمسائے میں سونا پڑ جاتا، اپنی پناہ گاہ سے نکل کر قریبی جنگل میں جاتا اور سارے دن کی غذا لے آتا۔

میں نے اپنے پڑوسیوں کی مدد کرنے کا ایک طریقہ بھی بہت جلد معلوم کر لیا میں روزانہ دیکھتا تھا کہ نوجوان چند اوزار لے کر جنگل کی طرف جاتا ہے اور جب واپس آتا ہے اور اس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا ہوتا ہے۔چنانچہ اکثر راتوں میں میں وہی اوزار لے کر جن کا استعمال تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے سیکھ لیا تھا، جنگل میں جاتا، اور بہت سی لکڑیاں، جو دونوں کے لئے کافی ہوتیں، کاٹ لاتا۔

اپنی اس محنت کا ان لوگوں پر پہلا اثر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔پہلی رات کو میں نے بہت سی لکڑیاں جمع کیں اور راتوں رات جھونپڑی کے دروازے کے سامنے ڈھیر کر دیں۔صبح لڑکی نے دروازہ کھولا تو لکڑیوں کے انبار دیکھ کر حیران رہ گئی۔چند ثانیوں تک وہ بت بنی کھڑی رہی۔پھر اونچی آواز میں چند الفاظ کہے۔نوجوان ساتھی دوڑ کے لڑکی کے پاس آیا۔وہ بھی اتنی بہت سی لکڑیاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔پھر ان دونوں نے تجسس سے چاروں طرف، چند قدم آگے بڑھ کے دیکھا۔وہاں کوئی

ہوتا تو نظر آ تا۔ چنانچہ وہ لکڑیاں اندر اٹھا لے گئے اور میں نے خوشی کی لہریں محسوس کر کے دیکھا کہ اس دن نوجوان جنگل کی طرف نہ گیا اور دن بھر اپنے چھوٹے سے باغ میں سبزی بوتا رہا۔

رفتہ رفتہ میں نے ایک نئی اور عظیم بات معلوم کی۔

میں نے دیکھا کہ میرے پڑوسی اپنے خیالات کا اظہار اپنی آواز کو ایک خاص روپ دے کر کر سکتے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے حلق سے نکلی ہوئی مختلف قسم کی آوازیں سننے والے کے ہونٹوں پر کبھی تو مسکراہٹ لے آتی تھیں اور کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو۔ یہ بہت زبردست دریافت تھی۔ چنانچہ میں نے بھی الفاظ سیکھنے اور انہیں ادا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس معاملے میں میری کوشش رائیگاں ہی گئی۔ وہ بڑی تیزی سے بولتے تھے اور چونکہ آواز ٹھوس نہیں ہوتی تھی، جسے آدمی دیکھ سکے، چنانچہ میں کوئی ایسی کلید معلوم نہ کر سکا جو آوازوں کے اس گورکھ دھندے کو سلجھا سکتی۔ بہر حال میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں ان کے لبوں کی ہر جنبش کی طرف غور سے دیکھتا رہا اور کئی دنوں راتوں کی توجہ کے بعد وہ الفاظ معلوم کر سکا جو انہوں نے ان چیزوں کے متعلق کہے تھے جن سے میں واقف تھا۔ میں نے یہ الفاظ سیکھے اور انہیں ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور اس کوشش میں کئی چاند طلوع و غروب ہوئے تب کہیں جا کے میں وہ الفاظ ادا کر سکا اور وہ ان چیزوں کے نام تھے جو میں نے دیکھی تھیں۔ یعنی...... آگ، ایندھن، دودھ اور روٹی وغیرہ۔ اور یہ الفاظ ادا کر کے میں نے ایسی خوشی محسوس کی کہ پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی حالانکہ یہ الفاظ میں رک رک کر اور نامکمل طور سے ادا کر سکا تھا۔

تھوڑے دنوں بعد میں نے اپنے پڑوسیوں کے نام بھی سیکھ لئے۔ لڑکی نوجوان کو اور نوجوان لڑکی کو کئی ناموں سے پکارتا تھا۔ لیکن بوڑھے کا صرف ایک ہی نام تھا...... ابا...... لڑکی کے بہت سے نام تھے لیکن دو ناموں سے اکثر پکاری جاتی تھی...... بہن اور ایگتھا...... اور نوجوان کے نام یوں تھے...... فیلکس، بھائی اور بیٹا...... میں نے چند دوسرے الفاظ بھی سیکھے حالانکہ انہیں ٹھیک سے ادا نہ کر سکا اور نہ ان کا مطلب ہی سمجھا تھا مثلاً...... اچھا، پیاری، پیارے، دکھ، سکھ وغیرہ...... اس دریافت کے بعد میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا اور جب پہلی مرتبہ اپنی آواز میں یہ الفاظ ادا کر سکا تب تو مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا۔

موسم سرما اسی طرح گزرا۔

اپنے پڑوسیوں سے مجھے انسیت بلکہ محبت ہو گئی۔ جب وہ اُداس رہتے تو میں بھی اداس ہو جاتا۔ جب وہ خوش ہوتے تو میں بھی خوش ہوتا۔ ان کا دکھ، میرا دکھ، ان کی خوشی میری خوشی اور ان کا سکھ میرا سکھ تھا۔ میرے پڑوسیوں کے پاس بہت کم لوگ آتے تھے اور جو آتے ان کے چہرے پر کی کرختگی اور ان کی باتوں کا اکھڑپن دیکھ کر میری اپنے پڑوسیوں سے محبت دو چند ہو جاتی، بوڑھا اپنی لڑکی اور لڑکے کی اکثر ڈھارس بندھاتا رہتا اور انہیں تسلی دیتا اور اس وقت بوڑھے کا لہجہ بڑا شگفتہ ہوتا۔ وہ خود ہنستا اور دونوں کو

ہنساتا۔ اس کی باتیں مجھے بھی بشاش کر دیتیں اور میں بھی اپنی بے کسانہ حالت اور تنہائی بھول جاتا۔
ایگتھا غور اور احترام سے بوڑھے کی باتیں سنتی۔ بعض دفعہ اس کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں لیکن وہ فوراً اپنے آنسو پونچھ لیتی۔ لیکن اکثر یوں ہوتا کہ بوڑھے کی باتیں سننے کے بعد ایگتھا بشاش ہو جاتی اور اس کے رخساروں پر گلاب سے کھل اٹھتے۔ لیکن فیلکس کے ساتھ یہ بات نہ تھی۔ بوڑھے کی باتوں کا اثر اس پر الٹا ہوتا۔ وہ اور بھی زیادہ اداس ہو جاتا۔ تاہم وہ بوڑھے کو حتیٰ الامکان بڑی بشاشت سے مخاطب کرتا اور میں دیکھتا کہ اس کا شگفتہ لہجہ اس کے چہرے پر کے اداس جذبات سے کس طرح میل کھاتا تھا۔ لیکن بوڑھا یہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اندھا تھا۔
میرے ان مفلوک الحال ہمسایوں کی زندگی میں معمولی واقعات بھی خوشی لے آتے تھے۔ حالانکہ ان کی یہ خوشی عارضی ہوتی تھی۔ مثلاً جب ان کے باغ میں گلاب کا پہلا پھول کھلا تو فیلکس اسے توڑ کر خوشی سے ناچتا ہوا اپنی بہن کے پاس پہنچا اور پھول اس کی خدمت میں بڑے فخر سے پیش کیا۔ ایگتھا بھی خوش ہوگئی...... تو ایسی تھیں میرے ہمسایوں کی خوشیاں۔ فیلکس اپنی بہن سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا اور اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔
چنانچہ ایگتھا سے پہلے وہ بیدار ہو جاتا اور جھونپڑی کے سامنے سے برف ہٹاتا، راستہ صاف کرنے لگتا، کنویں سے پانی کھینچتا اور لکڑیوں کے اس انبار کو، جو ان کے خیال میں کوئی فرشتہ ان کی جھونپڑی کے سامنے رکھ جاتا تھا۔ دیکھ کے حیرت سے بڑبڑانے لگتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی کے کھیت میں مزدوری کرتا تھا۔ کیونکہ اکثر وہ صبح سویرے ہی اپنے گھر سے نکل جاتا اور دوپہر کے کھانے کے وقت واپس آتا اور جب واپس آتا تو خالی ہاتھ ہوتا یعنی لکڑیوں کا گٹھا لئے نہ ہوتا۔ پھر شام تک وہ اپنے چھوٹے سے باغ میں کام کیا کرتا۔ لیکن موسم سرما میں، معلوم ہوتا ہے اسے زیادہ کام نہ ملتا تھا۔ چنانچہ وہ بوڑھے اور ایگتھا کو کچھ پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔
اس پڑھنے پڑھانے کے سلسلے نے ابتدا میں مجھے الجھا دیا...... لیکن غور سے سننے پر مجھے معلوم ہوا کہ پڑھتے وقت اس کے حلق سے زیادہ تر ایسی ہی آوازیں نکلتی تھیں جیسی کہ بولتے وقت۔ چنانچہ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کاغذ پر بولنے کی علامتیں بنی ہوئی ہیں جنہیں فیلکس سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ میں ان علامتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بے چین ہو اٹھا...... میں الفاظوں کے اتار چڑھاؤ کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا تھا لیکن اس حد تک نہیں کہ اپنے ہمسایوں کی ہر بات سمجھ سکوں۔ چنانچہ میں لفظ سیکھنے اور انہیں اپنی آواز میں ادا کرنے کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ میں اپنے رحمدل ہمسایوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی مجھے احساس تھا کہ یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ میں ان کی زبان پر جس میں وہ گفتگو کرتے اور پڑھتے ہیں پوری طرح عبور حاصل نہیں کر لیتا۔ اگر میں نے جلد بازی سے کام

لیا تو یقیناً یہ ہوگا کہ میری بدصورتی اور دیو قامتی سے ڈر جائیں گے۔

اور مجھے اپنے بے ڈھنگے پن اور ہیبت ناک صورت کا شدت سے احساس تھا اور میں اپنے پڑوسیوں کے خوبصورت خدوخال، قدوقامت اور سڈول جسم دیکھ کے دل ہی دل میں ان کی تعریف کیا کرتا تھا اور پھر ایک دن جب میں نے تالاب کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اپنے آپ سے میں خود ہی ڈر گیا۔ پہلے تو میں مارے دہشت کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا مجھے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ پانی میں جو بھیانک صورت میں نے دیکھی۔ وہ دراصل میرا ہی عکس تھا۔ لیکن جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی میرا ہی عکس تھا تو میں اداس ہو گیا۔ اس وقت تک میں اپنی بدصورتی سے پوری طرح واقف نہ ہوا تھا۔

جب سورج کافی بلند ہو گیا اور برف پگھل گئی تو میں نے دیکھا کہ درخت ننگے کھڑے تھے اور دھرتی کا سیاہ اور مٹیالا سینہ نظر آ رہا تھا اور جب یہ وقت آ یا یعنی برف پگھل گئی، تو فیلکس پہلے سے زیادہ مصروف رہنے لگا۔ اور میرے ہمسایوں کا یہ خوف کہ وہ بھوکے مریں گے، جاتا رہا اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ جھونپڑی کے سامنے والی کیاریوں میں نئے نئے پودے اگ آئے اور میرے پڑوس میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

بوڑھا فیلکس کے کندھے کا سہارا لے کر روزانہ دوپہر کو جھونپڑی کے سامنے ٹہلتا۔ بشرطیکہ بارش نہ ہو رہی ہوتی...... بارش...... یہ ایک نیا لفظ تھا جو میں نے سیکھا تھا۔ جب آسمان سے پانی برس رہا ہوتا تو میرے پڑوسی اسے بارش کہتے تھے۔ میں نے یہ لفظ یاد رکھا اور پھر آسمان سے برستے ہوئے پانی کو دیکھا اور سمجھا کہ بارش یہی ہے اور بارش ہوتی اور پھر بادلوں میں سے سورج نکل آتا اور ہوا چلتی اور زمین بہتا ہوا پانی خشک ہو جاتا اور موسم بے حد خوشگوار ہو جاتا۔

میری زندگی ایک ہی دھارے پر چلی جا رہی تھی۔

صبح بیدار ہوتے ہی میں پڑوسیوں کی حرکات و سکنات دیکھنے میں مصروف ہو جاتا اور جب وہ اپنے کام کرتے ہوئے ادھر ادھر ہو جاتے تو میں اپنے گھاس کے بستر پر لیٹ کے تھوڑا سا سو لیتا اور پھر بیدار ہو کے دن کا بقیہ حصہ اپنے پڑوسیوں کو دیکھنے میں گزار دیتا اور جب رات ہوتی اور جب میرے پڑوس میں سونا پڑ جاتا اور وہ چاندنی رات ہوتی یا تاروں سے جگمگا رہی ہوتی تو میں اپنی پناہ گاہ سے نکلتا، جنگل میں جاتا اور اپنے لئے غذا اور اپنے ہمسایوں کے لئے ایندھن جمع کرتا اور واپس آ کر جھونپڑی کے سامنے والا راستہ اپنے ہمسایوں کے لئے صاف کرتا اور وہ کام کرتا جو دن میں فیلکس کو کرتے دیکھتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا اور میں نے دیکھا کہ میرے ان کاموں نے میرے ہمسایوں کو حد سے زیادہ حیران کر دیا۔ وہ صبح اٹھتے تو جھونپڑی کے سامنے لکڑیوں کا گٹھا پڑا پاتے، جھونپڑی کے چاروں طرف کی برف صاف ہوتی اور کیاری کے ہرے پودے کے گرد تھالے تیار ہوتے۔ میرے ہمسائے حیران رہ جاتے اور ایک دفعہ میں نے انہیں کہتے سنا۔

''کمال ہے۔''

''مقدس روح۔''

''غیبی ہاتھ۔''

''خدا کی دین۔''

لیکن اس وقت میں ان لفظوں کا مطلب سمجھتا نہ تھا۔

بہر حال میں جلد جلد بہت سی باتیں سیکھنے لگا۔ لیکن ابھی بہت سے سوال حل طلب تھے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ فیلکس اداس اور ایگتھا غمگین کیوں رہتی ہے اور پھر میں نے سوچا کہ میں ان کے دکھ دور کرسکتا ہوں۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا تو میرے ہمسایوں کی صورتیں میری نظر کے سامنے ہوتیں۔ میں انہیں بہت بلند، ہر انسان سے بلند تصور کرتا اور سوچتا کہ یہی لوگ ہیں جو میری تنہائی دور کریں گے۔ جو مجھے محبت دیں گے اور ہمدردی دیں گے۔ میں اپنے آپ کو ان کے سامنے ظاہر کرنے کی ہزاروں ترکیبیں سوچتا اور یہ تصور کر کے خوش ہوتا کہ وہ بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کریں گے۔ لیکن پھر میں فیصلہ کرتا کہ مجھے عجلت سے کام نہ لینا چاہیے اگر میں نے بولنا سیکھےبغیر اپنے آپ کو ظاہر کردیا اور اپنے خیالات کا اظہار نہ کرسکا تو یقیناً یہ لوگ بھی مجھ سے ڈر جائیں گے یا شاید مجھے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں گے چنانچہ پہلے ہی مجھے ان کی زبان سیکھ لینی چاہیے۔ اس کے بعد ہی میں ان کی ہمدردیاں اور محبت حاصل کرسکوں گا۔

یہ خیالات تھے جو مجھے اکساتے، میرے دل میں جوش پیدا کرتے اور میں زبان سیکھنے کی کوشش دو چند کردیتا۔ میری زبان موٹی ہے اور آواز پھٹی ہوئی، غیر انسانی اور بھیانک۔ بہر حال چند الفاظ کو ادا کرتے وقت مجھے کتنی ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور کئی دفعہ میں اداس اور نا امید ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، مجھے یقین تھا کہ میں بولنے لگوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ الفاظ کا گورکھ دھندا میں سمجھنے لگوں گا، اور مجھے یقین تھا کہ میں، بھیانک آواز میں ہی سہی، بہر حال اپنا مطلب واضح کرسکوں گا۔ چنانچہ مجھے اپنا مستقبل روشن نظر آتا تھا۔

اور یہ حالت تھی اس وقت میری کہ ماضی کے اندھیری تہوں میں دب چکا تھا، حال خوشگوار اور پر امید تھا اور مستقبل تابناک اور پر مسرت نظر آتا تھا اور دھرتی میرے حال کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے میں میری معاون ثابت ہو رہی تھی...... بارشیں ہوئیں، سورج چمکا اور دھرتی نے اپنے خزانے اگل دیئے چاروں طرف سبزہ زار تھا۔ درختوں کی نئی نئی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں، پرندوں کے چہچہوں میں الوہیت تھی اور ہوا کے جھونکوں میں فرحت اور دنیا مجھے بے حد حسین معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ میرا ماضی اندھیری تہوں میں دفن تھا اور مستقبل روشن نظر آتا تھا۔



تیرھواں باب

اے میرے خالق! اب میں اپنی کہانی کا اہم حصہ سنانے والا ہوں۔ اب میں وہ واقعات بیان کروں گا جنہوں نے مجھے وہ بنایا جو میں بننا نہ چاہتا تھا خونی اور سفاک۔

موسم بہار آیا اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ سامنے والا میدان جو پہلے ننگا تھا سبزے سے ڈھک گیا۔ بہت سے پھول کھل اٹھے، ہوا مہک گئی اور رنگ برنگے قمقموں جیسے پھول اور نت نئی خوشبوئیں مجھے ایک نئے احساس سے روشناس کرا رہی تھیں۔

اس موسم کا مخصوص دن تھا جس دن کہ میرے پڑوسی چھٹی مناتے تھے اور اس دن فیلکس پہلے سے کہیں زیادہ اداس تھا۔ بوڑھا اپنا ساز بجا رہا تھا اور فیلکس کے منہ سے بار بار ایک آہ نکل جاتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ اس کی آہ سن کے بوڑھا ساز بجاتے بجاتے رک گیا اور اپنے بیٹے سے اس کی اداسی کا سبب پوچھنے لگا۔ فیلکس نے شگفتہ لہجے میں کچھ جواب دیا تو بوڑھا مطمئن ہو کے پھر ساز بجانے لگا۔ لیکن ابھی وہ ساز بجا ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ایگتھا نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو دروازے کے سامنے ایک عورت نظر آئی جو گھوڑے پر سوار تھی اور اس کے ساتھ گاؤں کا ایک آدمی تھا جو اس عورت کو جھونپڑی تک لایا تھا۔ عورت سیاہ کپڑے پہنے اور چہرے پر نقاب ڈالے تھی۔ ایگتھا نے کچھ پوچھا جس کے جواب میں خاتون نے صرف ایک لفظ کہا۔

"فیلکس۔"

اس خاتون کی آواز سن کر فیلکس اٹھا اور تیر کی طرح دروازے پر پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی آنے والی نے اپنے چہرے پر نقاب الٹ دی اور اس کا حسن دیکھ کر میری آنکھیں چوندھیا گئیں۔ ایسا حسین چہرہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے بال لانبے، چمکیلے اور کالے تھے، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ اور رخسار گلابی تھے۔

اس خاتون کو دیکھتے ہی فیلکس مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا۔ اس کا اداس چہرہ دفعتہً دمک اٹھا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی اور اس کے چہرے کے جذبات میں یہ فوری تغیر میں نے حیرت سے دیکھا۔

اجنبی خاتون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ فیلکس کی طرف بڑھا دیا موخرالذکر نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا اور اسے "

میری پیاری عبرانی'' کہہ کے مخاطب کیا۔ اجنبی عورت غالباً سمجھ نہ سکی تاہم مسکرادی۔ فیلکس نے سہارا دے کر اسے گھوڑے پر سے اتارا۔ اور گاؤں والے کا، جو خاتون کے ساتھ آیا تھا، شکریہ ادا کر کے رخصت کیا اور خاتون کو جھونپڑی میں لے آیا۔ فیلکس نے بوڑھے سے کچھ کہا اور موخرالذکر نے خاتون کو اپنے سینے سے لگالیا۔

اجنبی عورت اپنی مترنم آواز میں صاف الفاظ میں بولتی تھی لیکن معلوم ہوا کہ جھونپڑی والے نہ اس کی زبان سمجھتے تھے اور نہ وہ جھونپڑی والوں کی، چنانچہ وہ لوگ اشاروں سے باتیں کرتے اور یہ اشارے میں سمجھ نہ سکتا۔ تاہم یہ میں نے ضرور دیکھا کہ اجنبی خاتون کی آمد کے ساتھ ہی وہ اداسی جو میرے ہمسایوں پر سایہ فگن تھی، دفعتہً غائب ہوگئی۔ بالکل اس طرح جس طرح کہ سورج کے طلوع ہوتے ہی دھند غائب ہو جاتی ہے۔ فیلکس سب سے زیادہ مسرور تھا، ایگتھا شریف اور معصوم ایگتھا اجنبی خاتون کے سامنے گویا بچھی جا رہی تھی اور اپنے بھائی کی طرف اشارے کر رہی تھی اور اجنبی خاتون کو سمجھا رہی تھی کہ اس کے آنے سے پہلے فیلکس کتنا اداس اور ملول تھا۔

میرے ہمسائے بے حد مسرور تھے اور ان کی اس مسرت کا سبب معلوم کرنے سے میں قاصر تھا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے پڑوسی جو کچھ کہتے اجنبی خاتون انہی الفاظ کو رک رک کے ادا کرتی۔ مجھے خیال آیا وہ شاید میرے پڑوسیوں کی زبان سیکھ رہی ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور اجنبی خاتون کے ساتھ ہی ساتھ میں بھی اپنے پڑوسیوں کی زبان سیکھ لوں۔

اجنبی خاتون کو پہلا سبق دیا گیا اور وہ تقریباً بیس الفاظ سیکھ گئی اور ان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ تھے جنہیں میں پہلے کئی دفعہ سن چکا تھا اور سمجھنے بھی لگا تھا۔ لیکن اس پہلے سبق میں چند نئے الفاظ بھی تھے۔ چنانچہ میں نے یہ الفاظ بھی یاد کر لئے۔

دن ختم ہوا۔ رات آئی۔ ایگتھا اور اجنبی خاتون جلد ہی سونے چلی گئیں اجنبی خاتون جب سونے جا رہی تھی تو فیلکس نے اس کو چوم کر کہا تھا۔

''شب بخیر پیاری راحیل۔''

اور مجھے معلوم ہوا کہ اس خاتون کا نام راحیل تھا۔ وہ اور ایگتھا چلے گئے لیکن فیلکس رات گئے تک بیٹھا بوڑھے سے باتیں کرتا رہا اور وہ بار بار ایک لفظ ''راحیل'' دہراتے اور خوش ہوتے رہے۔ چنانچہ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں اسی خوبصورت خاتون کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

دوسرے دن فیلکس حسب معمول صبح سویرے ہی اپنے کام پر چلا گیا اور جب ایگتھا روز کے کاموں سے فرصت پا چکی تو وہ اور راحیل بوڑھے کے پاس بیٹھ گئیں۔ اجنبی خاتون نے وہ ساز اٹھایا جو غالباً اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس ساز پر اس نے ایک ایسی دھن چھیڑی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے

لگے میں خوش بھی تھا اور اداس بھی۔ خوش اس لئے کہ میں نے ایک نئے ساز کی آواز سنی تھی اور اداس اس لئے کہ راحیل کوئی غمناک دھن بجا رہی تھی۔ چنانچہ میری آنکھوں سے جو آنسو بہے وہ بیک وقت خوشی اور غم کے تھے۔ پھر وہ گانے لگی اور بے حد شیریں آواز تھی جس سے میں مسحور ہو گیا۔

جب وہ گا چکی تو اس نے ساز ایگتھا کی طرف بڑھا دیا۔ موخرالذکر پہلے تو شرما شرما کے انکار کرتی رہی لیکن آخر اس نے ساز لے لیا۔ اس نے ایک دھن بجائی اور پھر بے حد نیچی آواز میں گیت گانے لگی۔ لیکن اس کی آواز میں نہ تو راحیل کی آواز کی سی شیرینی تھی اور نہ ایسا لوچ۔ جب وہ گا چکی تو بوڑھے نے اس سے کچھ کہا۔ ایگتھا راحیل کو بوڑھے کی بات سمجھانے لگی اور اگر میں نے غلط نہیں سمجھا تو بوڑھے نے راحیل کے گیت کی تعریف کی تھی۔

دن گزرتے گئے۔

اب میرے پڑوس میں اداسی اور افسردگی نہ تھی۔ اب وہاں مسرتیں تھیں اور قہقہے تھے۔ راحیل کے ساتھ ہی ساتھ میں بھی اپنے پڑوسیوں کی زبان بڑی کامیابی سے سیکھ رہا تھا اور دو مہینے کی مدت میں میں بہت کچھ سیکھ گیا تھا۔

دن گزرتے گئے۔

دھرتی کے سینے پر ہری ہری گھاس لہلہا رہی تھی۔ خودرو جنگلی پھول کثرت سے اگ آئے تھے۔ راتیں شفاف ہوتی تھیں اور دن گرم۔ اب سورج دیر سے غروب ہوتا تھا اور جلدی طلوع ہو جاتا تھا۔ دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو گئی تھیں اور میں ہر رات جنگل میں بھٹکتا اور کھلی فضا میں سانس لیتا اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اپنی پناہ گاہ میں لوٹ آتا۔ میں ابھی تک اپنے پڑوسیوں کے سامنے جانے یا دن کو اپنی پناہ گاہ سے نکلنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کیونکہ میں گاؤں والوں کے ظالمانہ سلوک کو نہ بھولا تھا۔

میں نے بولنا سیکھا۔ ابجد سے واقف ہوا۔ میں نے وہ سب سیکھا جو فیلکس راحیل کو سکھاتا تھا اور یہ سب کچھ سیکھ کے میں خوش ہوتا۔

وہ کتاب جو فیلکس راحیل کو پڑھایا کرتا تھا، انہی کی تاریخ ''شاہان سلف'' تھی اور بے حد آسان تھی۔ چنانچہ میں تاریخ سے واقف ہوا جو بہادر تھے اور ان سلطنتوں کا حال جانا جن میں سے کئی ایک دنیا کے مختلف گوشوں میں اب بھی موجود ہیں۔ مختلف حکومتوں کے قوانین، قوموں کی رسومات اور مذاہب عالم سے واقف ہوا میں نے روما کے عروج و زوال کی تاریخ معلوم کی۔ ایشیا کی تہذیب و تمدن پر حیران ہوا۔ عیسائیوں کے کارناموں سے واقف ہوا اور مسلمانوں کی عظیم الشان فتوحات نے مجھے متعجب کر دیا۔

اور ان واقعات نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، کیا واقعی انسان اتنا عظیم، ہوشیار اور طاقتور ہونے کے باوجود اتنا کمین اور ذلیل بھی ہوسکتا ہے، کبھی تو کوئی دیوتا یا اوتار معلوم ہوتا ہے اور کبھی پورا شیطان، یہ تضاد کیوں؟ ابتدا میں تو میں کچھ بھی سمجھ ہی نہ سکا کہ اصول اور قوانین کیا ہیں اور جنگیں کیوں ہوتی ہیں۔ انسان کیوں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ بہر حال میں جب جنگوں کی تفصیل اور ان کے اسباب سے واقف ہوا تو میرا دل نفرت وحقارت سے پُر ہو گیا۔ افوہ! انسان، جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے، کس قدر ظالم وخود غرض ہے۔

میرے پڑوسیوں کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ فیلکس عبرانی خاتون کو نئی نئی باتیں سکھاتا تھا۔ میں غور سے سنتا اور اس طرح سماج اور انسانوں کے طور طریقوں سے واقف ہوا۔ برادری اور قومیت کے معنی سمجھے۔ انسانی فرقوں کے مظالم اور مظلومیت سے واقف ہوا۔ چھوت اور اچھوت کا فرق جانا۔ شریف اور کمین کے معنی سمجھے۔

اور ان تفصیلات نے مجھے خود اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا اور میں نے جانا کہ انسانی برادری میں خاندانی، مشہور اور امیر آدمی کی ہی زیادہ عزت کی جاتی ہے اور وہ جو نہ خاندانی ہے اور نہ امیر، دوسروں کا غلام ہوتا ہے جب تک زندہ رہتا ہے امیروں کی خدمت کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ وہ غلام وذلیل پیدا ہوا ہے اور غلام اور ذلیل ہی مرتا ہے۔ وہ لوگ جو امیر ہوتے ہیں اور شریف کہلاتے ہیں نچلے طبقے کو اپنا غلام بنائے رکھتے ہیں، وہ جو محلوں میں رہتے ہیں۔ جھونپڑی میں رہنے والوں پر مظالم ڈھاتے ہیں اور اس کے باوجود عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ امیر وغریب، آقا وغلام، شریف اور ذلیل، اعلیٰ اور ادنیٰ...... لیکن خود میں کیا کہوں؟ میں اپنے آپ سے ناواقف تھا۔ میں کون تھا؟ کیوں اور کس طرح پیدا کیا گیا تھا؟ میرا پیدا کرنے والا کون تھا؟ یہ سب میں اس وقت نہ جانتا تھا۔ لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ میرے پاس دولت نہ تھی۔ میرے عزیز واقربا نہ تھے۔ میں کسی کا اور کوئی میرا دوست نہ تھا۔ میرا خاندان نہ تھا اور میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ میرے خالق نے میرے اوپر ظلم کیا تھا۔ میری صورت شکل بھیانک تھی۔ میرا قد وقامت دیو جیسا تھا اور ہے۔ میں انسان نہیں۔ میں انسانوں سے مختلف ہوں۔ میں انسان نہیں ہوں۔ یقیناً نہیں ہوں۔ میں انسانوں سے زیادہ پھرتیلا اور طاقتور ہوں۔ میں کچی اور کیسی بھی غذا کھا کے زندہ رہ سکتا ہوں۔ سردی، گرمی اور بارشیں میرے لئے اتنی تکلیف دہ نہیں جتنی انسانوں کے لئے۔ میرا قد ہر انسان سے بڑا ہے۔ میرے اعضاء بے ڈھنگے ہیں۔ ہاتھ پاؤں لانبے ہیں، میری کھوپڑی اوپر سے چپٹی ہے اور صورت بھیانک۔ چنانچہ میں نے اپنے متعلق سوچا۔ خوب غور کیا لیکن ایک جاندار بھی ایسا خیال میں نہ آیا جو مجھ سے ملتا جلتا ہوتا۔ تو پھر میں کیا کہوں؟ عفریت، بھوت، شیطان؟ میں یہ سب کچھ ہوسکتا ہوں لیکن انسان قطعی نہیں ہوں۔

کیونکہ انسان تو مجھ سے ڈرتا ہے نفرت کرتا ہے مجھ سے۔

اے میرے خالق! تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان خیالات نے مجھے کس قدر اداس کر دیا۔ میں نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ میرے علم میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ہی میری اداسی بھی بڑھتی گئی۔ میں جتنا زیادہ سمجھنے لگتا اتنا ہی زیادہ مغموم ہوتا، کاش کہ میں انجلو اسٹیڈ والے جنگل میں رہا ہوتا اور بھوک اور پیاس کے علاوہ کچھ اور محسوس نہ کرتا، کچھ اور سمجھ نہ سکتا۔

علم اس قدر عجیب چیز ہے اور یہ چیز اچھی بھی ہے بری بھی۔ علم اوروں کے لئے ممکن ہے اچھا ثابت ہوا ہو۔ میرے لئے تو وہ برا ہی ثابت ہوا۔ کاش میں جاہل رہا ہوتا۔ کاش میں نے بولنا اور سمجھنا نہ سیکھا ہوتا...... بہر حال میرا علم بڑھتا گیا۔ سمجھ بوجھ بڑھتی گئی۔ خیالات واضح ہوتے گئے۔ میری حسیں بیدار ہوتی گئیں اور میں زیادہ سے زیادہ اداس ہوتا گیا۔ میں نے کچھ نہ سمجھنے اور کچھ نہ سوچنے کی کوشش کی۔ لیکن اب یہ بات ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اپنے خیالات سے اور اپنی اداسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ باقی رہ گیا تھا...... موت...... لیکن میں موت کو سمجھتا نہ تھا اور اب تک سمجھ نہیں سکا ہوں۔ اپنے پڑوسیوں کی آپس کی محبت اور ہمدردی سے میں بے حد متاثر تھا۔ لیکن ان کے سامنے جانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں انسان نہ تھا۔ میری شکل وصورت بھیانک تھی۔ میرا قد وقامت ہیبت ناک تھا۔ میں ان کی باتیں سنتا تھا لیکن ان سے باتیں نہ کر سکتا تھا۔ میں ان کے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھا۔ میں دنیا میں اکیلا تھا اور اب بھی ہوں، کوئی دوسرا ایسا نہیں جو میری طرح ہو اور مجھ سے نہ ڈرے میں اکیلا و بے خانماں اور بے قبیلہ ہوں، انسان مجھ سے ڈرتے اور مجھے ضرر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ، اپنے گھر بلکہ اپنی دنیا میں بھی نہیں رکھ سکتے کیونکہ میں انسان نہیں ہوں، سب کچھ ہوں انسان نہیں ہوں۔ ایگتھا کی میٹھی باتیں، راحیل کے مسحور کن گیت اور بوڑھے کی محبت میرے لئے نہ تھی میں ان میں سے نہ تھا جو انسانی برادری کا فرد نہیں دنیا میں میرا ثانی نہیں، ہم قبیلہ نہیں، ہم نوا اور ہمسفر نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ اکیلا...... اکیلا۔

اور پھر فیلکس نے عبرانی خاتون کو دوسری باتیں سکھائیں۔ عبرانی خاتون کے ساتھ ہی ساتھ میں نے بھی یہ باتیں سیکھیں اور میری اداسی اور بھی بڑھ گئی۔ مرد اور عورت تعلقات، شادی اور بچے اور میں نے جانا کہ اولاد زندگی میں عجیب مسرتیں لاتی ہے۔ میں نے جانا کہ اولاد کی محبت کیسی ہوتی ہے، مامتا کیا ہوتی ہے۔ بیٹے اور بیٹیاں کیا ہوتی ہیں۔ بھائی بہن کیا ہوتے ہیں، آرزوئیں امیدیں کیا ہوتی ہیں۔ شادی کیوں کی جاتی ہے۔ کس طرح شادی کے ذریعے آدمی اپنا جیون ساتھی حاصل کر لیتا ہے۔

کس طرح شادی کے ذریعہ دو خاندان ایک ہو جاتے ہیں۔ کس طرح عورت اور مرد کی زندگیوں میں بہاریں آتی ہیں اور مسرت کے پھول کھلتے ہیں۔

لیکن میرا خاندان کہاں ہے؟ میرے دوست اور رشتہ دار کہاں ہیں؟ جس نے اپنے رحم میں مجھے نو مہینے تک رکھا ہو اور پھر مجھے اپنی محبت بھری آغوش میں لیا ہو۔ کسی نے مجھے پیار سے نہیں بلایا، کسی نے میرے گال نہیں چومے۔ میں بے ماں باپ کے پیدا کیا گیا اور جیسا ہوں ایسا ہی پیدا کیا گیا۔ مجھے اپنی پیدائش یاد نہیں۔ وہ زمانہ اور اس کا کوئی واقعہ یاد نہیں۔ میری پیدائش اور اس دور کے سارے واقعات ماضی کے قبرستان میں دفن ہیں البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایسا ہی پایا جیسا کہ آج ہوں..... تو پھر میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ اور یہ سوالات تھے جو مجھے پریشان کئے ہوئے تھے اور بعض اوقات میں آہستہ آہستہ کراہنے لگتا تھا۔

یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ اس قسم کے خیالات نے میری طبیعت پر کیا اثر کیا۔ پہلے آپ میرے پڑوسیوں کی کہانی سن لیں۔ یہ بے حد ضروری ہے اس کے بغیر میری داستان ادھوری رہ جائے گی۔ یہ میرے پڑوسیوں کی کہانی ہی تھی جس کے ذریعے میں محبت سے متعارف ہوا اور میرے دل میں ان جذبات نے جنم لیا جن سے میں ناواقف ہوں۔



چودھواں باب

بوڑھے کا نام دلاسی تھا اور وہ فرانس کے ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ بڑی عزت کی زندگی گزار رہا تھا اور خاصا امیر تھا چنانچہ فیلکس اپنے وطن کی اعلیٰ سوسائٹی میں پلا اور بڑھا۔ ایگیتھا بھی شریف خواتین کی صحبت میں رہتی تھی اور سب اس سے محبت کرتے تھے۔ میری آمد سے چند مہینوں پہلے ہی وہ پیرس میں رہتے تھے اور بڑے آرام وسکون کی زندگی گزار رہے تھے۔

راحیل کا باپ دلاسی کی تباہی کا باعث ہوا۔ وہ ایک یہودی تاجر تھا اور کئی برسوں سے پیرس میں ہی مقیم تھا۔ اچانک یوں ہوا کہ کسی وجہ سے، جو میں معلوم نہ کر سکا، حکومت فرانس نے اسے گرفتار کر کے زنداں میں ٹھونس دیا۔ جس دن وہ گرفتار کیا گیا اسی دن راحیل قسطنطنیہ سے پیرس آئی تھی۔ راحیل کے باپ پر مقدمہ چلا اور آخر کار اس کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی۔ یہ سزا بلا تحقیق اور اتنی جلد سنادی گئی تھی کہ لوگوں کو اس میں حکومت کی زیادتی اور تعصب نظر آیا۔ اور یہ افواہ عام ہوگئی کہ یہودی تاجر کا کوئی جرم نہیں بلکہ اس کا مذہب اور بے پناہ دولت اس کی موت کا باعث ہوئی ہے۔

اتفاقاً فیلکس عدالت میں موجود تھا۔ وہ نوجوان اور جوشیلا تھا۔ چنانچہ حکومت کی ناانصافی کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ بہر حال راحیل کے باپ کو آزاد کرالے گا...... زنداں میں داخل ہونے کی کئی ایک ناکام کوششوں کے بعد فیلکس نے ایک چھوٹا سا روشندان تلاش کر لیا جس کے ذریعہ اس زنداں میں روشنی اور ہوا پہنچتی تھی۔ جہاں بدقسمت یہودی اپنی موت کا منتظر تھا۔ اسی رات فیلکس چھپ چھپا کے روشندان تک پہنچا اور یہودی سے گفتگو کی اور اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ یہودی نے حیران اور خوش ہو کے وعدہ کیا کہ وہ اس خدمت کے صلے میں فیلکس کو ہر وہ چیز دے ڈالے گا جو فیلکس اس سے طلب کرے گا۔ فیلکس نے جواب دیا کہ وہ کسی لالچ سے ایسا نہیں کر رہا ہے۔ لیکن جب س نے راحیل کو دیکھا جو اپنے باپ سے ملنے آئی تھی، تو وہ اسے دل دے بیٹھا اور اس نے سوچا کہ واقعی اپنی خدمت کا صلہ مل سکتا ہے۔

یہودی بے حد ہوشیار تھا۔ چنانچہ اسے یہ معلوم کرتے دیر نہ لگی کہ اس کی حسین بیٹی اس جوشیلے نوجوان کے دل پر قبضہ جما چکی ہے۔ چنانچہ اس نے قسموں پر قسمیں کھا کر فیلکس کو یقین دلایا کہ اگر وہ آزاد ہو کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ گیا تو اپنی بیٹی کا ہاتھ فیلکس کے ہاتھ میں دے دے گا۔ فیلکس بے حد شرمیلا تھا چنانچہ اس نے یہودی کی ان قسموں کا جواب محض خاموشی سے دیا تاہم وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ

سکا کہ اگر وہ یہودی کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تو خود اس کی زندگی میں بہار آ جائے گی۔ یہودی کو آزاد کرانے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ انہیں دنوں میں فیلکس کو کئی خطوط ملے جو راحیل نے اپنے ایک نمک خوار ملازم سے فرانسیسی زبان میں لکھوائے تھے۔ ان خطوط میں اس نے فیلکس کا شکریہ ادا کر کے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ ان محبت ناموں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

اے میرے خالق! راحیل کے ان خطوط کی صحیح نقل میرے پاس موجود ہے۔ جب میں اس اصطبل میں پناہ گزیں تھا تو بولنے اور پڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ مجھے لکھنا سیکھنے کا شوق بھی ہوا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے یہی خطوط حاصل کر کے ان کی نقل کی تھی۔ اپنی کہانی سنانے کے بعد ان خطوط کی نقل تم کو دکھاؤں گا تاکہ تم یہ سمجھ لو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں جھوٹ نہیں۔ چونکہ وقت بہت کم ہے اس لئے میں راحیل کے خطوط کا خلاصہ سنانے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ بعد میں تم یہ خطوط پڑھ لینا۔

راحیل نے لکھا تھا کہ اس کی ماں مذہباً عیسائی تھی جو کنیز کے طور پر پتہ نہیں کون سے بازار میں بکی تھی۔ وہ چونکہ بے حد حسین تھی اس لئے راحیل کے باپ کا دل اس پر آ گیا اور اس نے اپنی کنیز سے شادی کر لی۔ راحیل نے اپنے خطوط میں اپنی والدہ کے بلند اخلاق اور شرافت کی بہت زیادہ تعریف کی ہے چونکہ وہ عیسائی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی بیٹی کو بھی اسی مذہب کی تعلیم دی، اس خاتون کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس کی تعلیم راحیل کے دل و دماغ پر اپنا اثر جما چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عیسائیت کی پیرو اور کنیز ہے، باپ کی سختیاں اسے اپنے مذہب سے پھیر نہ سکیں۔ وہ کسی عیسائی نوجوان سے شادی کر کے آزاد ہونے اور اپنے مذہب کو محفوظ کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

یہودی تاجر کی موت کا دن مقرر ہو چکا تھا جس دن اس کی گردن ماری جانے والی تھی اس سے پہلے یہودی تاجر پیرس سے بہت دور پہنچ چکا تھا۔ فیلکس اپنے باپ، بہن اور خود اپنے نام کا پاسپورٹ بنوا چکا تھا۔ چنانچہ تاجر فیلکس کے باپ دادا کے اور راحیل اکیتھا کے بھیس میں فیلکس کے ساتھ پیرس سے نکل گئے۔

فیلکس یہودی تاجر اور اس کی بیٹی کو لے کر ''لی اون'' اور وہاں سے لگ ہارن پہنچا اور وہاں یہودی نے اس وقت تک قیام کرنے کا فیصلہ کیا جب تک کہ اسے ترکستان کی سرحد میں داخل ہونے کا موقع نہیں مل جاتا۔

راحیل اپنے باپ کے ساتھ ہی تھی اور منتظر تھی کہ یہودی بہت جلد اس کا ہاتھ حسب وعدہ، فیلکس کے ہاتھ میں دے دے گا اور خود ترکستان سے ہوتا ہوا کسی طرف نکل جائے گا۔

اس عرصے میں وہ دونوں، فیلکس اور راحیل، ایک دوسرے کی محبت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان کی محبت بڑھتی گئی اور وہ دونوں اس وقت کے خواب دیکھتے رہے جب وہ ایک دوسرے

کے ہو جائیں گے چونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف تھے اس لئے اشاروں میں باتیں کیا کرتے تھے۔

عیار یہودی فیلکس اور راحیل کے میل ملاپ پر ذرا بھی اعتراض نہ کرتا بلکہ اس کے برخلاف اپنی باتوں سے وہ ان کی امیدیں اور بڑھاتا۔ لیکن وہ دل میں کچھ اور ہی ارادہ کر چکا تھا۔ اسے عیسائیوں سے سخت نفرت تھی اور وہ یہ کسی طرح گوارہ کر ہی نہ سکتا تھا کہ اس کی بیٹی ایک عیسائی کی بیوی بنے۔ لیکن فی الحال اسے خاموش رہنے میں ہی اپنی بہتری نظر آتی تھی۔ کیونکہ جانتا تھا کہ فیلکس چاہے تو اسے دوبارہ حکومت کے حوالے کر سکتا ہے۔ بہر حال بظاہر وہ فیلکس سے خوش اور اس کا احسان مند رہا لیکن وہ اپنی بیٹی کو لے کر ایک دن خاموشی سے نکل جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ پیرس کی خبروں نے یہودی کے ارادے کو تقویت پہنچائی۔

یہودی کے فرار نے فرانسیسی حکومت کو برہم کر دیا اور اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے یہودی کو فرار ہونے میں مدد دی تھی، عبرت انگیز سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ فیلکس کا راز فاش ہوتے دیر نہ لگی۔ ڈلاسی اور ایگتھا گرفتار کر لئے گئے۔ یہ خبر فیلکس تک پہنچی اور وہ جیسے ایک حسین خواب دیکھتے دیکھتے دفعتہً بیدار ہو گیا۔ اس خیال نے اسے بے چین و پریشان کر دیا کہ وہ راحیل کی محبت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس کا باپ اور بہن زنداں میں تھے، چنانچہ اس نے یہودی تاجر سے اس معاملے میں گفتگو کی۔ دونوں میں طے پایا کہ موقع ملتے ہی یہودی ترکستان کی سرحد میں داخل ہو جائے گا لیکن راحیل لگ ہارن میں ہی فیلکس کی واپسی کا انتظار کرے گی۔ چنانچہ وہ راحیل سے رخصت ہو کر پیرس پہنچا اور اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کر دیا اور اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے حکومت سے درخواست کی کہ اس کا باپ اور بہن بے گناہ ہیں چنانچہ انہیں رہا کر دیا جائے۔

لیکن ڈلاسی اور ایگتھا کو رہا نہ کیا گیا۔ پانچ مہینوں تک وہ تینوں تاریک زنداں میں بند رہے۔ چھٹے مہینے وہ تینوں عدالت میں پیش کیے گئے۔ فیصلہ سنایا گیا ان کی جائداد ضبط کر کے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیا جائے۔

وہ لوگ فرانس سے نکل کر جرمنی آئے اور اس جھونپڑی میں رہنے لگے جہاں میں نے انہیں پایا تھا۔ فیلکس کو معلوم ہوا کہ یہ سنتے ہی کہ ڈلاسی، ایگتھا اور فیلکس ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیئے گئے ہیں۔ مکار یہودی راحیل کو لے کر اٹلی سے رخصت ہوا اور ایک حقیر سی رقم فیلکس کو اس کے احسان کے صلے میں بھجوا دی۔

چنانچہ یہ واقعات تھے جو فیلکس اور اس کے باپ اور بہن کو اداس اور ملول رکھتے تھے۔ فیلکس سب سے زیادہ دکھی تھا۔ وہ جلاوطنی اور غریبی کو برداشت کر سکتا تھا لیکن راحیل کی جدائی ناقابلِ

برداشت تھی اگر وہ اکیلا ہوتا تو یقیناً خودکشی کر لیتا۔ لیکن اندھے باپ اور بہن کے خیال نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

ادھر فیلکس اور اس کے خاندان کی جلاوطنی کی خبر جب لگ ہارن پہنچی تو یہودی بہت خوش ہوا اور راحیل کو مجبور کیا کہ وہ اس بے دین عیسائی کا خیال اپنے دل سے نکال دے اور یہودی کے ساتھ چلی چلے۔ راحیل کو اپنے باپ کی یہ احسان فراموشی اور وعدہ خلافی بری معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے باپ کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن یہودی نے اس کی ایک نہ سنی اور پیر پٹختا کمرے سے باہر چلا گیا۔

چند دنوں بعد وہ بے حد گھبرایا ہوا کہیں باہر سے آیا اور راحیل کو بتایا کہ اس کا راز کھل گیا ہے اور یہ کہ حکومت اٹلی اسے حکومت فرانس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر چکی ہے، چنانچہ وہ قسطنطنیہ جانے والے ایک جہاز میں اپنے لئے ایک جگہ مخصوص کرا چکا تھا اور چند گھنٹوں میں ہی لگ ہارن سے روانہ ہو جانے والا تھا۔ اور راحیل اور اپنی ساری دولت کو اپنے معتبر ملازم کے حوالے کئے جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ بعد میں یہ ملازم راحیل اور اس کی دولت کو یہودی تک پہنچا دے گا۔

چنانچہ وہ چلا گیا۔ اب راحیل واقعات پر غور کرنے لگی۔ وہ بہرحال فیلکس کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اتفاقاً اپنے باپ کے چند کاغذات اس کے ہاتھ لگ گئے۔ ان کاغذات کے ذریعہ اسے اپنے محبوب کی جلاوطنی کا حال معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ کہاں تھے۔ چند دنوں تک شش و پنج کے عالم میں رہنے کے بعد اس نے آخری فیصلہ کر لیا اور وہ چند قیمتی زیوارت جو اس کی والدہ کی نشانی تھے، لے کر ایک ملازمہ کے ساتھ اٹلی سے چل پڑی اور سیدھے جرمنی کا راستہ لیا۔ سفر کرتے ہوئے وہ اس بستی میں پہنچی جو فیلکس کی قیام گاہ سے بیس میل دور تھی۔ وہاں اس کی وفادار ملازمہ اچانک بیمار ہو گئی۔ راحیل نے اس کی تیمارداری اور علاج معالجے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن ملازمہ جانبر نہ ہو سکی اور چند دنوں کی علالت کے بعد انتقال کر گئی۔ راحیل اجنبی ملک اور اجنبی لوگوں میں جن کی زبان وہ جانتی نہ تھی اکیلی رہ گئی۔ لیکن وہ لوگ، جن کے یہاں راحیل نے قیام کیا تھا اور جہاں ملازمہ کا انتقال ہوا تھا، بے حد شریف اور رحمدل تھے۔ چنانچہ انہوں نے راحیل کو دلاسی کی قیام گاہ تک بہ حفاظت پہنچا دینے کا انتظام کر دیا اور اس طرح وہ حسین عبرانی خاتون اپنے محبوب کے گھر تک پہنچی۔



پندرھواں باب

تو ایسی تھی میرے پڑوسیوں کی کہانی۔

بوڑھے ولاسی، فیلکس اور ایگتھا نے شکایت کا ایک لفظ تک زبان پر لائے بغیر جس طرح غربت اور جلاوطنی کی زندگی نہایت صبر وسکون سے قبول کر لی تھی۔ اس نے میرے دل میں ان کی عزت اور محبت اور بھی بڑھادی اور اس طرح میں اپنے پڑوسیوں کی شرافت اور انسان کی مکاّرنی سے واقف ہوا۔

لیکن اب تک میرا واسطہ کسی طرح کی مکاری اور شیطنت سے نہ پڑا تھا یہ وہ صفات تھیں جن سے میں براہ راست واقف نہ ہوا تھا اور نہ ہی اپنے آپ میں ان کا عنصر پاتا تھا۔ اس وقت تک میں نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم اور فرشتے کی طرح پاک تھا۔ چنانچہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ اس وقت تک میری سمجھ بوجھ مکمل نہ ہوئی تھی۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو اسی سال اگست میں ہوا تھا۔ یہ واقعہ میری فہم وادراک کی بتدریج ترقی کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

ایک رات میں حسب معمول قریب کے جنگل میں اپنے لئے غذا اور پڑوسیوں کے لئے لکڑیاں حاصل کرنے کے لئے گیا۔ وہاں مجھے ایک تھیلا پڑا ہوا ملا۔ جو غالباً کسی مسافر کے سامان میں سے گر گیا تھا۔ تھیلے میں کپڑے تھے اور کتابیں تھیں۔ ان چیزوں کو پا کر میں یوں خوش ہو گیا گویا مجھے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ میں وہ تھیلا لے کر اپنی پناہ گاہ میں آ گیا۔ خوش قسمتی سے کتابیں اس زبان میں لکھی گئی تھیں جو میں نے اپنے پڑوسیوں سے سیکھی تھی۔ ان میں سے ایک کتاب ''فردوس گم گشتہ'' دوسری پوتارک کی ''کتاب السیر'' اور تیسری ''وارتبر کے اعترافات یا غم'' تھی۔

اسی دن سے میں ان کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں نے مجھ پر کیا اثر کیا۔ میرے تصورات کو پر لگ گئے۔ احساسات اور خیالات کی نئی نئی راہیں کھل گئیں۔ یہ خیالات اور احساسات کبھی مجھے خوش کر دیتے اور اکثر اداس ''وارتبر کے اعترافات یا غم'' نامی کتاب کی کہانی سیدھی سادی تھی۔ لیکن اس میں ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جن سے میں واقف تھا اور ان موضوعات پر بحث کی گئی تھی جو اس وقت تک میری نظر میں اہم نہ تھے۔ کتاب کے ہر کردار کا موازنہ میں نے خود اپنی ذات سے کیا۔ لیکن ایک کردار بھی مجھ جیسا نہ تھا۔ میں بدصورت ہوں اور میرا قد دیو جیسا ہے۔ کتب کا ایک بھی کردار ایسا نہ

تھا.....تو پھر میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے اپنی زندگی کا سفر کب، کس طرح اور کہاں سے شروع کیا؟ اور یہ سفر کہاں جا کر ختم ہوگا؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کے جواب میرے پاس نہ تھے یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میں ان سوالات کے جواب دینے کے قابل نہ تھا۔

پلوتارک کی ''کتاب السیر'' قدیم روم و یونان کے مشاہیر کی سوانح حیات، جنگوں اور قدیم تہذیب کی داستان ہے۔ اس کے مطالعہ کا اثر مجھ پر مختلف ہوا۔ وارتبر نے مجھے اداسی، مایوسی، قنوطیت سے متعارف کرایا تھا۔ خودکشی اور موت کے واقعات پڑھ کے میں حیران ہوگیا تھا۔ پلوتارک نے مجھے بہادروں کی محبت اور ان کی عزت کرنا سکھایا۔ بہت سی چیزوں کو جن کا ذکر اس کتاب میں ہے، میں نہ تو سمجھ سکا اور نہ ان کا تصور ہی کر سکا۔ سلطنتوں کی تفصیل نے مجھے الجھا دیا۔ وسیع ممالک، طوفانی ندیوں اور ناپید کنارے، سمندروں سے میں واقف نہ تھا۔ کیونکہ یہ چیزیں میں نے دیکھی ہی نہ تھیں۔ آباد شہروں، سڑکوں پر بہتا ہوا انسانوں کا سیلاب، ہجوم، گہما گہمی اور ایسی بہت سی چیزیں تھیں جن کا میں تصور نہ کر سکا۔ میری دنیا تو بے حد مختصر تھی۔ اصطبل جہاں میں پناہ گزیں تھا، میرے چار پڑوسی اور وہ جنگل جہاں سے میں اپنی غذا حاصل کرتا تھا۔ یہ تھی میری دنیا۔ اسی دنیا میں رہ کر میں نے ہر چیز کی ابجد سیکھی تھی۔ یہیں رہ کر میں نے اپنی آواز اور زبان کا استعمال سیکھا تھا۔ یہیں مین نے اپنے فہم و ادراک کو سمجھا تھا اور یہیں میں نے اپنے آپ کو سمجھنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ لیکن پلوتارک نے مجھے ایک عالم کی سیر کرائی۔ میں حکومت کے دبدبے اور تمکنت، شاہانہ جلال، خونخوار جنگوں اور بہادرانہ کارناموں سے واقف ہوا۔ اس کتاب کے ذریعہ میں حسد و رقابت اور دوستی و خلوص میں تمیز کر سکا۔ رسم و رواج، صلح اور جنگ، فتح و شکست، سکون و ابتری اور قوانین اور جرائم...... یہ وہ چیزیں تھیں جن سے پلوتارک نے مجھے متعارف کرایا۔

میں شرافت اور محبت کو پسند و کمینگی اور حسد و رقابت کو ناپسند کرنے لگا۔

اب رہی ملٹن کی کتاب ''فردوس گم گشتہ'' تو اس نے مجھ پر ایک انوکھا ہی اثر کیا۔ اس کتاب کو بھی میں نے پہلی دو کتابوں کی طرح حقیقی واقعات پر مبنی سمجھ کر پڑھا اور خدا کا تصور کیا۔ قادر مطلق، پر عظمت، بڑی قوتوں والا رحیم و کریم، غفار، جبار اور قہار......جس کے سامنے سبھی جھکتے ہیں جسے سبھی سجدہ کرتے ہیں۔ اس کتاب کے بہت سے حصے مجھے اپنی ہی داستان معلوم ہوئے۔ مثلاً آدم کا واقعہ جسے خدا نے بنایا تھا۔ آدم کی طرح میرا سلسلہ بھی کسی سے نہیں ملتا۔ کم سے کم یہ ایک بات تو مجھ میں اور آدم میں مشترک ہے لیکن دوسری باتوں میں ہم مختلف ہیں۔ آدم کو خدا نے متناسب الاعضاء اور خوبصورت بنا کے اسے مسرتیں بخشیں اور خود وہ اپنے آدم کا محافظ ہوا۔ آدم اپنے بنانے والے سے گفتگو کر سکتا تھا، اسے علم اور سمجھ بوجھ عطا کی گئی تھی فرشتوں نے اسے سجدہ کیا تھا، آدم عظیم تھا......اس

کے برخلاف میرا خالق مجھ سے ڈرتا تھا، اس نے مجھے مسرتیں بخشنے کے بجائے تنہائی اور بے چارگی بخشی مجھے خوبصورت بنانے کے بجائے ہیبت ناک بنایا ہے۔ میرا خالق میرا محافظ نہیں ہے۔ بلکہ اس نے مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ اے میرے خالق! میں نے اپنا موازنہ شیطان سے کیا اور حیرت ہے کہ اس میں اور مجھ میں بہت سی باتیں مشترک نظر آئیں۔ اس سے بھی نفرت کی جاتی ہے اور مجھ سے بھی۔ اس سے بھی لوگ ڈرتے ہیں اور مجھ سے بھی۔ وہ بھی نکالا ہوا ہے اور میں بھی، چنانچہ اے میرے خالق! میرے دل میں بھی آدم اور اولاد آدم کے خلاف نفرت وحقارت اور انتقام کا وہی لاوا ابلنے لگا جو شاید شیطان کے دل میں ابل رہا ہوگا، یا ابلا ہوگا۔

اصطبل میں پناہ لینے کے چند دنوں بعد میں نے ان کپڑوں کی، جو میں نے تمہاری تجربہ گاہ سے حاصل کئے تھے، تلاشی لی تھی تو ان میں سے کچھ کاغذات ملے تھے۔ لیکن اس وقت چونکہ میں پڑھنا جانتا ہی نہ تھا اس لئے وہ کاغذات میں نے جوں کے توں جیبوں میں ٹھونس دیئے تھے۔ لیکن اب جب کہ میں نے پڑھنا اور بولنا سیکھ لیا تھا۔ مجھے وہ کاغذات یاد آئے۔ ان کاغذات پر کی تحریر اسی زبان میں تھی جو میں جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے شوق سے ان کاغذات کا مطالعہ کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ تمہارا ان دنوں کا روزنامچہ تھا۔ جبکہ تم مجھے بنا رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس روزنامچے میں تم نے اپنے گھر، وطن اور عزیزوں کا ضمناً ذکر کر دیا تھا۔ یقیناً بعد میں تم نے اس روزنامچے کو تلاش کیا ہوگا۔ دیکھو! یہی ہے نا وہ روزنامچہ؟ اس میں ہر وہ بات درج ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح میرے لعنتی وجود سے ہے۔ میری شکل وصورت اور قد وقامت کی تصویر تم نے لفظوں میں کھینچی۔ میں کس قدر گھناؤنا اور کریہہ المنظر ہوں یہ مجھے تمہارے روزنامچے سے معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تم خود بھی دیکھ کر لرز اٹھے تھے۔ میں نے تمہارا روزنامچہ پڑھا اور، زیادہ اداس ہوگیا۔

''لعنت ہو اس دن پر جس کو میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔'' میں نے انتہائی غصہ سے تلخی سے سوچا ''اے میرے خالق! تو نے کیوں مجھے ایسا بنایا کہ خود تو بھی مجھ سے نفرت کرنے لگا؟ تو نے کیوں مجھے انسان کے بجائے بھیانک دیو کا روپ دیا؟ تیرے خدا نے تو آدم کو ایسا نہ بنایا تھا..... تو نے ایسا کیوں بنایا؟ میری شکل وصورت انسانی شکل وصورت کا نہایت بھیانک مذاق ہے اور میرا قد وقامت انسانی قد وقامت کی نہایت بھونڈی نقل۔ مجھے بنا کے تو نے بنی نوع انسان کا مضحکہ اڑایا ہے۔ خیر۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن تو نے مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا...... یہ کہاں کا انصاف ہے؟ آدم تو اکیلا نہ تھا۔ پہلے سے ہی شیطان موجود تھا جس سے آدم گفتگو کر سکتا تھا۔ یا پھر اپنے خالق کے لطف وکرم سے ہشاش بشاش رہتا تھا۔ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا تھا۔ لیکن میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ اے میرے خالق! بجائے اس کے کہ تو مجھ سے محبت کرتا الٹا مجھ سے نفرت کرنے لگا

حالانکہ میں تیرا آدم ہوں۔"

تو ایسے تھے میرے خیالات اور یوں سوچا تھا میں نے۔ میں ناامید اور اداس تھا۔ لیکن جب میں نے اپنے پڑوسیوں کی شرافت اور خلوص پر غور کیا تو میرے دل میں امید کی شعاع رینگ آئی۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ جب میرے پڑوسی مجھ سے مانوس ہو جائیں گے، جب انہیں معلوم ہوگا کہ میں ان کی کتنی عزت کرتا ہوں اور ان کی شرافت اور خوش اخلاقی سے کتنا مرعوب ہوں، اور جب وہ میری کہانی سنیں گے تو انہیں مجھ پر رحم آ جائے گا اور وہ مجھ سے نہ ڈریں گے۔

کم سے کم یہ لوگ۔ میں نے سوچا "اتنے بداخلاق اور ظالم نہیں ہیں، کہ اس ذی روح کو، جس کا دنیا میں کوئی نہیں، دھتکار دیں، یقیناً یہ لوگ میری ہیبت ناکی کو نہ دیکھیں گے بلکہ میری بے کسی اور تنہائی سے متاثر ہو کر مجھے پناہ دیں گے۔ کیونکہ میں ان کی دوستی اور ہمدردی کا محتاج ہوں۔ یقیناً یہ لوگ مجھے اپنے گھر سے نکال باہر نہ کریں گے۔ مجھے ان سے ایسی توقع نہیں کیونکہ یہ لوگ اتنے گرے ہوئے نہیں ہیں۔"

چنانچہ ایسے خیالات تھے جنہوں نے میری ڈھارس بندھائی اور میں اپنے پڑوسیوں سے ملنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ لیکن مہینوں تک اپنے اس ارادے کو جامۂ عمل نہ پہنا سکا۔ جلد بازی سے سارے معاملے بگڑ جانے کا خوف تھا۔

اس عرصے میں میرے ہمسائے میں چند نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ راحیل کی موجودگی نے جھونپڑی کے باسیوں میں گویا نئی روح پھونک دی تھی۔ اب وہ لوگ خوب ہنسی ہنستے اور قہقہے لگاتے تھے۔ حالانکہ وہ لوگ غریب تھے تاہم اپنے حالوں خوش اور مطمئن تھے۔ اس کے برخلاف میری بے چینی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے علم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی بدصورتی اور تنہائی کا احساس شدت اختیار کرتا گیا اور جب میں نے اپنا عکس پانی میں دیکھا تو امید کی وہ ہلکی سی شعاع، جو میرے دل میں رینگ آئی تھی، بجھ گئی اور پھر ایک رات، اور وہ چاندنی رات تھی، میں نے اپنا زبردست سایہ زمین پر دیکھا۔ اف! میں کتنا بھیانک ہوں...... نت نئے اندیشوں نے میرے دل میں سر اٹھایا۔

میں نے ان اندیشوں کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس امتحان کی تیاری کرنے لگا جو ہمیشہ کے لئے میری قسمت کا فیصلہ کر دینے والا تھا۔ کبھی تو مجھے اپنا مستقبل خوشگوار روشن نظر آتا اور کبھی اداس و تاریک تصور مجھے متضاد تصویریں دکھاتا۔ کبھی تو میں دیکھتا کہ میرے پڑوسی مجھ سے ڈر کے بھاگ گئے ہیں اور کبھی دیکھتا کہ وہ بڑی ہمدردی سے میری کہانی سن رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں رحم کے جذبات ہیں۔ وہ مجھے تسلی دے رہے ہیں، میری ڈھارس بندھا رہے ہیں۔ میری مسرتوں اور غموں

میں شریک ہو رہے ہیں اور میں ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہا ہوں۔ میں انہی کے خاندان کا ایک فرد بن گیا ہوں...... میں مسکرانے لگتا۔ اور پھر فوراً چونک پڑتا۔ اپنے آپ کو اسی طرح ہنستا اور اداس پاتا۔ میری کوئی حوّا نہ تھی جو اس وقت مجھے تسلی دیتی۔ مجھے آدم کی دو التجائیں یاد آتیں جو اس نے تنہائی سے عاجز آ کر اپنے سے خالق کی تھیں۔ لیکن میں کس سے التجا کروں؟ کہاں تھا میرا خالق؟ وہ تو مجھے چھوڑ چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے دربار سے نکال دیا تھا۔ یا یوں کہنا مناسب ہو گا کہ وہ خود نکل گیا تھا اور مجھے اس انجان دنیا میں اکیلا چھوڑ گیا تھا...... اور میں اپنے دل میں شدید غم و غصہ محسوس کرتا اور اپنے بنانے والے پر ہزار بار لعنت بھیجتا۔

موسم تبدیل ہوا۔

درختوں کے پتے زرد پڑ گئے اور پھر جھڑنے لگے۔ میں نے حیرت اور اداسی سے پت جھڑ کو دیکھا۔ جنگل پھر اسی دن کی طرح ننگا کھڑا تھا جس دن کہ میں نے پہلی دفعہ جنگل اور چمکتے ہوئے چاند کو دیکھا تھا۔ رنگ برنگے پھولوں اور پرندوں کے چہچہے نہ رہے تو میں اپنے پڑوسیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ان کی مسرتوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ان کی خوشیاں موسم سے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ تھیں۔ چنانچہ ننگی ہوتی ہوئی قدرت ان کی خوشیوں پر اثر انداز نہ ہوئی۔ میں ان کی مسرتیں اور ایک دوسرے سے محبت دیکھتا اور خود اپنے لئے یہ چیزیں حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔ اور سوچتا کہ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی ان کی مسرتوں میں شریک ہو سکوں گا؟ کب آئے گا وہ دن جب ان شریف لوگوں کی محبت اور ہمدردی میرے لئے بھی ہو گی؟ کب آئے گا وہ دن جب میں راحیل کے سامنے بیٹھ کے اس کے گیت سنوں گا؟ یہ تو میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا......اور کرنا چاہتا بھی نہ تھا...... کہ یہ لوگ مجھ سے ڈر کے بھاگ جائیں، نہیں ایسا نہ ہو گا۔ مجھے ان سے اور کچھ نہ چاہیئے تھا۔ نہ کھانا اور کپڑا۔ مجھے ہمدردی اور محبت کی ضرورت تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ دونوں چیزیں مجھے اسی در سے ملیں گی...... کیونکہ میں ان کا مستحق تھا۔

موسم سرما شروع ہوا اور میری زندگی کا ایک سال پورا ہو کے دوسرا شروع ہوا۔

اپنے پڑوسیوں کے ملنے کے مسئلے پر دگنی شدت سے غور کرنے لگا اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ جھونپڑے میں اس دن اور اسی وقت جانا مناسب ہو گا جب وہاں بوڑھا اکیلا ہو...... یہ تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ میری بھیانک صورت ہی میری بدقسمتی کا باعث ہے۔ میں نے پچھلے واقعات پر غور کیا تو مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ گاؤں والے مجھ سے اس لئے ڈرے تھے اور انہوں نے مجھے اس لئے پتھر وغیرہ مارے تھے کہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے، لیکن بوڑھا اندھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ نہ سکے گا۔ چنانچہ میری باتیں غور سے سنے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری آواز پھٹی ہوئی اور غیر قدرتی تھی لیکن بھیانک نہ تھی۔

چنانچہ میں نے سوچا۔ اگر میں فیلکس ، ایگتھا اور راحیل کی غیر موجودگی میں بوڑھے کے پاس جاؤں تو یقیناً اس کی ہمدردیاں حاصل کرلوں گا......اور پھر رفتہ رفتہ ان تینوں کو بھی بوڑھے کے ذریعہ ہموار کر لوں گا۔

فیلکس ، ایگتھا اور راحیل گاؤں جانے کے لئے ، جو ان کی جھونپڑی سے کافی دور تھا۔ نکلے ، انہوں نے کئی گھنٹوں بعد واپس آنا تھا۔ انہوں نے بوڑھے والاسی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن اس نے انکار کردیا۔ وہ تینوں چلے گئے بوڑھا والاسی جھونپڑی میں اکیلا رہ گیا۔ اس نے ستار اٹھایا اور کوئی غمناک دھن بجانے لگا۔ وہ اس کے بعد دوسری دھن بجانے لگا۔ پھر اس نے گٹار رکھ دیا اور سر جھکا کے کسی خیال میں غرق ہوگیا۔

میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرے امتحان کی گھڑی آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی یا تو میری بدقسمتی پر نہ ٹوٹنے والی مہر لگ جانی تھی یا میری تنہائی اور اداسی کا خاتمہ ہو جانے والا تھا۔ جھونپڑی میں اور جھونپڑی کے باہر خاموشی طاری تھی۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے یہ بے حد عمدہ موقع تھا اور جب میں اپنے ارادے کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے آگے بڑھا تو میرے بدن میں لرزہ پڑ گیا اور ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ میں گر پڑا۔ بڑی کوششوں کے بعد اٹھا۔ وہ تختے ہٹائے جو میں اصطبل کے دروازے پر رکھ دیا کرتا تھا۔ چاروں طرف دیکھا کہیں ایک آدمی بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ میں نے جھونپڑی کے دروازے پر دستک دی۔ میرا دل بدستور بری طرح دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

''کون ہے؟'' بوڑھے کی آواز آئی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا یا جواب دے ہی نہ سکا۔

''اندر آ جاؤ۔''

میں جھونپڑی میں داخل ہوا۔

''بے جا مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنی آواز کو حتی الامکان نرم بناتے ہوئے کہا'' میں ایک مسافر ہوں۔ آپ کی جھونپڑی دیکھ کے اس طرف آ گیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو تھوڑی دیر کے لئے آگ کے قریب بیٹھ کے ستالوں۔''

''آ جاؤ مسافر۔'' بوڑھے نے کہا'' آپ کی خدمت کر کے میں فخر محسوس کروں گا۔ افسوس ہے اس وقت میرے بچے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور میں نابینا ہوں۔ چنانچہ کھانا وغیرہ لانے میں ذرا دیر لگے گی۔''

''آپ تکلیف نہ فرمائیں، میں اپنا کھانا ساتھ لے کر چلا ہوں۔ مجھے تو ذرا گرمی اور آرام کی

ضرورت ہے۔"

میں بیٹھ گیا۔ میں خاموش تھا۔ بوڑھا بھی خاموش تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں اپنا مدعا بیان کروں۔ میں جانتا تھا کہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور وقت کے تیزی سے گزرنے کا مجھے احساس تھا۔ لیکن نہیں جانتا تھا کہ کس طرح گفتگو کا آغاز کروں اور کیا کہوں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے نے کہا۔

"اجنبی! تم میرے ہم وطن معلوم ہوتے ہو۔ کیونکہ فرانسیسی زبان میں گفتگو کر رہے ہو......"

"جی میں فرانسیسی نہیں ہوں۔ البتہ ایک فرانسیسی خاندان کے ہمسائے میں رہتا ہوں۔ چنانچہ انہی سے میں نے یہ زبان سیکھی ہے اور صرف یہی ایک زبان ہے جس میں گفتگو کر سکتا ہوں میرے بزرگ! میں اپنے چند دوستوں کے پاس جا رہا ہوں اور انہی کے ساتھ اپنی تمام عمر گزار دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اپنے ان دوستوں کی میں بہت عزت کرتا ہوں اور انہی کے رحم و کرم سے میری تمام تر امیدیں وابستہ ہیں۔"

"کون ہیں تمہارے یہ دوست؟ جرمن؟"

"جی نہیں۔ فرانسیسی ہی ہیں۔ لیکن بہتر ہوگا کہ ہم فی الحال اس موضوع پر گفتگو نہ کریں۔ میرے بزرگ! میں ایک ٹھکرایا ہوا، تنہا اور بدقسمت آدمی ہوں اور وہ لوگ، جن کے پاس میں جانا چاہتا ہوں، مجھے جانتے تک نہیں بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میرے وجود سے بھی واقف نہیں۔ چنانچہ میں پریشان اور خائف ہوں۔ اگر ان لوگوں کی پناہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو اجنبی۔ تمہارے دوست، جیسا کہ تم کہتے ہو، اگر شریف اور رحمدل ہیں تو تمہیں مایوس نہ ہونا چاہئے۔"

"ہاں وہ لوگ بے حد شریف اور رحمدل ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی ان سا نہ ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے خوف ہے کہ وہ لوگ مجھے پسند نہ کریں گے۔ بڑے میاں! آج تک میری زندگی اس طرح گزری ہے کہ مجھ سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ میں نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا ہے اور ان کی مدد کی ہے۔ اس طرح کہ خود ان کو بھی خبر نہ ہوئی کہ یہ کون ان کی مدد کر رہا ہے۔ اس کے باوجود مجھے خوف ہے کہ مجھے دیکھتے ہی نفرت و حقارت سے وہ منہ پھیر لیں گے۔ یا مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ لوگ میرا ظاہر دیکھتے ہیں باطن نہیں۔ بجائے اس کے وہ میری باتیں سنیں۔ مجھ میں پنہاں ایک مخلص دوست کو دیکھیں اور میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں وہ یہ کرتے ہیں کہ مجھے ایک عفریت، بھوت اور شیطان سمجھ لیتے ہیں۔"

''یہ واقعی تمہاری بدقسمتی ہے مسافر۔لیکن اگر تم واقعی بے ضرر ہو تو کیا لوگوں کو اس کا یقین نہیں دلا سکتے؟''

''بس اب میں یہی کرنے والا ہوں۔لیکن میرے دل میں عجیب وغریب اندیشے سر اٹھا رہے ہیں کیونکہ نہیں جانتا کہ انجام میں کیا ہوگا؟ میں اپنے ان دوستوں سے محبت کرتا ہوں۔ان کی شرافت اور خلوص سے مرعوب ہوں، میں نے کئی مہینوں تک نہایت قریب رہ کر اپنے ان دوستوں کا مطالعہ کیا ہے حالانکہ میرے یہ دوست میری موجودگی سے بے خبر تھے۔''

''اور تمہارے یہ دوست ہیں کہاں؟''

''قریب ہی ہیں۔''

''اجنبی! اگر تم مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ اور سچ سچ بتا دو کہ یہ کیا اسرار ہے تو شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔میں اندھا ہوں اور تمہیں دیکھ نہیں سکتا لیکن تمہاری باتوں سے خلوص اور محبت کی بو آتی ہے، میں غریب الوطن ہوں، تاہم تمہاری مدد سے دریغ نہ کروں گا۔''

''کس زبان سے آپکا شکریہ ادا کروں! مجھے یقین ہے آپ کی کوششوں سے میں اپنا وہ مقام حاصل کرلوں گا جس کا میں مستحق ہوں، مجھے انسانی برادری میں...... میرا مطلب ہے...... مجھے انسانی ہمدردی کی ضرورت ہے۔میں بے حد دکھی ہوں۔''

''میرے خدا! تو کیا تم کوئی مجرم یا مفرور قیدی ہو جو ایسی باتیں کہتے اور انسانوں کے سامنے آتے ڈرتے ہو؟ اجنبی! میں بھی تمہاری طرح دکھی ہوں اور میری اولادوں کو جلاوطن کردیا گیا ہے۔حالانکہ ہم بے گناہ ہیں۔چنانچہ میں تمہارے دکھوں اور روحانی کرب کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔''

''شکریہ میرے محسن! عمر میں آج پہلی دفعہ میں نے ہمدردانہ کلمات سنے ہیں۔اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میں اپنے دوستوں کی ہمدردیاں حاصل کرلوں گا۔''

''کون ہیں یہ تمہارے دوست؟ کیا نام ہیں ان کے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور سوچا کہ یہی آزمائشی گھڑی ہے۔میری قسمت کا فیصلہ اب ہوجانے والا تھا۔اب یا تو میں زندگی کی مسرتیں حاصل کرنے والا تھا یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے محروم ہو جانے والا تھا۔میں نے بوڑھے کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی۔لیکن آواز میرے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔عین اس وقت جھونپڑی کے باہر پیروں کی چاپ سنائی دی۔فیلکس، ایگتھا اور راحیل واپس آگئے تھے۔ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ لیا اور تقریباً چیخ کر کہا۔

''میرے بزرگ! مجھے بچائیے۔آپ اور آپ کی اولاد ہی میرے وہ دوست ہیں جن کی ہمدردیوں اور محبت کی مجھے ضرورت ہے۔میں آپ ہی لوگوں کی پناہ میں آنا اور آپ ہی کی دوستی

حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے خدا! بوڑھے نے قدرے گھبرا کر کہا "کون ہو تم؟"

دفعتہً جھونپڑی کا دروازہ کھلا۔فیلکس ، ایگتھا اور راحیل دروازے میں دم بخود کھڑے تھے۔پھر ایگتھا بے ہوش ہو کر گری، راحیل بری طرح چیختی ہوئی الٹے پاؤں بھاگی اور فیلکس شیر کی طرح میری طرف لپکا۔

"مجھے بچاؤ میرے بزرگ۔مجھے بچاؤ۔"میں نے کہا اور بوڑھے کے گھٹنوں سے لپٹ گیا۔

فیلکس نے مجھے گھسیٹ کر زمین پر گرا دیا اور ایک ڈنڈے سے مجھے اندھا دھند پیٹنے لگا۔اے میرے خالق! اگر میں چاہتا تو فیلکس کا ایک ایک عضو الگ کر دیتا۔لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔میں بدقت تمام اٹھا۔فلیکس نے پھر ڈنڈا اٹھایا لیکن میں اس کا وار خالی دے کر جھونپڑی سے باہر آیا اور اس طرح کہ کسی نے مجھے نہ دیکھا، اپنی پناہ گاہ میں گھس گیا۔



سولھواں باب

لعنت ہے اس پر جس نے مجھے بنایا۔ لعنت ہے اس پر جس نے مجھے دنیا میں تنہا چھوڑ دیا...... میں کیوں زندہ رہا۔ ہاں اس واقعہ کے بعد کیوں زندہ رہا...... کیوں نہ میں نے اپنی بے حیا زندگی کا خاتمہ کر لیا؟ یہ میں نہیں جانتا...... نہیں جانتا...... البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس وقت میں بالکل ناامید نہ تھا بلکہ غم وغصہ سے پھنک رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنے پڑوسیوں کی گردنیں مروڑ دوں۔ انہیں تڑپتا دیکھوں اور خوب قہقہے لگاؤں لیکن میں نے ایسا نہ کیا...... نہ جانے کیوں؟

دن ختم ہوا۔ رات آئی۔ میں جنگل میں پہنچا اور اب میں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش نہ کی۔ میرا بدن مارے غصے کے پھنک رہا تھا اور میں نہایت بھیانک آواز میں چیختا پھر رہا تھا۔ میں اس بپھرے ہوئے درندے کی طرح ہو گیا تھا جو زنجیریں تڑا کر بھاگ نکلا ہو۔ میں ہر اس چیز کو نوچ کھسوٹ رہا تھا جو میری راہ میں حائل ہوتی تھی۔ میرے لعنتی خالق! تم تصور نہیں کر سکتے کہ میری وہ رات کس طرح گزری۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں چمکتے ہوئے تارے آنکھیں جھپکا جھپکا کے جیسے میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ ننگے درخت اپنی ٹہنیاں ہلا ہلا کے جیسے میری حالت زار پر ہنس رہے تھے اور ہوا جیسے خوشی کے عالم میں سیٹیاں بجا رہی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح چیختا ہوا جنگل میں دوڑ رہا تھا۔ پتھروں کو ٹھوکریں مار رہا تھا، پودوں کو نوچ کھسوٹ رہا تھا اور درختوں کو جھنجھوڑے ڈال رہا تھا۔ دنیا پر سکون نیند کے مزے لے رہی تھی۔ بہت سے انسان غالباً اس وقت عیش وعشرت میں مصروف تھے۔ بہت سے غالباً جشن منا رہے تھے۔ لیکن میں اندھیرے جنگل میں آوارہ روح کی طرح بھٹک رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں۔ قرب جوار کی بستیوں کو اجاڑ دوں، انسانوں پر موت بن کے نازل ہوں اور پھر اس ویرانی پر بیٹھا اطمینان سے مسکراتا رہوں۔

میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ میں بھاگتا اور چیختا رہا اور آخر کار تھک کے بیٹھ گیا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو مجھے تسلی دیتا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو میری ڈھارس بندھاتا۔ کوئی ایسا نہ تھا جسے مجھ پر رحم آ جاتا۔ پوری دنیا میں ایک بھی ایسی ہستی نہ تھی جو مجھ سے مشابہ ہوتی...... انسان تو مجھ سے نفرت کرتا تھا...... اور کرتا ہے۔ پھر میں بھی کیوں نہ انسان سے نفرت کروں؟ انسان مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ چنانچہ کیوں نہ میں بھی اسے نقصان پہنچاؤں؟ چنانچہ وہاں سے اندھیرے اور خاموش جنگل میں، میں نے سارے انسانوں کے خلاف عموماً اور اپنے خالق کے خلاف خصوصاً اعلان جنگ کر دیا......

انتقام...... سخت انتقام...... بے رحم اور ظالم انسانوں سے انتقام۔ سورج طلوع ہوا اور میں نے لوگوں کی آوازیں سنیں۔ وہ کھیتوں میں جا رہے تھے۔ چنانچہ اب اس جنگل سے نکلنا مناسب نہ تھا۔ میں گھنی جھاڑیوں میں گھس گیا سورج کی نرم گرم کرنوں اور ہوا کے جھونکوں نے میرے مشتعل اعصاب کو قدرے سکون بخشا۔ چنانچہ جھونپڑی میں جو کچھ ہوا تھا اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں نے یقیناً عجلت سے کام لیا تھا۔ میں نے اپنی باتوں سے بوڑھے کو بہت حد تک اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ لیکن مجھے اسی پر بس کرتے ہوئے اپنی پناہ گاہ میں چلے جانا چاہئے تھا۔ اور پھر وقتاً فوقتاً، جب بوڑھا اکیلا ہوتا تو اس سے باتیں کرتا اور پہلے اسے اپنا دوست بناتا۔ پھر جب وہ فیلکس، ایگتھا اور راحیل کو میری کہانی سنا کر ان کے بھی رحیمانہ جذبات بیدار کر دیتا تب پھر میں ان کے سامنے جاتا اور اس وقت یقیناً وہ مجھ سے نہ ڈرتے۔ میری یہ غلطی، میں نے سوچا، ناقابلِ تلافی نہ تھی، چنانچہ ایک بار پھر میں نے قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ یوں ہوا کہ اس فیصلے سے میری امید پھر بندھی۔ میرا اشتعال سکون میں تبدیل ہو گیا اور میں، جب دوپہر ڈھل رہی تھی، وہیں جھاڑیوں میں گہری نیند سو گیا۔ لیکن افسوس کہ میری وہ نیند خوابوں سے پاک نہ تھی میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکیاں خوف سے چلاتی ہوئی بھاگ رہی ہیں فیلکس مجھے ڈنڈے سے پیٹ رہا ہے...... میری آنکھ کھل گئی۔ رت ہو چکی تھی چنانچہ میں اپنی غذا کی فکر میں جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔

جنگلی پھلوں اور پتوں سے اپنی بھوک مٹانے کے بعد اسی جانے پہچانے راستے پر ہو لیا جو جھونپڑی تک جاتا تھا وہاں خاموشی تھی اور اندھیرا۔ میں آہستہ سے اصطبل میں داخل ہوا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ رات ڈھلنے لگی تارے ایک ایک کر کے مدھم پڑنے لگے۔ آخر کار وہ غائب ہو گئے۔ افق مشرق روشن ہو گیا۔ اجالا زمین پر اترا اور پھر سورج نے اپنے دن بھر کا سفر شروع کیا سورج کافی بلند ہو گیا۔ لیکن جھونپڑی میں بدستور خاموشی چھائی رہی۔ میں حیران تھا اس لئے کہ آج اس میں زندگی کے آثار نظر نہ آ رہے تھے۔ میرا دل دھڑکنے لگا میں جھونپڑی میں جا کے اس خاموشی کی وجہ معلوم کرنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے دو آدمی آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جھونپڑی کے سامنے آ کر رک گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ وہ کسی ایسی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو میرے پڑوسیوں کی زبان سے مختلف تھی۔ چنانچہ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ چند منٹوں بعد ہی فیلکس ایک دوسرے آدمی کے ساتھ اسی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں آدمیوں کے پاس آ کر رک گئے۔

’’تم نے یہ بھی سوچا ہے فیلکس‘‘، فیلکس کے ساتھی نے کہا ’’کہ تم تین مہینے کا کرایہ پیشگی ادا کر

چکے ہو جو کسی طرح تمہیں واپس نہ ملے گا؟ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم چند دن غور کر کے کوئی فیصلہ کرو؟''

''جی نہیں''، فیلکس نے کہا۔''اب ایک منٹ کے لئے بھی اس آسیب زدہ گھر میں نہیں رہ سکتے۔ پورا واقعہ بیان کر چکا ہوں۔ چنانچہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں میرے والد کی زندگی خطرے میں ہے۔ میری بیوی اور بہن کی نظر کے سامنے سے اس آسیب کی بھیانک صورت کسی طرح ہٹتی ہی نہیں۔ تعجب ہے کہ دونوں پاگل نہ ہوگئیں۔ بہر حال اگر ہم یہاں رہے تو شاید مجھے نہ صرف اپنے والد بلکہ بیوی اور بہن سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ چنانچہ جناب اب آپ مجھ سے کچھ نہ کہیں۔ اپنے مکان کی کنجیاں لے لیجئے تاکہ ہم لوگ اس آسیب زدہ جگہ سے کہیں دور چلے جائیں۔''

اور آخری الفاظ کہتے وقت فیلکس کانپ گیا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوا۔ چند منٹوں بعد دونوں باہر آئے تو سامان سے لدے پھندے تھے۔ وہ ایک طرف چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے ولاسی، فیلکس، ایگتھا اور راحیل کو پھر کبھی نہ دیکھا۔

اس وقت میرا وہاں سے نکلنا مناسب نہ تھا۔ چنانچہ میں دن بھر اپنی اسی پناہ گاہ میں رہا اور میرا وہ دن بے حد اداس گزرا۔ میرے پڑوسی جا چکے تھے اور ان کے جا چکنے کے بعد دنیا سے یا یوں کہو کہ انسانوں سے میرا تعلق بالکل ہی ختم ہو گیا۔ انہی لوگوں میں دنیا اور اپنے آپ کو سمجھا۔ انہی لوگوں کی بدولت دنیا مجھے دلچسپ اور قابل رہائش معلوم ہوئی تھی...... لیکن اب وہ لوگ جا چکے تھے۔ چنانچہ میری ساری امیدیں اوندھے منہ جا گری تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرے پڑوسی مجھ سے ظالمانہ سلوک نہ کریں گے۔ لیکن انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ چنانچہ انتقام کی وہ آگ، جو رات کو میرے دل میں بھڑکی تھی، دگنی شدت سے بھڑک اٹھی اور اس دفعہ اس آگ کو دبانے کے بجائے میں نے اسے اور ہوا دی اور پھر میں نے قسم کھائی کہ ہر اس انسان کو جو اتفاقاً میرے سامنے آجائے گا یا جس تک میں پہنچ جاؤں گا، زندہ نہ چھوڑوں گا...... انسان میرا دشمن ہے اور دشمن سے بھلائی کی توقع رکھنا حماقت، چنانچہ میں بھی اس کا دشمن ہوں وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں کیوں خاموش بیٹھا رہوں؟ میرا قصور نہیں۔ قصور انسان کا ہے۔ پہل انسان نے کی تھی۔ میں نے بہت کچھ برداشت کیا۔ لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ننھی سی چیونٹی بھی پیر تلے دبتی ہے تو کاٹ لیتی ہے۔ پھر میں تو ہر انسان سے طاقتور ہوں۔ چنانچہ اب اگر میں ان سے انتقام لوں تو اس کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔ اگر میں انسانوں کی گردنیں مروڑ دوں اور ان پر ٹوٹی ہوئی مکھی کی طرح تڑپتے دیکھ کر خوش ہوں تو میرا ظلم نہ ہوگا۔ کیونکہ انسان اسی کا مستحق ہے اب جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں انسان پر...... صرف انسان پر عائد ہوگی۔ لیکن اس وقت مجھے ولاسی کا ہمدردانہ لہجہ یاد آیا۔ ایگتھا کے قہقہے اور نیلی آنکھیں اور عبرانی خاتون کا چکا چوند پیدا کرنے والا حسن یاد آیا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور ان

آنسوؤں نے میرے انتقام کی آگ ایک حد تک سرد کر دی لیکن فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں نے بھی مجھ سے ظالمانہ سلوک کیا تھا...... میں نے سوچا کہ فیلکس نے مجھے پیٹا تھا اور یہ لوگ مجھے چھوڑ کے چلے گئے ہیں۔ چنانچہ ان یادوں کے ساتھ ہی میرا غصہ پھر بھڑکا، اس وقت وہاں کوئی نہ تھا جو میرے غصہ کا شکار بنتا۔ چنانچہ میں نے اپنے انتقام کی ابتدا بے جان چیزوں سے کی۔ میں نے خشک ٹہنیاں، چوبی تختے اور جلد جل اٹھنے والی چیزیں جھونپڑی کے چاروں طرف، دیوار سے لگا کر رکھ دیں پھر فیلکس اور ایگتھا کے لگائے ہوئے باغ کو نوچ کھسوٹ ڈالا۔ اور چاند کے غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

رات گزرتی رہی۔

جنگل کی طرف سے سرد اور تیز ہوا آنے لگی۔ مجھ پر ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ میں کچھ سوچ سمجھ نہ رہا تھا۔ میں نے ایک خشک ٹہنی جلائی اور افق مغرب کی طرف دیکھا۔ چاند غروب ہونے کے قریب تھا۔ میں دیوانے بھیڑیے کی طرح چیخنے لگا اور جلتی ہوئی خشک ٹہنی سر سے اونچی اٹھائے جھونپڑی کے چاروں طرف غول بیاباں کی طرح ناچنے لگا۔

چاند غروب ہو گیا۔

میں نے ایک بھیانک چیخ کے ساتھ ان خشک ٹہنیوں، پتوں اور دوسری چیزوں میں آگ لگا دی جو میں نے جھونپڑی کے اردگرد ڈھیر کر رکھی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں نے پنکھا جھلا۔ شعلے بلند ہوئے جو اپنی آتشیں زبانوں سے جھونپڑی کی دیواروں کو چاٹنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ولاسی کی جھونپڑی اور اصطبل، جو اس وقت تک میری پناہ گاہ رہا تھا، دھڑ ادھڑ جل رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ آگ قابو سے باہر ہو چکی ہے تو میں ہوا میں گھونسے چلاتا اور چیختا ہوا جنگل کی طرف بھاگا۔

اور اب میرے سامنے وسیع و عریض اور انجانی دنیا تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کس طرف اور کہاں جاؤں۔ بہر حال میں اس جگہ سے، جہاں میری بدقسمتی پر مہر لگ چکی تھی اور جہاں میری امیدیں خاک ہو گئی تھیں، بہت دور چلے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن میں کہاں جاؤں؟ کسی شہر اور بستی میں مجھے پناہ نہ مل سکتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ انسان میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ چنانچہ اس عالم میں دفعتہً، اے میرے خالق، مجھے تمہارا خیال آیا۔ تمہارے روزنامچے کے مطالعے سے مجھے معلوم ہی ہو چکا تھا کہ تم میرے باپ اور خالق ہو۔ چنانچہ اب میں سوائے تمہارے اور کس کے پاس جا سکتا تھا؟ فیلکس نے راحیل کو جو علم سکھائے تھے اس میں جغرافیہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ میں بھی دنیا کے چند مشہور ملکوں اور شہروں کے ناموں کے علاوہ سمتوں سے بھی ایک حد تک واقف ہو گیا تھا تم نے اپنے آبائی وطن کا نام جنیوا لکھا تھا۔ چنانچہ میں نے جنیوا جانے کا فیصلہ کیا۔

لیکن میں وہاں تک پہنچوں کا کس طرح؟ یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ مجھے شمال مغرب کی طرف جانا ہے اور میں سورج کے ذریعہ سمت معلوم کر سکتا تھا میں نہ تو ان شہروں کا نام جانتا تھا جو میری راہ میں پڑتے تھے اور نہ ہی میں کسی شخص سے راستہ پوچھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری مجھے تم سے کسی طرح کی مدد اور ہمدردی کی امید تھی۔ حالانکہ تمہارے خلاف بھی میرے دل میں غصے اور نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ لیکن میں تم سے تمہارے بندے کے طور پر، چند جائز مطالبات کر سکتا تھا اور تمہیں اپنا فرض یاد دلا سکتا تھا۔

میرا سفر بے حد طویل اور کٹھن تھا۔

موسم خزاں کا چل چلاؤ تھا جب کہ میں اس علاقے سے رخصت ہوا، جہاں نہ صرف ایک عرصے تک مقیم رہا تھا بلکہ جہاں میں نے بولنا اور سوچنا، سمجھنا سیکھا تھا۔ آدمیوں کے خوف سے میں دن کو کہیں چھپ رہتا اور راتوں کو سفر کرتا۔ موسم بدل رہا تھا۔ سورج کی کرنوں میں گرمی نہ رہی تھی بارشیں ہوتیں برف گرتی۔ سرد ٹھٹھرا دینے والے ہوا کے جھکڑ چلتے۔ ندیوں کا پانی منجمد ہو چکا تھا۔ زمین سخت، سرد اور ننگی تھی اور مجھے کہیں پناہ نہ ملتی تھی، نیچے زمین تھی۔ سخت اور سرد اور اوپر بے رحم آسمان تھا جو مجھ پر برف اور پانی برسا رہا تھا میں اپنے وجود کو، اپنے خالق کو اور ساری دنیا کو کوس رہا تھا۔ میرے احساسات اور جذبات کی ساری ملائمتی تلخی اور سختی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میرے دل میں عداوت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ سارے انسانوں کی گردنیں ایک ایک کر کے پھانسی پر لٹکا دوں۔

جیسے جیسے میں تمہارے آبائی وطن کے قریب ہوتا جا رہا تھا انتقام کی آگ تند سے تند تر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن میں نہ رکا۔ کبھی کبھی اتفاقات اور حادثات میری راہبری کرتے، کبھی میں اٹکل پچو چلتا رہتا اور بہت دیر بعد انکشاف ہوتا کہ میں راستے میں بہت دور ہٹ آیا ہوں۔ میں لوٹتا، سمت کا اندازہ لگاتا اور پھر چل پڑتا۔

میرے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ مجھے چین لینے نہ دیتی۔ کوئی ایسا واقعہ نہ ہوا جو اس آگ کو اگر بجھا نہ سکتا تو مدھم تو کر دیتا۔ اس کے برخلاف سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے انسان کے خلاف عداوت اور انتقام کے جذبات کو اور بھی شدید کر دیا...... جب میں سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر پہنچا تو موسم پھر بدل چکا تھا۔ سورج کی کرنوں میں گرمی آ گئی تھی درخت نت نئے اور چمکیلے پتوں سے لد گئے تھے اور دھرتی کا سیاہی مائل بھورا سینہ سبزے سے ڈھک چکا تھا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ میں آدمیوں کے خوف سے دن کو کہیں چھپ رہتا تھا اور رات کو سفر کیا کرتا تھا لیکن ایک صبح یہ دیکھ کر کہ راستہ گھنے جنگل میں سے گزرتا ہے میں نے دن کو بھی اپنا سفر جاری رکھنے کا

فیصلہ کیا۔ اور وہ موسم کے ابتدائی دنوں میں سے ایک دن تھا۔ جنگل ہرے بھرے ہو گئے تھے، سورج کی کرنیں بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں، ہوا کے جھونکوں میں فرحت تھی اور جھرنوں اور ندیوں کا پانی شفاف اور میٹھا ہو گیا تھا۔ چنانچہ قدرت کی اس تبدیلی کا اثر مجھ پر بھی ہوا اور میں اپنے دل میں عجیب طرح کی کیفیت اور مسرت، جو میں نے پچھلے کئی دنوں سے محسوس نہ کی تھی، محسوس کرنے لگا...... اور اپنی بدصورتی اور انسانوں کی زیادتیوں کو بھول سا گیا۔

میں ایک انبساط اور وجد کے عالم میں جنگل کو عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچا۔ جنگل کے کنارے پر ایک گہری ندی قدرے شور سے بہہ رہی تھی اور اس کے کنارے پر کھڑے ہوئے درخت گویا اس کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھ رہے تھے۔ جنگل کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں رک گیا کیونکہ نہ جانتا تھا کہ اب مجھے کس طرف جانا ہے۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ میں نے چند آوازیں سنیں اور فوراً ہی ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا۔ ایک لڑکی بے تحاشہ ہنستی ہوئی یوں بھاگی آ رہی تھی جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ غڑاپ سے ندی میں جا پڑی۔ میں درخت کے پیچھے سے نکل کر ندی میں کود پڑا اور ڈوبتی ہوئی لڑکی کو کنارے پر گھسیٹ لایا۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔ غالباً اس آدمی سے ہاتھ چھڑا کے لڑکی کھیل کھیل میں اس طرف بھاگ آئی تھی۔ مجھے لڑکی کے قریب بیٹھا دیکھ کے وہ شخص پاگلوں کی طرح میری طرف لپکا اس نے لڑکی کو گھسیٹ کر اپنے کندھے پر ڈالا اور جنگل کے اس حصہ کی طرف چلا جو زیادہ گھنا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ جب اس شخص نے مجھے اپنے پیچھے آتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ہر لحہ اس کے قریب ہوتا جا رہا ہوں تو اس نے بندوق اٹھا کے، جو وہ ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تھا لبلبی دبا دی۔ شدید ٹیس کی ایک لہر سی میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں زمین پر گر پڑا اور وہ شخص لڑکی کو سنبھالے تقریباً بھاگتا ہوا جنگل میں گھس گیا۔

تو یہ تھا میرے احسانوں کا بدلہ؟ میں نے ایک لڑکی کی جان بچائی اور احسان فراموش انسان نے مجھ پر گولی چلا دی۔ میرا زخم گہرا تھا۔ گولی جلد اور گوشت کو چیرتی ہوئی ہڈی توڑ گئی تھی۔ درد ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ انبساط اور ملائمت جو میں نے تھوڑی دیر پہلے محسوس کی تھی ایک بار پھر شدید غم و غصہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ درد و تکلیف سے بے تاب ہو کر میں نے بنی نوع انسان سے سخت قسم کا انتقام لینے کا عہد کیا...... اور یہ عہد اٹل تھا...... درد کی ٹیسوں میں شدت آ گئی اور میں بیہوش ہو گیا۔

اور وہ چند ہفتے بڑے آزمائشی گزرے۔ میں جنگل میں پڑا زخم مندمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ گولی میرے دائیں کندھے پر لگی تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اندر ہی پیوست ہے یا ہڈی توڑ کے

نکل گئی ہے۔ اگر وہ اندر ہی پیوست تھی تو اسے نکالنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس زخم کی تکلیف ہی کیا کم تھی کہ اوپر سے انسان کی احسان فراموشی، ناانصافی اور ظالمانہ سلوک کا خیال مجھے بے چین کیے ہوئے تھا۔ میں دانت پیستا اور سورج چاند اور زمین و آسمان کی قسمیں کھاتا کہ انسان سے نہایت عبرتناک انتقام لوں گا ایسا انتقام جو دوسروں کے لئے لرزہ خیز لیکن میرے لئے باعث سکون ہو۔

میں ساری انسانی برادری کے خلاف ایک مسلسل جنگ کا اعلان کر چکا تھا...... جس کا خاتمہ ان کی مکمل تباہی و بربادی یا میری موت پر ہوگا۔

چند ہفتوں کے بعد میرا زخم مندمل ہوگیا۔ چنانچہ میں اپنا سفر جاری رکھنے کے قابل ہو سکا۔ میں آگے روانہ ہوا۔ میرے دل میں ایک عجیب طرح کی تلخی بس گئی تھی جسے حسین مناظر اور ہوا کے فرحت بخش جھونکے دور نہ کر سکتے تھے۔ میں تنہا تھا اور تنہا ہوں۔ دنیا کی خوشیاں اور زندگی کی مسرتیں میرے لئے نہ تھیں۔ میری تمام آرزوئیں اور امیدیں خاک ہو چکی تھیں۔ انسانوں کے سلوک نے مجھے احساس دلایا تھا کہ دنیا کی دلچسپیاں میرے لئے نہیں ہیں میں ان سے یکسر محروم کر دیا گیا ہوں اور یہ احساس میرے انتقام کی آگ میں پھنک رہا تھا۔

آج سے کوئی دو مہینے پہلے میں جنیوا کی حدود میں داخل ہوا۔

جب میں وہاں پہنچا تو شام ہو رہی تھی...... میں نے ایک جگہ، جو نسبتاً ویران تھی، پناہ لی اور اس بات پر غور کرنے لگا کہ اپنے خالق سے ملنے یا اسے اپنے پاس بلانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ میں تھکا ہوا اور بھوکا تھا۔ سورج پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور شام کی ٹھنڈی ہوا بہہ رہی تھی۔

میں اسی جگہ سو گیا۔ میں زیادہ دیر تک نہ سویا ہوں گا کہ ایک ہلکی سی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ ایک بے حد پیارا بچہ بڑے کھلنڈرے پن سے ہنستا اور دوڑتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اور اس بچے کی طرف دیکھنے لگا دفعتہً ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے دماغ میں کوند گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ بچہ ابھی معصوم اور ناسمجھ ہے۔ یہ خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز نہیں کر سکتا اور ابھی اس نے کسی سے نفرت کرنی بھی نہیں سیکھی ہوگی۔ چنانچہ اگر میں اسے اپنے پاس رکھ لوں تو وہ رفتہ رفتہ مجھ سے مانوس ہو جائے گا۔ میں یقیناً اسے اپنا ساتھی اور دوست بنا لوں گا اور اس کے بعد میں اس بھری دنیا میں اکتاہٹ اور تنہائی محسوس نہ کروں گا۔

چنانچہ جب وہ بچہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے جھپٹ کے اسے پکڑ لیا۔ اس نے گردن اٹھا کے میرے چہرے پر نظر کی اور فوراً ہی اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور رونے لگا۔ میں نے جبراً اس کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا دیئے اور کہا۔

''روکیوں رہے ہو صاحبزادے؟ میں تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔''
وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔
''چھوڑ دے مجھے...... چھوڑ دے......'' وہ چیخا ''تو...... مجھے کھا جانا چاہتا ہے...... بھوت...... بھوت...... تو...... تو...... بھوت ہے...... چھوڑ دے مجھے...... ورنہ میں اپنے ابا سے کہہ دوں گا۔''
''صاحبزادے! اب تم اپنے ابا کے پاس نہ جاسکو گے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''
''شیطان...... تو نہیں جانتا میرے ابا کو...... وہ تیرے ٹکڑے اڑا دیں گے...... بہت بڑے آدمی ہیں وہ...... مسٹر فرنکسٹائن......'' ''فرنکسٹائن!...... ہوں...... تُو تو میرے دشمن کے خاندان کا فرد ہے...... فرنکسٹائن سے انتقام لینے کی میں نے قسم کھائی ہے۔ تو میرا پہلا شکار ہوگا۔ تجھ سے ہی میں اپنے انتقام کی ابتدا کرتا ہوں۔''
بچہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لئے بدستور جدوجہد کر رہا تھا خیر یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے ان خطابات سے نواز رہا تھا جو مجھے ذرا بھی پسند نہ تھے۔ اسے خاموش کرنے کے لئے میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے حلق پر رکھ دیا۔ اس کی آواز گھٹ گئی۔
دوسرے ہی لمحہ وہ میرے قدموں میں مردہ پڑا تھا۔
میں نے بچے کی لاش کی طرف دیکھا، میرا دل خوشی سے ناچ اٹھا اور آنکھوں سے دوزخی شعلے نکلنے لگے۔ میں نے نہایت فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ سوچا کہ میں بھی انسانوں کو موت اور غم دے سکتا ہوں۔ میں بھی ان کے دل میں ناسور پیدا کر سکتا ہوں۔ انسان مجھے ہی نہیں، میں بھی انسان کو نقصان پہنچا سکتا ہوں۔
میں نے پھر بچے کی لاش پر نظر کی۔ اس کی گردن میں سنہری زنجیر سی چمک رہی تھی۔ میں نے وہ زنجیر گھسیٹ لی۔ وہ ایک لاکٹ تھا جس کے نچلے حصہ میں ایک بے حد حسین عورت کی چھوٹی سی تصویر لٹک رہی تھی ہر چند کہ اس وقت میرا دل جذبہ انتقام سے پر تھا۔ لیکن اس عورت کی کالی آنکھوں، لانبی پلکوں اور محرابی پتلے ہونٹوں نے میرے دل میں ایک عجیب طرح کا تلاطم پیدا کر دیا۔ انسانوں کے خلاف میرا غصہ عارضی طور پر رفع ہو گیا۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی میں پھر غصہ میں پھنکار رہا تھا مجھے یاد آیا کہ میں ہر قسم کی مسرت سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ یہی عورت جو تصویر میں مسکرا رہی تھی، اگر مجھے دیکھ پاتی تو خوف سے زرد ہو جاتی، میں ایسا نہیں بنایا گیا ہوں کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔ کوئی انسان مجھ سے محبت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ عورت بھی، خواہ کتنی ہی رحم دل کیوں نہ ہو، مجھ سے محبت نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اس حسین تصویر کو دیکھ کے خوش ہونا حماقت تھی۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا تھا۔

اے میرے خالق! تمہیں تعجب ہوگا اور میں خود یہ سوچ سوچ کر حیران ہوا ہوں کہ اس وقت میں مارے غصے کے دیوانہ ہو رہا تھا تاہم میں کسی بستی میں نہ گھس پڑا اور نہ ہی وہاں کے سارے آدمیوں کی گردنیں مروڑ دیں اس کے برخلاف میں نے وہ باتیں سوچیں جو میں نے ابھی بیان کی ہیں۔ کسی بھی بستی میں موت کا فرشتہ بن کر گھس پڑنا ناعاقبت اندیشی تھی۔

چنانچہ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اپنے مشتعل جذبات پر قابو حاصل کر کے وہاں سے ہٹ گیا جہاں بچے کی لاش پڑی تھی۔ میں کسی زیادہ محفوظ مقام کی تلاش میں تھا۔ ابھی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک گودام کے سامنے پہنچ گیا۔ بظاہر وہ گودام خالی معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ میں اس میں گھس پڑا اندر ایک لڑکی گھاس کے انبار پر پڑی جوانی کی بے خبر نیند سو رہی تھی۔ ہر چند کہ وہ تصویر والی عورت کی طرح حسین نہ تھی، تاہم خاصی قبول صورت اور جوان تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ اس لڑکی کا حسن، اس کا ملکوتی تبسم اور اس کی شیریں آواز ساری دنیا کے لئے ہے میرے لئے نہیں اس کا دل شاید کسی اور کے خیال سے دھڑکتا ہے۔ اس کی محبت اور ہمدردیاں کسی اور کے لئے ہیں میرے لئے نہیں۔ اس کا سب کچھ سب کے لئے ہے۔ صرف میرے لئے نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا۔

ان خیالات نے مجھے بے تاب کر دیا اور یہ سوچے بغیر کہ میں کیا کر رہا ہوں میں اس پر جھک گیا اور سرگوشی میں بولا۔

''اٹھو حسینہ! تمہارا محبوب تمہارے پاس آ گیا ہے۔ وہ تمہارے سامنے کھڑا ہے جو تمہارے ادنیٰ سے اشارے پر سب کچھ تم پر نچھاور کر دے گا۔ دیکھو! میں تمہارے ایک تبسم کے عوض آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا۔ تمہارے حکم کی تعمیل میں دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک دوڑ جاؤں گا۔ تمہارے لئے وہ سب کچھ کر گذروں گا جو آج تک کسی نے اپنی محبوبہ کے لئے نہیں کیا۔

''اٹھو! میری پیاری......اٹھو۔''

وہ نیند میں کلبلائی۔ اس نے ایک ادھوری انگڑائی لی اور میرے بدن میں خوف و سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ کیا واقعی وہ بیدار ہو کر مجھے دیکھے گی۔ مجھ سے ڈر کر چیخ اٹھے گی یا بے ہوش ہو جائے گی؟......بے شک اگر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا تو ایسا ہی ہوگا......اور میرے دل میں سویا ہوا شیطان دفعتہً بیدار ہو گیا......اس نے میرے کان میں کہا......''کیوں نہ اس بچے کے خون کی سزا یہ لڑکی بھگتے؟ یہ بھی انسان ہے چنانچہ یہ بھی تم سے نفرت کرتی ہے......یہ بھی تمہاری دشمن ہے......بچے کا گلا تم نے گھونٹا ہے لیکن سزا یہ لڑکی پائے گی اور یہ تمہارا دوسرا انتقام ہوگا۔''

فیلکس کے دیئے ہوئے سبق اور انسانوں کے گڑھے ہوئے احمقانہ اور اندھے قوانین کا میں مشکور ہوں کہ میری مراد بر آئی......کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ شرارت، عیاری، مکاری اور بے

ایمانی کیا ہے۔ میں نے جان لیا تھا کہ بے ایمان اور عیار راج کرتا ہے اور ایماندار اور بھولا بھالا بیچارا پھانسی کے تختے پر لٹکتا نظر آتا ہے۔

میں نے وہ لاکٹ، جو بچے کی لاش کی گردن میں سے گھسیٹا تھا، لڑکی کے لباس میں رکھ دیا۔ وہ کلبلائی تو میں وہاں سے بھاگ آیا۔

چند دنوں تک میں اسی جگہ کے قریب، جہاں یہ واقعات ہوئے تھے بھٹکتا رہا اور پھر ان پہاڑوں کی طرف آ گیا۔ مجھے یقین تو نہ تھا کہ تم آ جاؤ گے لیکن شکر ہے کہ آخر کار تم آ گئے۔

چنانچہ اے میرے پیدا کرنے والے! سن لو کہ میں تمہیں اس وقت تک جانے نہ دوں گا جب تک کہ تم ایک وعدہ نہ کرو۔ میرا یہ مطالبہ مناسب ہے۔ سنو! فرنکسٹائن! میں اکیلا اور اداس ہوں۔ انسان میرا دوست اور ہمدرد نہیں بن سکتا۔ میں انسانوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنی ایک الگ دنیا بسانی ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ مجھے ایک ایسی ہستی مل جائے جو میری طرح ہی بدصورت اور دیو قامت ہو۔ جو مجھ سے نہ ڈرے، نہ گھبرائے۔ کوئی عورت، جو مجھ جیسی ہی ہو، میں ایک ایسی ہی عورت چاہتا ہوں۔ جو میری ہی طرح بدصورت اور دیو قامت ہو، اور یہ عورت اے میرے خالق! تم ہی بنا سکتے ہو۔

''میں تمہارا آدم ہوں...... تمہارے کو تمہارے خالق نے ایک حوّا دی تھی...... میں بھی اپنے خالق سے ایک حوّا کا طالب ہوں۔''



تیسرا حصہ

فرنکسٹائن کی کہانی

سترھواں باب

اور یوں میرے آدم نے اپنی داستان ختم کر کے میرے چہرے پر نظریں گاڑیں۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا۔ لیکن میں اتنا پریشان، حیران اور الجھا ہوا تھا کہ اس کے مطالبے کو پوری طرح سمجھ نہ سکا۔ مجھے خاموش دیکھ کے اس نے کہا۔

''میرے خالق! تم میرے لئے ایک عورت بنا دو جو میرے ساتھ رہے اور مجھ سے محبت کرے۔ جو میرے دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہو اور ایسی عورت صرف تم بنا سکتے ہو۔ میں تمہارا بندہ ہوں، تم نے مجھے حیات بخشی ہے۔ چنانچہ تم پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں مجھے مسرت بخشنے کا اور میری زندگی کی ضروریات پوری کرنے کا۔ چنانچہ میں تمہیں اپنا فرض یاد دلاتا ہوں۔ تمہیں میرا مطالبہ مان لینا چاہئے۔''

اس کی داستان کے ابتدائی اور درمیانی حصے نے، یعنی اس وقت تک کے واقعات نے جبکہ وہ ولاسی کے ہمسائے میں بے ضرر زندگی بسر کر رہا تھا، میرا غصہ رفع کر دیا تھا۔ لیکن اس کی داستان کے آخری حصے نے مجھے پھر غصہ کر دیا......

''یہ کبھی نہ ہوگا'' میں چیخ کر بولا ''ایک تجھے ہی بنا کے میں خود اپنی نظروں میں کیا کم ذلیل ہوا ہوں کہ میں تم جیسی ایک اور ہستی بناؤں۔ ایک تو نے ہی دنیا میں کیا کم خوں ریزی کی ہے کہ میں دوسرا خونی تخلیق کروں۔ نہیں۔ نہیں یہ نہ ہوگا کبھی نہ ہوگا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔''

''تم نے مجھے غالباً غلط سمجھا ہے'' وہ بولا ''میں درخواست کر رہا ہوں، عاجزانہ درخواست۔ میں تمہیں خواہ مخواہ کی دھمکیاں نہیں دے رہا ہوں۔ بلکہ نہایت مناسب دلائل سے اپنا حق ثابت کر رہا ہوں اور تمہیں اپنا فرض یاد دلا رہا ہوں۔ میں شیطان ہوں۔ عفریت ہوں۔ جیسا کہ تم کہتے ہو۔ لیکن اے میرے خالق تم نے یہ بھی سوچا کہ میں ایسا کیوں بن گیا ہوں؟ محض اس لئے کہ رانده درگاہ ہوں۔ دھتکارا ہوا اور ٹھکرایا ہوا ہوں۔ کیا انسانوں نے مجھ سے نفرت نہیں کی؟ کیا میرے احسان کا بدلہ انہوں نے مجھے مار پیٹ کی صورت میں نہیں دیا؟ میں نے ان کی ہمدردی چاہی لیکن انہوں نے مجھے نفرت دی۔ میں نے ان کی دوستی چاہی لیکن مجھے دشمنی ملی دوسروں سے کیا گلا خود میرا خالق مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ پھر میں کسی پر رحم کیوں کروں؟ کیوں نہ میں بھی انسانوں سے نفرت کروں؟ انسانوں سے کہو کہ وہ

مجھ سے نفرت نہ کریں۔ میرے ساتھ دوستانہ طور پر ہمدردی سے پیش آئیں اور پھر میری ساری قوتیں ان کی بھلائی میں صرف ہوں گی۔ میں ان کا غلام بن کر رہوں گا۔ ان کا ہر حکم بجالاؤں گا۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ میں اور انسان کبھی متحد نہ ہوسکیں گے۔ کیونکہ انسان بہت زیادہ حساس اور جذباتی ہے۔ اور اگر انسان کے احساسات مردہ نہیں ہوئے ہیں تو میرے بھی نہیں ہوئے ہیں اگر انسان حقیر نہیں ہے تو میں بھی نہیں ہوں۔ اگر وہ میرا دشمن ہے تو میں بھی اس کا دشمن ہوں۔ انسان نے مجھے اذیت دی ہے اور میں اس کا بدلہ اس سے لوں گا۔ اگر میں انسان کے دل میں اپنے لئے محبت و ہمدردی پیدا نہیں کرسکتا تو خوف تو پیدا کرسکتا ہوں اور کروں گا۔ میں اس کو غم دے سکتا ہوں اور دوں گا۔ میں اس کی جان لے سکتا ہوں اور لوں گا۔ انسانوں میں سب سے زیادہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں تمہیں وہ غم دوں گا جو کبھی کسی کو نہ ملے ہوں گے۔ میں نے تم سے انتقام لینے کا عہد کیا ہے اور اپنے عہد کو بہرحال نبھاؤں گا چنانچہ اب بھی وقت ہے، سنبھل جاؤ میرے خالق! کہ اب میری ساری کوششیں تمہیں برباد کرنے کے لئے ہوں گی۔ میں تمہیں نہ ماروں گا۔ لیکن تمہارا دل چھلنی کردوں گا۔ تم زندہ رہو گے لیکن مُردے سے بدتر۔ تم مرنا چاہو گے لیکن تمہیں موت نہ آئے گی۔ زندگی تمہارے لئے ایک مسلسل عذاب ہو کر رہ جائے گی۔ اور ایک دن وہ آئے گا جب تم میری طرح اس دنیا پر لعنت بھیجو گے جب تم نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ زمین تمہارے لئے سخت ہوگی اور آسمان دور۔ وہ وقت آئے گا جب تم میری طرح دنیا میں اکیلے ہو گے۔ مجبور اور بے کس ہو گے۔ وہ وقت آئے گا جب تم دنیا کے سب سے زیادہ ملول غمگین اور دکھی انسان ہو گے۔ وہ وقت آئے گا جب دنیا والے تمہاری حالت دیکھ کر عبرت حاصل کریں گے۔ چنانچہ سنبھل جاؤ میرے خالق کہ میرے انتقام کی ابتدا ہوچکی ہے۔"

اور آخری الفاظ کہتے وقت اس کا بھیانک چہرہ اور بھی زیادہ بھیانک ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کی گہری گہری جھریاں اور بھی زیادہ گہری ہوگئیں۔ اس کے بے گوشت کے گالوں کی جلد پھڑکنے لگی، اس کی بگڑی ہوئی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں اور اس کی زرد ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا دوزخی غصہ اس پر مسلط ہوگیا ہے۔ لیکن بہت جلد اس نے اپنے غصہ پر قابو حاصل کرلیا اور سنبھل کر بولا۔

"تمہیں سمجھنا چاہئے کہ میرے اس غصہ اور شیطنت کا باعث صرف تم ہو۔ اگر کوئی میرے ساتھ رحم و ہمدردی سے پیش آئے تو میں اس کی اس مہربانی کا اسے بے حد عمدہ بدلا دوں گا۔ صرف ایک شخص کی دوستی کی خاطر میں ساری دنیا کے انسانوں کو بخشش دوں گا۔ ساری انسانی برادری سے صلح کرلوں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا۔ اب میں زیادہ دنوں تک اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ مجھے احساس ہے کہ کسی بھی انسان کے دل میں رحم و ہمدردی کے جذبات بیدار نہ کرسکوں گا۔ انسان۔

شروع سے مجھ سے نفرت کی ہے اور آخر تک کرتا رہے گا۔ چنانچہ میرا مطالبہ بے حد مناسب اور قابلِ قبول ہے۔ میرے لئے ایک عورت بنا دو جو میری ہی طرح بدصورت اور بے ڈول ہو۔ میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں مانگتا کیونکہ جانتا ہوں کہ اس سے زیادہ مجھے کچھ اور مل بھی نہیں سکتا۔ مجھے ایک ساتھی چاہیئے ،شریک حیات چاہیئے اور بس۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دونوں نہایت بدصورت او ربھیانک ہوں گے اور کسی بستی میں یا اس کے قریب رہ نہ سکیں گے لیکن ہماری یہی بدصورتی ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ہمدرد بنا دے گی اس بدہیئتی کے باعث ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ بے شک ہماری زندگی خوشگوار نہ ہوگی تاہم اتنی اداس اور اکتا دینے والی کبھی نہ ہوگی جیسی کہ میری ہے۔ ہماری ایک دنیا ہوگی۔ ہم اپنی اس دنیا میں اپنے طور پر خوش و مطمئن رہیں گے اور اپنے لئے زندگی کی دلچسپیاں تلاش کر لیں گے...... دیکھ! اے میرے خالق! دیکھ! میں تیرا آدم ہوں۔ اداس اور بیزار ہوں۔ میری یہ اداسی اور بیزاری دور کر دے میرے لئے ایک حوا بنا دے...... میں تیرا احسان کبھی فراموش نہ کروں گا۔

اس کی اس تقریر نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ میرا غصہ اور نفرت دفعتہً پگھل گئی اور جب میں نے اس کے مطالبے کے نتائج پر غور کیا تو میں کانپ گیا۔ تاہم دل ہی دل میں یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے دلائل بڑے ٹھوس اور مطالبہ قابلِ قبول تھا۔ اس کی کہانی اور اس کے ٹھوس دلائل نہایت محکم ثبوت تھے اس بات کا کہ ''میرا آدم'' نہ صرف بے حد حساس اور سمجھ دار ہے بلکہ وہ بھی ہماری طرح رحمدلی اور غصہ ورانہ جذبات رکھتا ہے اور ان دو متضاد جذبات سے کسی ایک کو پوری طرح بیدار اور دوسرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خوابیدہ کرنا ناممکن نہیں۔ اور میں نے سوچا کہ میں واقعی اس کا خالق ہوں تو کیا مجھ پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ میں اسے وہ مسرتیں بخش دوں جن کا وہ مستحق ہے؟ اور اسے یہ مسرتیں صرف میں ہی بخش سکتا ہوں۔

ان خیالات کے ساتھ ہی میرے بشرے پر کرخت جذبات میں غالباً فوری تغیر ہوا۔ کیونکہ اس تغیّر سے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا کے وہ بولا۔

''میرے خالق! اگر مجھے میری حوا مل گئی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم اور کوئی بھی ہمیں کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ ہم دونوں شمالی امریکہ کے گھنے اور ناقابلِ عبور جنگلات میں چلے جائیں گے اور مرتے دم تک کسی بستی کے قریب بھی نہ آئیں گے۔ ہم دونوں اپنا پیٹ پالنے کے لئے کسی جاندار کو نہ ماریں گے۔ میں اب تک سبزی خور رہا ہوں اور آخر دم تک رہوں گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ میری حوا بھی جنگلی پھلوں سے اپنی بھوک مٹائے گی وہ مجھ جیسی ہوگی۔ کیونکہ میں اس کی تربیت کروں گا۔ ہم جنگل میں رہیں گے، جنگل کے پھل کھائیں گے، جھرنوں اور چشموں کا پانی پئیں گے اور خشک پتوں یا کسی غار میں آرام

کریں گے۔ سورج ہم پر اور ہماری دنیا پر اس طرح چمکے گا جس طرح کہ انسانوں کے لئے ان کی دنیا پر چمکتا ہے۔ وہ ہماری غذا پکائے گا جس طرح کہ انسانوں کے لئے پکاتا ہے۔ میرے خالق! میں نے اپنے مستقبل کی جو تصویر پیش کی ہے کیا وہ انسانیت سوز اور شیطانی ہے؟ نہیں...... اس کے باوجود اگر تمہارا دل نہ پگھلا اور تم نے میرا مطالبہ منظور نہ کیا تو پھر میں وہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا جو کرنا نہیں چاہتا...... میرے خالق! میں تمہاری آنکھوں میں رحم اور ہمدردی دیکھ رہا ہوں ان آنکھوں میں جن میں تھوڑی دیر پہلے نفرت اور غصہ کی جوار بھاٹا بھڑک رہی تھی۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ایک بار پھر عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھے وہ مسرتیں بخش دو جو میرا جائز حق ہیں۔"

"تم کہتے ہو" میں نے کہا "کہ تم آبادی سے دور، جنگلوں میں چلے جاؤ گے...... لیکن میں کیسے یقین کرلوں کہ تم جیسا کہتے ہو ویسا ہی کرو گے؟ کیا تم نے اب تک انسانوں کی دوستی اور ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کیا تم انسانوں کے ساتھ رہنے کے لئے بے تاب نہیں ہو اٹھے؟ یقین نہیں آتا کہ تم اس خود اختیاری جلاوطنی کو قبول کرلو گے...... ممکن ہے ابتدا میں تم ایسا ہی کرو جیسا کہتے ہو۔ لیکن بعد میں یقیناً تم جنگلات سے نکل آؤ گے، دوبارہ انسان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرو گے لیکن اس میں ناکام رہ کے پھر انسانوں سے انتقام لینے کی قسم کھاؤ گے اور اس وقت تم اکیلے نہ ہو گے بلکہ تمہاری حوا بھی تمہارے ساتھ ہو گی۔ چنانچہ...... نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا...... یہ نہ ہو گا۔ تم چلے جاؤ یہاں سے...... میں تمہارا مطالبہ منظور نہیں کر سکتا......"

"بڑے غیر مستقل مزاج ہو تم! ایک لمحہ پہلے میں نے تمہاری آنکھوں میں رحم دیکھا تھا، تم میرا مطالبہ پورا کرنے ہی والے تھے پھر یکایک کیا ہو گیا!...... اے میرے خالق! میں قسم کھاتا ہوں اس دھرتی کی جس پر میں چلتا پھرتا ہوں، میں قسم کھاتا ہوں اس سورج کی جو مجھے روشنی اور گرمی دیتا ہے اور قسم کھاتا ہوں تمہاری کہ تم نے مجھے بنایا ہے...... میں اپنی حوّا کو لے کر بہت دور چلا جاؤں گا، دنیا کے سب سے زیادہ وحشتناک اور ویران خطے کو اپنا مسکن بناؤں گا۔ میرا غصہ رفع ہو جائے گا کیونکہ مجھے ایک ساتھی مل جائے گا۔ وہ عفریت جو مجھ میں بیدار ہے، مر جائے گا، کیونکہ میری آرزو پوری ہو جائے گی۔ میں نہایت سکون سے اپنی زندگی گزار دوں گا اور مرتے وقت اپنے خالق پر لعنت نہ بھیجوں گا کیونکہ اس نے مجھ پر ایک زبردست احسان کیا ہو گا۔"

عجیب درد میں ڈوبی ہوئی تقریر تھی اس کی جس نے میرا دل موم کر دیا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ میں نہایت نرم اور تسلی آمیز لہجہ میں اس کی ڈھارس بندھانے والا تھا۔ لیکن کچھ کہنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اس کے بھیانک چہرے کی طرف دیکھا اور فوراً ہی میرے رحیمانہ جذبات پر کراہت غالب آ گئی۔ وہ ایک آسیب تھا۔ ایسا آسیب جسے ہم کبھی کبھی خواب میں دیکھا کرتے ہیں

اور جب بیدار ہوتے ہیں تو پسینے میں شرابور ہوتے اور بہت دیر تک خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ وہ ایک ہوّا تھا۔ خونی تھا۔ شیطان تھا۔ عفریت تھا...... میں نے ان خیالات کو جھٹک دینے کی کوشش کی اور سوچا کہ اگر میں اس سے ہمدردی نہیں کر سکتا اور اس کا دوست نہیں بن سکتا تو یہ بھی مجھے حق نہیں ہے کہ میں جبراً اسے اس محبت اور ہمدردی سے محروم رکھوں جو میں اس کا مطالبہ منظور کر کے اسے بخش سکتا ہوں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ میرا ظلم ہوگا۔ میں اسے زندگی کی تھوڑی سی مسرت بخش سکتا ہوں اور یہ مجھے بخش دینی چاہئے۔ بہر حال وہ اس کا مستحق تھا۔

''تم قسم کھا کر مجھے یقین دلانا چاہتے ہو کبھی کسی انسان کو کوئی ضرر نہ پہنچاؤ گے۔'' میں نے کہا'' لیکن میں تمہاری قسم کا اعتبار کیونکر کرلوں؟ کیا تم نے میرے بھائی کا خون نہیں کیا ہے؟ کیا تمہاری شیطنت کی وجہ سے ایک بے گناہ لڑکی کو پھانسی کے تختے پر نہیں لٹکا دیا گیا تھا؟ پھر کیسے یقین کرلوں کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دے رہے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اپنی ان سیدھی سادی باتوں اور قسموں سے مجھے الّو بنا کر اپنے انتقام کا میدان وسیع کرنا چاہتے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم محض اس لئے ایک ساتھی چاہتے ہو کہ انسانوں سے پوری طرح انتقام لے سکو...... اور انہیں زیادہ سے زیادہ برباد کرسکو؟''

''کیا بات ہوئی میرے خالق؟ مجھے الفاظ کے جال میں الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ میں صرف جواب چاہتا ہوں۔ ہاں یا نہیں۔ اگر میں اسی طرح اکیلا رہا۔ اگر کوئی مجھ سے محبت کرنے والا نہ ہوا تو یاد رکھو شیطنت، نفرت، اور کینہ توزی میرا سرمایہ ہوگی۔ اپنے ساتھی کی موجودگی، اس کی محبت اور ہمدردیاں میرے دور جرائم کو ختم کردے گی اور میں ایک ایسی ہستی بن جاؤں گا جس کے وجود سے کبھی کوئی واقف نہ ہو سکے گا۔ تم یوں تو بہت عقلمند اور ہوشیار ہو لیکن اتنی سی بات نہیں سمجھے کہ میرا غصہ، شیطنت اور کینہ توزی دراصل میرے وہ بچے ہیں جو تنہائی اور اکتاہٹ نے پیدا کئے ہیں۔ یقین کرو کہ اگر مجھے مجھ جیسا ہی ایک ساتھی مل گیا تو یہ بچے خود بخود ہی فنا ہو جائیں گے۔ کیونکہ پھر مجھے اپنی زندگی ایسی خالی خالی اور بھیانک معلوم نہ ہوگی۔ مجھے اپنی زندگی میں ایسا کوئی خلا معلوم نہ ہوگا جسے پُر کرنے کے لئے مجھے آبادی میں رہنا پڑے اور نہ ہی مجھے انسانوں پر حسد آئے گا کیونکہ مجھے بھی ایک محبت کرنے والا ساتھی مل چکا ہوگا۔''

میں نے اس کی باتوں پر اور قسموں پر غور کیا اور اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا واقعی وہ ایسا شیطان محض اس لئے بن گیا ہے کہ اکیلا ہے؟ کیا واقعی وہ انسانوں کو محض اس لئے برباد کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنی حوا سے محروم ہے اور انسانوں سے، جو عورتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں کھلتا ہے؟ پھر میں نے اس کی دھمکیوں اور اس کی قوتوں پر غور کیا۔ وہ جاندار جو برف پوش پہاڑوں کے سرد غاروں میں رہ سکتا ہو، جو عمودی چٹانوں پر حیرت انگیز پھرتی سے چڑھ سکتا ہو اور جس پر موسموں کا ردوبدل اثر انداز نہ ہو سکتا ہو وہ

یقیناً ایسی فوق الفطرت کا مالک ہے جس کا مقابلہ کوئی انسان نہیں کر سکتا چنانچہ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ بنی نوع انسان کی خود میری اور میرے اس آدم کی بہتری اسی میں ہے کہ میں اس کا مطالبہ منظور کرلوں، چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

''بہت اچھا! تمہاری قسموں اور وعدوں پر اعتبار کر کے تمہارا مطالبہ منظور کرتا ہوں۔ میں تمہیں تمہاری جیسی ایک عورت بنادوں گا لیکن خیال رہے کہ تم اسے اپنے ساتھ لے کر فوراً ہی نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کی ہر آبادی سے اتنی دور چلے جاؤ گے کہ کوئی تم دونوں کا سایہ بھی نہ دیکھے گا۔''

''میں قسم کھاتا ہوں۔'' وہ اپنی مکروہ آواز میں چیخا ''چمکتے ہوئے سورج اور نیلے آسمان کی۔ میں قسم کھاتا ہوں اس محبت کی جو مجھے میری حوا سے ملے گی۔ میں قسم کھاتا ہوں ریگستانوں، جنگلوں اور دریاؤں کی اور میں قسم کھاتا ہوں اس ہستی کی جسے تم بناؤ گے...... ہاں میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا جیسا تم کہتے ہو۔ بس۔ میرے خالق! جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ اور بلاتاخیر اپنا کام شروع کردو۔ میں چھپ کر اپنی حوا کو بنتے دیکھوں گا۔ لیکن تمہارے سامنے اس وقت تک نہ آؤں گا جب تک کہ وہ ہستی، جسے تم بنا رہے ہوگے، مکمل نہیں ہو جاتی۔ پھر میں اسے لے کر چلا جاؤں گا اور پھر قیامت تک ہم دونوں کو نہ دیکھ سکو گے۔''

اور اتنا کہتے ہی وہ تقریباً بھاگتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ غالباً اسے خوف تھا کہ میں مبادا اپنا ارادہ بدل دوں۔ میں نے اسے پہاڑ کی عمودی ڈھلان پر سے اترتے دیکھا۔ وہ بڑی آسانی مگر تیزی سے ڈھلان اتر رہا تھا چند ثانیوں بعد وہ برف کے تودوں کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کی داستان سننے میں پورا دن گزر گیا اور اب سورج افق مغرب کی طرف نہایت تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ مجھے جلد وادی میں نیچے پہنچ جانا تھا اگر اندھیرا اتر آیا تو بھٹک جانے یا کسی کھو میں گر کے ہلاک ہو جانے کا خوف تھا۔ لیکن میرے دل پر ایک انجانا سا بوجھ آ پڑا تھا اور میری رفتار بے حد سست تھی۔ میں یوں چل رہا تھا جیسے میرے گھٹنوں سے وزنی پتھر بندھے ہوئے ہوں۔ دماغ میں ان گنت خیالات بھنبھنا رہے تھے اور میں برفیلے، ڈھلواں اور پُرپیچ راستوں پر ایک شرابی کی طرح لڑکھڑاتا نیچے اتر رہا تھا۔

جب میں نصف راستہ طے کر کے فوارے کے قریب پہنچا تو رات کا اندھیرا اتر آیا تھا۔ میں ستانے کے لئے فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ آسمان پر آنکھیں جھپکتے ہوئے تارے بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے سامنے صنوبر کا اندھیرا جنگل تھا۔ دو چار درخت ٹوٹے پڑے تھے جو یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ظلمات کے دیوتا لیٹے ہوئے ہیں۔ بے حد اداس منظر تھا۔ جس نے میرا دل سرد کر دیا۔ میں بے اختیار رو پڑا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کے چیخا۔

"یہ...... یہ...... تارے میرا مذاق اڑا رہے ہیں...... چلے جاؤ...... خدا کے لئے...... جاؤ...... مجھے اندھیرے میں بھٹکنے دو...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

عجیب حالت ہو رہی تھی میرے دل کی۔ تعجب ہے کہ میں پاگل نہ ہو گیا۔

جب میں گاؤں پہنچا تو پو پھٹ رہی تھی۔ میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ لیکن ذرا بھی ستائے بغیر جنیوا کی طرف روانہ ہو گیا...... اس وقت میری کچھ ایسی حالت ہو رہی تھی جس کو میں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں اور پھر مجھ پر ایک قسم کی ناقابلِ فہم سنسنی مسلط تھی...... میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور روح آتشیں شکنجے پر کھنچی ہوئی تھی۔

چنانچہ جب میں نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو میرے چہرے سے وحشت عیاں تھی اور آنکھوں میں پاگل پنے کی چمک۔ میری یہ حالت دیکھ کر سبھی گھبرا گئے اور مجھ سے طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگے لیکن میں نے ان کے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ دے ہی نہ سکا۔ میری قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی تھی۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے مجھے یہ بددعا دے دی ہے جس کے ذریعہ میں اپنے عزیزوں کی محبت اور ہمدردیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا ہوں۔ جیسے کسی نے مجھے بددعا دے دی ہے جس کے اثر سے میں کبھی زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار نہ ہو سکوں گا...... میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی منحوس سایہ میرے گھر پر منڈلا رہا ہے۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں اب کبھی اپنے عزیزوں سے نہ مل سکوں گا۔ جیسے میں نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔ جس کا خمیازہ میرے عزیزوں کو بھگتنا پڑے گا۔

لیکن...... میں اپنے عزیزوں کو چاہتا تھا۔ مجھے ان سے محبت تھی۔ میں ان کی خاطر سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھا۔ یہ گھناؤنا کام، جس کے تصور سے ہی مجھے ٹھنڈے پسینے چھوٹ جاتے تھے، میں اپنے عزیزوں کی بلکہ بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے کرنے والا تھا اور میں بہرحال جلد از جلد اس کام کو پورا کر دینا چاہتا تھا۔ مجھ پر اچانک کچھ ایسی غیر قدرتی عجلت طاری ہو گئی تھی کہ فی الحال زندگی کی دلچسپیاں میرے لئے ایک خواب ہو کر رہ گئی تھیں...... میں اس کام کی تکمیل کے بعد ہی کسی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔



اٹھارواں باب

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے لیکن میں اپنے آپ کو اس گھناؤنے کام کے لئے تیار نہ کر سکا جس کی فوری تکمیل کا وعدہ میں نے آدم سے کیا تھا۔ ہر طرف سے مایوس شیطان کے غصہ اور جذبہ انتقام سے میں ڈرتا ضرور تھا لیکن نفرت و کراہت کے جذبے پر قابو حاصل نہ کر سکا کہ دوبارہ ایسی ہی بھیانک ہستی کی تخلیق کرنا...... اف! کس قدر نفرت انگیز اور آزمائشی کام تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے پچھلے فارمولا کا، جو میں ایک حد تک بھول چکا تھا۔ دوبارہ مطالعہ کرنا تھا اور اس کام کے لئے توجہ اور وقت درکار تھا۔ میں نے کبھی سنا تھا کہ کسی انگریز سائنسدان نے حیاتیات اور طبیعات میں چند نئی باتیں معلوم کی ہیں جو میرے اس کام کو ایک حد تک آسان کر سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے بعض دفعہ سوچا کہ والد صاحب سے اجازت لے کر انگلستان چلا جاؤں اور اس انگریز سائنسدان سے ملوں۔ لیکن میں نے ایسا بھی نہ کیا۔ میں اس گھناؤنے کام کو التواء میں ڈالنے کے بہانے تلاش کرتا رہا اور دن گزرتے رہے اور میری وہ عجلت، جو میں نے اپنے آدم سے وعدہ کرنے کے فوراً بعد محسوس کی تھی، کم ہو گئی۔ اس عرصے میں خود مجھ میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی، اور میں نے نہایت مسرت کے ساتھ اس تبدیلی کو محسوس کیا...... میری طبیعت جو اس منحوس وعدے سے بجھ سی گئی تھی، شگفتہ ہونے لگی اور اس وعدے کی اہمیت میری نظروں میں کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ یہ وعدہ محض ثانوی حیثیت اختیار کر کے رہ گیا۔ چنانچہ میں پہلے ہی کی طرح خوش مزاج اور تندرست ہو گیا۔ میرے گھر والوں نے عموماً اور والد صاحب نے خصوصاً میری اس تبدیلی کو نہایت مسرت کے ساتھ دیکھا تاہم اب بھی کبھی کبھار مجھ پر اداسی کے دورے پڑتے تھے۔ اور اس وقت میں گھر سے نکل پڑتا۔ میرا سارا دن تالاب پر گزرتا۔ میں ایک چھوٹی سی کشتی میں سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے اور پرندوں کے چہچہے میرے لئے بہترین ٹانک کا کام دیتے اور میری اداسی رفتہ رفتہ دور ہونے لگتی۔ اور جب میں گھر لوٹتا تو بشاش ہوتا۔ ایک دن جب میں ایسے ہی دورے سے چھٹکارا حاصل کر کے گھر آیا تو والد صاحب نے کہا۔

''وکٹر! خدا کا شکر ہے کہ تمہاری صحت پہلے سے بہتر ہے تاہم معلوم ہوتا ہے اب بھی کوئی غم یا کوئی فکر تمہیں پریشان کئے ہوئے ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تم اکثر ہم سے بھاگ کے ویرانوں میں پناہ لیتے ہو۔ پچھلے کئی ہفتوں سے میں اسی ایک بات پر غور کر رہا ہوں کہ تمہارے اس فرار کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ کافی غور و خوض کے بعد میں ایک خاص نتیجہ پر پہنچا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے

اس معاملے میں خاموشی تمہارے لئے تباہ کن اور ہمارے لئے غمناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

والد صاحب کی اس تمہید پر میں کانپ گیا۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج تک میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہوا ہوں کہ بہت جلد تمہاری شادی الزابیتھ سے کر دوں گا اور پھر تم دونوں کو خوش وخرم دیکھ کے نہایت سکون واطمینان سے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ لیکن بعض اوقات آدمی کے اندازے اتنے غلط اور اوندھے ثابت ہوتے ہیں کہ ساری امیدوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ غالباً یہی معاملہ میرے ساتھ ہوا ہے۔ میں قبل از وقت بہت سے غلط سلط اندازے لگا کر خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ تم اور الزابیتھ ساتھ کھیلے اور پلے بڑھے ہو۔ شاید اسی لئے تم اسے ایک بھائی کی طرح چاہتے ہو۔ شاید تم نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ وہ تمہاری بیوی بننے والی ہے۔ چنانچہ شاید آج تک تم نے اسے اپنی بہن ہی سمجھا ہے اور اسے اسی طرح چاہا ہے جس طرح ایک بھائی ایک بہن کو، شاید اسی لئے تم اسے اپنی بیوی بنانے کے لئے تیار نہیں ہو۔ بہن کو بیوی بنانا اور بہن کی محبت کو بیوی کی محبت میں تبدیل کرنا واقعی بڑا مشکل کام ہے۔ یا شاید یوں ہے کہ تم کسی اور کو چاہتے ہو۔ لیکن اپنے اخلاق اور شرافت سے مجبور ہو اور انکار کر کے الزابیتھ کا دل دکھانا نہیں چاہتے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ یہی اندرونی کشمکش تمہیں اداس اور بے چین رکھتی ہے اور اس الجھے ہوئے مسئلہ کا تمہیں کوئی حل نظر نہیں آتا تو تم گھبرا کر ویرانوں کی طرف بھاگ پڑتے ہو...... میرے بیٹے! اپنے باپ پر اعتبار کرو...... بلا جھجک کہہ دو کہ یہی بات ہے اور بتاؤ کون ہے وہ لڑکی جسے تم چاہنے لگے ہو؟"

"خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں صرف الزابیتھ کو چاہتا ہوں۔ آسمان سے اتری ہوئی حور اور حسن کی دیوی وینس بھی الزابیتھ کی جگہ نہیں لے سکتی۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہی رہی ہے۔ الزابیتھ ہی میری بیوی بنے۔"

"تو پھر تمہاری اس اداسی کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟...... آہم۔ ٹھیک ہے...... اس کا صرف یہی ایک علاج ہے کہ تمہاری شادی جلد از جلد الزابیتھ سے کر دی جائے...... کہو کیا خیال ہے پھر؟"

چند ثانیوں تک میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

میرے دماغ میں خیالات دھکا پیل کر رہے تھے اور میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اوپر تلے گرتے ہوئے متضاد خیالات نے مجھے بالکل ہی بوکھلا دیا تھا...... الزابیتھ سے شادی...... میری زندگی کی بہترین آرزو...... جلد از جلد شادی...... لیکن...... میں فی الحال شادی نہ کر سکتا تھا۔ میں نے ایک غصیلے، کینہ توز اور انتقام جو شیطان سے ایک وعدہ کیا تھا جسے اب تک پورا نہیں کر سکا تھا...... اس وعدے کی تکمیل سے پہلے، اس عفریت کو مسرت بخشنے سے پہلے میں خود مسرت حاصل کرنے کی جرأت

نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ کہا جاسکتا تھا کہ ''وہ'' بپھر کر کیا کر بیٹھے۔ شاید میرے خاندان پر کوئی آفت نازل ہو...... شاید خونی ڈرامہ پھر کھیلا جائے...... میری گردن میں ایک منحوس وعدے کا بوجھل طوق پڑا تھا۔ پہلے مجھے اس سے گلوخلاصی حاصل کرنی تھی۔ الزابیتھ کو اپنی بیوی بنانے سے پہلے مجھے اپنے آدم کے لئے ایک حوّا مہیا کرنا تھی کہ وہ اسے لے کر جنگلوں کی طرف چلا جائے اور پھر میں بلاخوف وخطر اپنے حصے کی مسرتوں سے ہمکنار ہوسکوں۔

''اسے'' حوّا دینے سے پہلے خود اپنی بیوی حاصل کرنے کے متعلق سوچنا بھی حماقت تھی۔ خود اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی کو دعوت دینا تھا۔

ساتھ ہی مجھے انگلستان جا کر ان سائنسدانوں سے ملنے کا خیال آیا جن کے بنائے ہوئے فارمولے اور تجربات معاون ثابت ہوسکتے تھے۔ اس کام کو انجام تک پہنچانے کا پچھلا طریقہ، جو میں نے استعمال کیا تھا، تاخیری اور غیر اطمینان بخش تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ میں اپنے وطن اور گھر میں وہ کام کرنا نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ راز فاش ہوجانے کا خوف تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ چھپ کر مجھے کام کرتے دیکھا کرے گا اگر کسی نے اسے دیکھ لیا تو خدا جانے کیا ہو...... یا پھر ایسے اتفاقات کے بھی زیادہ امکانات تھے جو میرے عزیزوں کو اس بری طرح سہادیں گے کہ وہ شاید کبھی سنبھل نہ سکیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ راز کے فاش ہوتے ہی اپنے پرائے مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ اس گھناؤنے کام کے دوران میں اکثر اپنا سارا ضبط وتحمل کھودوں گا اور اپنے خوف و کراہت کے جذبات کو چھپا نہ سکوں گا۔ یہ اور بھی برا ہوگا چنانچہ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں اس بھیانک کام کو اپنے وطن سے بہت دور کسی غیر آباد جگہ میں پورا کروں۔ ایک دفعہ دل پر جبر کر کے کام کی ابتدا کرنے کی ضرورت تھی۔ پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ اپنی حوّا کو لے کر کبھی واپس نہ آنے کے لئے جنگلوں کی طرف چلا جائے گا۔ یا یوں ہوگا کہ اس دوران میں کوئی ایسا حادثہ ہوگا جو اس عفریت کا خاتمہ کر کے مجھے اس کے شر سے نجات دلا دے گا اور میں خوش وخرم گھر لوٹ کے الزابیتھ سے شادی کرلوں گا۔

چنانچہ یہ سوچ کر میں نے والد صاحب سے انگلستان جانے کی اپنی خواہش کا ذکر ایسے الفاظ میں اس طرح کیا کہ کسی طرح کا شک نہ ہو اور کہا کہ وہاں سے لوٹتے ہی شادی کرلوں گا۔ والد صاحب نے انگلستان جانے کی بخوشی اجازت دے دی اور کہا کہ یہ سفر یقیناً میرے لئے مبارک ثابت ہوگا اور جب میں واپس آؤں گا تو پوری طرح تندرست اور بشاش ہوں گا۔

اب رہا یہ سوال کہ وہاں میرا قیام کب تک رہے گا؟ تو اس کا فیصلہ والد صاحب نے مجھ پر ہی چھوڑ دیا۔ میں کم سے کم آٹھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال میں اس گھناؤنے کام سے فرصت پالوں

گا۔ البتہ والد صاحب نے مجھے مجبور کیا کہ میں انگلستان اکیلا نہ جاؤں چنانچہ طے پایا کہ وہ ہینری کو ایک خط لکھ دیں گے اور وہ مجھ سے اسٹراس برگ میں آ ملے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تنہائی میں ہی یہ کام پورا کرنا چاہتا تھا اور اپنے دوست ہینری کی موجودگی میرے کام میں حارج ہو سکتی تھی۔ تاہم والد صاحب کے اس فیصلے کو میں نے منظور کر لیا اور سوچا کہ اپنے اس عزیز دوست کے ساتھ کی وجہ سے میں پاگل کر دینے والے خیالات سے محفوظ رہوں گا۔

چنانچہ میں سامان سفر درست کرنے لگا۔ یہ تو طے پا ہی چکا تھا کہ وہاں سے واپسی کے فوراً بعد میری شادی الزابیتھ سے کر دی جائے گی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی محنتوں کا صلہ نہایت حسین ملے گا اور میں یقیناً اس روحانی کرب سے نجات حاصل کر لوں گا جس میں مبتلا تھا۔ ایک سال صرف ایک سال اور میں اس خود اختیاری غلامی سے آزاد ہو کر الزابیتھ کو اپنی آغوش میں لوں گا اور اپنے بھیانک ماضی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فراموش کر جاؤں گا اور اسی مبارک دن کا خیال تھا جو میرے تاریک دل کے ایک گوشے میں امید کی جوت جگائے ہوئے تھا۔

چنانچہ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔

لیکن ایک خیال اس وقت بھی مجھے پریشان کئے ہوئے تھا۔ میں اپنے عزیزوں کو ایک ایسے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑے جا رہا تھا جس کے وجود سے وہ لوگ واقف نہ تھے۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا..... اگر "وہ" ......لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ چھپ کر میرے کام کی ترقی دیکھتا رہے گا۔ چنانچہ یقیناً میں جہاں جاؤں گا وہ بھی آئے گا۔ یہ خیال ہر چند کہ بھیانک تھا تاہم تسلی بخش تھا۔ کیونکہ اس طرح میرے عزیز اس شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکتے تھے..... لیکن معاملہ اس کے برعکس ہونے کے بھی امکانات تھے اور زیادہ تھے۔ ممکن ہے اس خیال سے کہ میں نے راہ فرار اختیار کی ہے۔ وہ اپنا غصہ میرے عزیزوں پر اتارے۔ ممکن ہے وہ یہ سوچے کہ سفر کا محض بہانہ ہے اور میں کہیں دور، جہاں وہ نہ پہنچ سکے، چلا جانا چاہتا ہوں۔ اس صورت میں "وہ" جو کچھ بھی کرے گا اس کے خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ چنانچہ میں پھر مضطرب رہنے لگا۔ میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ "وہ" میرا تعاقب کرے اور جنیوا نہ رہے۔

بہر حال ستمبر کے آخری دن تھے جب میں دوسری دفعہ اپنے وطن سے رخصت ہوا۔ والد صاحب نے میری پیشانی چوم کر مجھے دعا دی اور الزابیتھ نے پرنم آنکھوں سے مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں۔

میں اس گاڑی کی نشست پر، جو مجھے لے جانے والی تھی، نیم جاں سا گر پڑا۔ دماغ میں آسیبی بگولے سے رقص کر رہے تھے اور میں کچھ دیکھ اور سمجھ نہ رہا تھا...... کیمیا کے آلات کا چرمی تھیلا میرے

پہلو میں پڑا تھا۔اور گاڑی اُڑی جا رہی تھی۔ بے حد حسین قدرتی مناظر گزرتے جا رہے تھے۔لیکن میں دور کہیں خلا میں گھور رہا تھا۔ مجھ سا بدنصیب آدمی بھی اس وقت دنیا میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ میرا ماضی بھیانک تھا، حال اداس اور مستقبل ڈانواڈول...... خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے اس سفر کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سفر میرے لئے کیسا ثابت ہوگا؟ مبارک یا منحوس؟ کیا بعد میں میں روحانی سکون محسوس کروں گا؟ کیا میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کرے گا؟ میں ایک شیطان بنا چکا تھا اور دوسرا بنانے جا رہا تھا۔کیا میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں مناسب ہے؟ کہیں میں نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ محض اپنی بھلائی کے خیال نے مجھے اندھا کر دیا ہو...... ممکن ہے میں اور میرے عزیز واقربا محفوظ رہیں لیکن دوسرے لوگوں پر اس عفریت کا اور اس کی حوا کا غصہ قہر بن کر نازل ہو میرے خدا! میں کیا کروں؟ کیا کروں؟...... کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی...... چند دنوں کے سفر کے بعد آخر کار میں اسٹراس برگ پہنچا اور دو دنوں تک ہینری کا انتظار کرتا رہا...... اور میرے یہ دو دن بڑے بے قرار گزرے مجھے نہ دن کو سکون ملتا تھا اور نہ رات کو۔ان بھیانک راتوں کا خیال جن میں میں ایک اور ہیبت ناک ہستی بناؤں گا۔ میرے اعصاب پر سوار تھا۔

تیسرے دن ہینری آ گیا۔

ہم دونوں میں کس قدر فرق تھا۔وہ بشاش اور بے فکر تھا۔ نئے نئے مناظر سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔اور دنیا کی گہما گہمی کا ایک حصہ تھا۔وہ دن بھر ہنستا باتیں کرتا اور رات کو نہایت بے فکری کی نیند،اس کے برخلاف میری طبیعت پر اوس پڑ گئی تھی۔ میں دن کو اداس اور رات کو بے چین رہتا تھا۔

”زندگی بھی ایک عجیب چیز ہے۔“ ہینری نے کہا ”اور دنیا عجب لطف کی جگہ ہے...... لیکن فرنکسٹائن تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم ہر وقت، معلوم ہوتا ہے کچھ سوچتے رہتے ہو اور تمہارے چہرے پر کچھ مردنی سی چھائی رہتی ہے مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ دوست۔اگر کوئی بات ہے تو صاف صاف کہہ دو۔اور اگر کوئی بات نہیں ہے تو پھر ہنسو بولو۔خوب کھاؤ پیو۔یہ کیا کہ ہر وقت کسی نوجوان بیوہ کی طرح سر کو ہاتھ دیئے بیٹھے رہتے ہو۔زندگی پھر نہ ملے گی میرے دوست۔“

میں ہینری کی ان باتوں کا جواب کیا دیتا۔؟

طے پایا کہ روٹرڈم تک ہم دریائے ری ہارٹن کے راستے کشتی میں جائیں گے اور وہاں سے لندن جانے والے جہاز میں سوار ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسٹراس برگ سے رخصت ہونے کے بعد پانچویں دن ہم می آنس پہنچ گئے۔وہاں سے آگے دریائے ری ہارٹن کے دونوں کناروں پر کا خطہ بے حد سرسبز اور خوبصورت ہے وہاں سے دریا کا بہاؤ بھی قدرے تیز ہو جاتا ہے کیونکہ وہ خطہ ڈھلوان ہے۔تھوڑی دور آگے بڑھ کے دریا نہایت خوبصورت وادیوں اور تقریباً عمودی چٹانوں کے جو بہت زیادہ اونچی

نہیں ہے، بیچ میں سے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا گزرتا ہے۔ ان چٹانوں کی چوٹیوں کو اور ریت نے رگڑ رگڑ کے عجیب و غریب اشکال میں تبدیل کر دیا ہے۔ چٹانوں کی چپٹی چوٹیوں پر قدیم قصروں کے محلات گویا اپنے شاندار ماضی کی یاد میں اداس کھڑے ہیں اور اس کے چاروں اطراف جنگلات ہیں۔ سر سبز اور گھنے اور کہیں چھدرے دریائے ری ہارٹن، شفاف اور ٹھنڈا بہت سے موڑ مڑتا ہے اور یہ موڑ ایک نیا مسحور کن منظر مسافر کی نظر کے سامنے لے آتا ہے۔ ایک موڑ اور...... آپ کو کسی چٹان کی چوٹی پر کوئی کھنڈر نظر آئے گا جس کے پتھروں پر کائی جمی ہوگی اور جس کی دیواروں اور ستونوں سے ہزاروں چمگادڑ لٹک رہی ہوں گے...... پر وہ منظر پیچھے چھوٹ جائے گا اور آپ سیاہ چکنی چٹانوں کے بیچ میں سے گزر رہے ہوں گے اور ان چٹانوں سے خودرو جھاڑیاں اور بیلیں کسی عفریت کی داڑھی کی طرح لٹک رہیں ہوں گی...... ایک اور موڑ...... اور سامنے جنگل نظر آئے گا۔ پھر چٹانیں۔ پھر انگور کے باغات اور باغات سے پرے پریوں کے دیس جیسی نہایت حسین چھوٹی سی بستی۔ پھر نشیب۔ پھر فراخی پھر انگور کے باغات۔

جب ہم روانہ ہوئے تو انگور توڑنے کا موسم تھا اور ہم نے انگور توڑنے والوں کے مدھر گیت سنے اور یہ گیت سن کر اپنی اداسی اور بے چینی کے باوجود، مسرت کی لہریں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں کشتی کے پیندے میں چت پڑا آسمان پر نظریں گاڑے ہوئے تھا کہ یکا یک میں نے ایک ایسا روحانی سکون محسوس کیا جو پچھلے کئی مہینوں سے محسوس نہ کر سکا تھا۔ مجھ پر وجد کا سا عالم طاری ہو گیا اور میری روح گویا بے حد لطیف ہو کر انجانی پُر کیف وادیوں پر تیرنے لگی۔ اگر میری یہ حالت ہو گئی تھی تو ہینری کے، جسے کوئی فکر نہ تھی۔ جذبات و احساسات کا اندازہ لگانا مشکل ہے وہ تو شاید محسوس کر رہا تھا جیسے اچانک خوابوں کی سر زمین میں پہنچ گیا ہے جہاں ہر طرف بس مسرت ہی مسرت ہے۔

''میں نے اپنے وطن کے حسین ترین مناظر دیکھے ہیں۔'' اس نے بے خود ہو کر کہا ''میں نے لکرین اور راوری کے تالابوں کی سیر کی ہے میں نے ان تالابوں پر طوفان پھٹتے دیکھے ہیں میں نے پہاڑوں پر سے برف کو پھسلتے دیکھا ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک سیاح اور اس کی محبوبہ دونوں اس پھسلتی ہوئی برف کے نیچے زندہ دفن ہو گئے تھے اور کہتے ہیں آج بھی سرد اور اندھیری راتوں میں ان دونوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ خطہ تو سچ مچ پریوں کا دیس معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ دیکھو فرنکسٹائن! کسانوں کی ایک قطار اپنے سروں پر انگوروں سے بھرے ہوئے ٹوکرے اٹھائے ایک باغ میں سے نکل رہی ہے۔ پُر اسرار پری زادوں کی طرح اور اس گاؤں کو دیکھو کہ نصف کے قریب جنگل میں چھپ گیا ہے اور کسانوں کے یہ گیت سنو جو فرشتوں کے نغمے معلوم ہوتے ہیں...... ہائے! سچ مچ یہ خوابوں کی سر زمین ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں یہیں رہ جاؤں۔''

ہینری! میرے دوست! اس وقت بھی تمہارے یہ الفاظ دہرا کے میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کرر ہا ہوں۔ ہینری نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔اس کے تصور کو اس کے لطیف احساسات نے جلا دی تھی۔اس کے خیالات ترشے ترشائے ہوئے تھے۔وہ قدرتی مناظر دیکھ کے بے خود ہو جاتا تھا۔وہ ان مناظر سے لطف اندوز ہونا جانتا تھا...... ہائے!اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ ہاں اس کا جسم فنا ہو گیا ہے لیکن اب بھی اس کی روح اپنے اس لعنتی دوست کی ملاقات کو کبھی کبھی آ جاتی ہے۔

معاف کرنا کپتان صاحب کہ میں جذبات کی رو میں بہہ گیا۔لیکن کیا کرتا اپنے پیارے دوست کی یاد نے مجھے بے تاب کر دیا تھا۔ یہ اس کی یاد ہی ہے جو میرے دل کے ناسوروں پر پھاہے رکھتی ہے۔

آمدم برسرِ مطلب......کالوگن سے رخصت ہو کر ہم ہالینڈ کے میدانی علاقے میں داخل ہوئے اور وہاں ہمیں مجبوراً چند دنوں تک قیام کرنا پڑا کیونکہ وہاں سے ایک تو دریا سست رفتار ہو گیا ہے اور پھر ہوا بھی موافق نہ تھی۔

وہاں سے ہمارا سفر بھی غیر دلچسپ ہو گیا۔ کیونکہ وہ پورا علاقہ اجاڑ، ویران اور چٹیل ہے۔خوابوں کی سرزمین، جیسا کہ ہینری نے کہا تھا، خواب ہو کر رہ گئی ہے۔

چند دنوں کے نہایت بیزار کن سفر کے بعد ہم آخر کار روٹرڈم پہنچ گئے انگلستان جانے والا جہاز روانگی کے لئے تیار کھڑا تھا۔دسمبر قریب الختم تھا کہ ہم دریائے ٹیمز میں داخل ہوئے اور لندن کے گھنٹہ گھروں اور گرجا کے بلند میناروں کی سفید چوٹیاں نظر آئیں اور سینٹ پال کا عظیم الشان تاریخی مینار سب سے بلند اور الگ نظر آ رہا تھا۔



انیسواں باب

لندن ہماری پہلی منزل تھی۔

اور وہاں چند مہینوں تک ہم نے قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہینری اس وقت کی مشہور شخصیتوں سے ملنے کا آرزومند تھا۔ لیکن مجھے ان شخصیتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے جلد از جلد وہ معلومات فراہم کرنا تھیں جو میرے اس منحوس کام کو پورا کرنے میں میری مدد کرتیں۔ اس وقت کے مشہور سائنسدانوں کے نام تعارفی خطوط میں نے پہلے ہی حاصل کر لئے تھے۔

اگر میں نے یہ سفر زمانہ طالب علمی اور بے فکری کے دور میں کیا ہوتا تو لندن میں میرا قیام بے حد مفید ثابت ہوتا۔ لیکن اس وقت میں نے ایک وعدے کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا تھا اور ایک خاص مقصد سے میں نے وہ سفر اختیار کیا تھا۔ چنانچہ میں سائنسدانوں سے محض اس لئے ملا کہ معلومات فراہم کرسکوں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، بھیڑ بھڑکے سے میری طبیعت گھبراتی تھی۔ چنانچہ میں تنہائی کے مواقع تلاش کیا کرتا۔ ہینری کی موجودگی مجھے تسلی دیتی اور میری ڈھارس بندھاتی اور میں عارضی سکون محسوس کرنے لگتا۔ لیکن خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے، لوگوں کا رکھ رکھاؤ مجھے اور اداس کر دیتا۔ سڑکوں پر بہتا ہوا انسانوں کا سیلاب اور بازاروں کی گہما گہمی مجھے ذرا بھی نہ بھاتی اور میں یوں محسوس کرتا جیسے میرے اور ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان ایک عمیق خلیج حائل ہوگئی ہے اور اس خلیج میں ولیم اور جسٹائن کی لاشیں پڑی سڑ رہی ہیں اور میرا جی چاہتا کہ میں اپنا سر دیوار سے ٹکرادوں۔

لیکن ہینری میں مَیں اپنا ماضی دیکھ رہا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ اور اپنے علم کی تکمیل کے لئے وہ ہندوستان جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش تھا اور مصروف۔ لیکن جب وہ میرا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھتا تو خود بھی اداس ہو جاتا۔ میں جب اس کے سامنے اپنے آپ کو حتی الامکان بشاش بنالیتا اور کبھی کبھی اس کے ساتھ نہ جاتا، اور اب میں وہ ضروری چیزیں جمع کرنے لگا جو اس کام کو پورا کرسکتی تھیں جس کو جلد از جلد پورا کرنے کا وعدہ میں نے اپنے آدم سے کیا تھا۔ اور میرا یہ کام، چیزیں جمع کرنے کا کام، بڑا ہی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ پانی کے قطرات تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آپ کے سر پر ٹپک رہے ہوں تو آپ کیسی بے چینی اور بیزاری محسوس کریں گے؟

بس میں بھی کچھ ایسی ہی بے چینی اور تکلیف محسوس کرر ہا تھا۔ ہر وہ خیال جس کا تعلق اس منحوس کام سے تھا، گویا ایک عذاب تھا۔ ایک گرم سلاخ تھی جو میرے دماغ کو مسلسل داغ رہی تھی۔ ہر وہ لفظ جو

اپنے کام کے متعلق بے اختیار میرے منہ سے نکل جاتا۔ مجھے لرزا دیتا اور میرا دل سرد کر دیتا۔ لندن میں چند مہینے اسی طرح گزرے۔

پھر ہمیں اپنے ایک دوست کا خط ملا۔ اس نے ہمیں اسکاٹ لینڈ آنے کی دعوت دی تھی۔ ہینری نے بڑی خوشی سے اسکاٹ لینڈی دوست کی دعوت قبول کر لی۔ میں بھی تیار ہو گیا۔

ہم لوگ اکتوبر کے اوائل میں انگلستان پہنچے تھے اور اب فروری کا مہینہ تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ مارچ میں اسکاٹ لینڈ کے لئے روانہ ہو جایا جائے۔ امید تھی کہ ونڈسر، آکسفورڈ اور کوبر لینڈ کی سیر کرتے ہوئے ہم لوگ جولائی کے ختم ہونے تک اسکاٹ لینڈ پہنچ جائیں گے۔ میں نے کیمیا کے آلات اور وہ ضروری اشیاء، جو لندن کے قیام کے دوران حاصل کی تھیں ایک تھیلے میں بھر لیں اور سوچا کہ اسکاٹ لینڈ کے کسی دور افتادہ اور غیر آباد علاقے میں اپنے کام کی ابتدا کروں گا اور وہیں اسے تکمیل تک پہنچا دوں گا اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا کر چکا ہوں۔

مارچ کی ستائیس تاریخ کو ہم لندن سے روانہ ہو کے ونڈسر پہنچے اور چند دنوں تک وہاں کے جنگلات کی سیر کرتے رہے۔ ہم جیسے پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کے لئے وہ بالکل نئی دنیا تھی۔ شاہ بلوط کے جنگلات، رنگ برنگے پرندے اور ہرنوں کے ریوڑ اور نرمل جھرنے اور شفاف آسمان۔

ہماری دوسری منزل...... آکسفورڈ تھی اور یہاں ان واقعات کی یاد تازہ ہو گئی جو تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ تاریخی عمارتیں اور کالج۔ خوبصورت سیر گاہیں اور چراگاہوں کو سیراب کرتا ہوا دریا۔ سڑکیں کشادہ اور صاف، وہاں پہنچ کر میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی فکریں بھول گیا۔

آکسفورڈ میں ہمارا قیام خلاف توقع طویل ہو گیا۔ اور جب ہم وہاں سے چلے تو میں پھر اداس تھا۔ ماضی کے بھیانک آسیب اور مستقبل کے ہیبت ناک امکانات نے پھر میرا سکون لوٹ لیا۔ میں تو اس بوڑھے برگد سمان ہو گیا تھا جس کی جڑوں میں کیڑا لگ گیا ہو۔ چنانچہ اس پر اب کبھی بہار نہ آئے گی۔

آکسفورڈ سے میٹلاک...... وہاں کے مناظر سوئٹزرلینڈ کی یاد دلاتے ہیں۔ ویسے ہی جنگلات اور سرسبز پہاڑ اور پس منظر میں آلپس کی برف پوش چوٹیاں۔

ہمارا سفر جاری رہا۔

ہم ڈربی سے آگے روانہ ہوئے اور مسلسل دو مہینے تک کوبر لینڈ اور ویسٹ مور لینڈ کی سیر کرتے رہے۔ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں، شفاف جھیلیں اور ہرے بھرے جنگلات۔ یہ وہ مناظر تھے جو بے حس سے بے حس آدمی کو بھی مسحور کر سکتے تھے۔ لیکن وہ مناظر میرے لئے دلچسپ نہ تھے۔

ابھی ہم نے ویسٹ مور لینڈ کی پوری طرح سیر نہ کی تھی کہ وہ وقت قریب آ گیا جب ہمیں اپنے

اسکاچ دوست کے پاس پہنچ جانا تھا۔ چنانچہ ہم آگے روانہ ہوئے اس خوبصورت علاقے سے قبل از وقت رخصت ہونے کا مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ کیونکہ میں اپنے اس وعدے کی تکمیل کو، جو میں نے اس عفریت سے کیا تھا، قصداً ٹال رہا تھا، چنانچہ خوف تھا کہ وہ غصے سے بے تاب ہو کر مبادا پھر کوئی شیطنت کر بیٹھے اور میری اس تاخیر کا بدلہ میرے ان عزیزوں سے لے جنہیں میں اس کے وجود سے بے خبر چھوڑ آیا تھا۔

یہ خیال بڑا پریشان کن تھا۔ چنانچہ میرے شب و روز پھر بے قرار گزرنے لگے۔ میں ہر دم اپنے والد اور الزابیتھ کے خطوط کا منتظر رہنے لگا۔ اگر ان کا کوئی خط آنے میں دیر ہوتی تو میری حالت پاگلوں کی سی ہو جاتی اور جب کوئی خط آتا تو میں لفافہ چاک کرتے ڈرتا کہ مبادا اس میں کوئی بری خبر ہو، شاید اس نے پھر کسی کا گلا گھونٹ دیا ہو اور اس خون کے عوض شاید پھر کسی بے گناہ کو پھانسی دے دی گئی ہو۔

اور کبھی مجھے خیال آتا کہ ممکن ہے وہ عفریت آوارہ گردی میں میرے ساتھ ہی ہو۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا اور مجھے اپنا وعدہ یاد دلانے کے لئے ممکن ہے وہ میرے دوست کی جان لے لے......اور جب مجھے یہ خیال آتا تو میں کانپ جاتا اور ہینری کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتا۔ ہر وقت سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا اور ہر وقت چوکنا رہتا کہ اگر کہیں سے وہ نکل کر ہینری پر جھپٹے تو میں اسے بچا لوں گا۔

ایک ہفتے کے بعد ہم پرتھ کی سرحد پر تھے۔ ہم نے اپنے دوست کو اپنا منتظر پایا۔ لیکن اس وقت میں ہنسنے بولنے کے قابل نہ تھا اور نہ ہی ایسی بشاشت کا ثبوت دے سکتا تھا جیسا کہ ایک مہمان کو دینا چاہیئے اور میں یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ہینری اور ہمارا دوست بھی اداس ہو جائیں۔ چنانچہ میں نے ہینری سے کہا میں اکیلا ہی اسکاٹ لینڈ کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔

”تب تک تم ہمارے دوست کے یہاں قیام کرو اور مزے اڑاؤ“ میں نے کہا ”کم و بیش دو مہینے بعد میں تم سے یہیں آ ملوں گا اور یقین ہے کہ اس وقت تم بشاش دیکھو گے۔“

ہینری بھی میرے ساتھ آنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن اس کی موجودگی میرے کام میں حارج ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے بڑی رکھائی سے انکار کر دیا۔ ہینری کو یقیناً برا معلوم ہوا ہو گا لیکن میں کیا کر سکتا تھا...... خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یوں انکار کرتے وقت مجھے اپنے دل پر کتنا جبر کرنا پڑا تھا۔

”بہتر ہوتا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلتے۔“ اس نے کہا ”بہر حال میں تمہیں مجبور نہیں کرتا...... البتہ ایک درخواست ہے، کم از کم ہفتہ میں ایک بار اپنی خیریت کی اطلاع ضرور دینا اور جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔“

”تم میری طرف سے بے فکر رہو ہینری اور مزے اڑاؤ“ میں نے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی

مسکراہٹ لاکر کہا۔

چنانچہ میں نے اپنے دوست کو خدا حافظ کہا تا کہ کسی دور افتادہ اور غیر آباد خطے میں اپنے اس گھناؤنے کام کی ابتدا کرسکوں، چنانچہ کسی ایسے ہی خطے کی تلاش میں مَیں نے شمالی سطح مرتفع عبور کیا اور آرکینی پہنچا تو وہاں مجھے ایک ایسی جگہ نظر آئی جو اس کام کی تکمیل کے لئے ہر طرح مناسب تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا چٹانی جزیرہ تھا جو معلوم ہوتا تھا، کسی زیرِ آب زلزلہ کی وجہ سے اچانک سطح آب پر اُبھر آیا تھا۔ یہ جزیرہ کٹورے کی شکل کا تھا...... یعنی اس کے کنارے قدرے ابھرے ہوئے تھے اور اس کے پہلوؤں کو سمندر کی کف آلود موجیں تھپیڑے مارا کرتی تھیں۔ جزیرہ چونکہ پتھریلا تھا اس لئے تقریباً بنجر تھا۔ کہیں کہیں زرد گھاس اگ رہی تھی جس میں نمی نام کو نہ تھی۔ اس جزیرے کے باشندوں کی، جو تعداد میں پانچ تھے اور ان کی پانچ دس مریل گائیں تھیں۔ اور ان بیچاروں کو پینے کے لئے میٹھا پانی بھی پانچ میل دور سے، جہاں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، لانا پڑتا تھا۔

پورے جزیرے کی آبادی پانچ باشندوں اور تین کچے مکانات پر مشتمل تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو ایک مکان خالی پڑا تھا...... یہ مکان میں نے کرائے پر لے لیا۔ اس میں دو تنگ اور چھوٹے کمرے تھے اور چھت کے شہتیروں کو دیمک چاٹ رہی تھی اور گارے کی چنی ہوئی دیواریں صد سالہ بوڑھے کی کمر کی طرح بیچ میں سے خمیدہ ہوگئی تھیں اور فرش میں جگہ جگہ ایک ایک بالشت کے گڑھے تھے۔ میں نے مالک مکان سے درخواست کی کہ وہ مکان کی مرمت کرادے۔ میری درخواست منظور کر لی گئی۔ چنانچہ میں ضرورت کا فرنیچر لے آیا۔ جزیرے کے باشندوں کی فلاکت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب میں نے انہیں چند جوڑے کپڑوں اور کچھ اشیائے خورد و نوش دیں تو وہ مارے احسان مندی کے رو پڑے۔

بہر حال اس جزیرے اور جزیرے کے اس مکان میں مَیں نے اپنے کام کی ابتدا کی۔

میرے شب و روز مصروف گزرنے لگے۔ کبھی میں تھک جاتا اور شام خوشگوار ہوتی تو میں اپنے مکان سے، جسے اب تجربہ گاہ کہنا مناسب ہوگا نکل آتا اور تھوڑی دیر تک سنگستانی ساحل پر ٹہلا کرتا۔

اس طرح اس جزیرے میں میرے قیام کا ابتدائی زمانہ یوں گزرا کہ کبھی تو میں اپنی تجربہ گاہ میں بند رہتا اور کبھی ساحل پر ٹہلتا نظر آتا۔

جیسے جیسے وہ کام مدارج طے کرتا گیا گھناؤنا اور بھیانک ہوتا گیا۔ کبھی یوں ہوتا کہ کئی کئی دن تک میں اپنی تجربہ گاہ میں جانے کی جرأت نہ کرتا، اور کبھی یوں ہوتا کہ میں کئی کئی دن تک اپنی تجربہ گاہ میں بند رہتا۔ مجھے کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا۔ بس کام کئے جاتا کہ جلد از جلد اس سے فرصت پاکر اطمینان اور آزادی کی سانس لے سکوں۔ ابتدا میں وہ کام مجھے اتنا نفرت انگیز اور بھیانک معلوم نہ ہوا تھا لیکن جیسے

جیسے وہ زبردست انسانی ڈھانچہ بنتا گیا میری نفرت اور میرا خوف بڑھتا گیا۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون سیال آگ میں تبدیل ہو گیا اور میری آنکھیں میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں کی گھناؤنی اور ہیبت ناک تخلیق کو نفرت وخوف سے دیکھنے لگیں۔ اس طرح وہاں، اس تقریباً غیر آباد جزیرے میں، میرے وجود پر خوف واضطراب مسلط ہونے لگا۔ میں اکیلا تھا اور ایک ایسا کام کر رہا تھا جس سے خود مجھے نفرت تھی اور یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ میں اعصابی ہیجان میں مبتلا ہو گیا۔ میری آنکھیں خوف سے پھیل پھیل کر چاروں طرف دیکھتیں کہ کوئی دم میں وہ بھیانک وجود میرے سامنے کھڑا نظر آئے گا جسے میں نے حیات بخشی تھی۔

اکثر یوں ہوتا کہ میں زمین پر نظریں گاڑے بیٹھا رہتا اور نظریں اٹھاتے ڈرتا کہ شاید وہ اپنی حوا کو لینے آ گیا ہو۔ شاید وہ میرا شکریہ ادا کرنے آیا ہو۔ شاید وہ...... لیکن میں اسے دیکھنا نہ چاہتا تھا اور میں اس کی آواز بھی سننا نہ چاہتا تھا...... چنانچہ میں اس بچے کی طرح جسے کوئی ڈرا رہا ہو آنکھیں بھینچ کر ہاتھوں سے اپنے دونوں کان بند کر لیتا۔

اس وقت ایسی حالت ہو رہی تھی میری جبکہ ڈھانچہ بن کے تیار ہو گیا...... میرے دل میں امید کا چراغ جل اٹھا لیکن فوراً ہی مایوسی اور خوف کے جھکڑوں نے اسے بجھا دیا...... خدا جانے میرا انجام کیا ہو؟ اس کام کی تکمیل کے بعد کیا واقعی میں زندگی کی دلچسپیوں اور مسرتوں کو اپنا سکوں گا؟

اس سوال کا میرے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہ تھا۔



بیسواں باب

ایک شام میں اپنی تجربہ گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

اس دن میں دن بھر کام کرتا رہا تھا اس لئے ایک طرح کی دماغی اور جسمانی تھکن محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج رات کو آرام کروں یا کام جاری رکھوں کہ جلد از جلد اس سے فرصت پا جاؤں؟ میں ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اچانک خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ کچھ ایسا لامتناہی تھا کہ میں گھبرا گیا۔ میں نے ان خیالات کو جھٹک دینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی......اور مجھے اس بات پر غور کرنا ہی پڑا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا وہ مناسب ہے؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟

تین سال پہلے بھی تو میں ایک ایسے ہی کام میں مصروف تھا......اس وقت بھی تو میں نے اسی طرح شب و روز محنت کی تھی......اور نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ میں نے نہ صرف ایک ہیبت ناک ہستی بلکہ ایک شیطان تخلیق کیا جو معصوم بچوں کے گلے گھونٹ کر اور بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکتے دیکھ کے خوش ہوتا ہے اور اب میں ایسی ہی دوسری ہستی تخلیق کرنے والا ہوں اور نہیں جانتا کہ اس ہستی کا مزاج کیسا ہوگا؟ اس کا رجحان کس طرف ہوگا؟ اس کی فطرت کیا ہوگی اور وہ کون سا کام کر کے مسرت اور سکون حاصل کرے گی؟ ممکن ہے وہ پہلے شیطان سے زیادہ کینہ توز، بے رحم اور انتقام جو ہو۔ مانا کہ پہلا جاندار قسم کھا چکا ہے کہ وہ اپنی حوا کو لے کر جنگلوں کی طرف چلا جائے گا اور کبھی انسانوں کو اپنی صورت نہ دکھائے گا لیکن اس حوا کا کیا بھروسہ جسے میں بنا رہا ہوں؟ اس نے تو ایسی کوئی قسم نہیں کھائی؟ اس نے تو ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا؟ چنانچہ ممکن ہے وہ ایسا کوئی وعدہ نہ کرے یا یہ کہہ دے کہ وعدہ اس کے ساتھی نے کیا ہے جس کو وفا کرنے کے لئے وہ مجبور نہیں۔ پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے کے بجائے نفرت کرنے لگ جائیں۔ وہ جو دنیا میں موجود ہے، خود اپنی بدصورتی سے نفرت کرتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ جب اپنی ہی بدصورتی کو جنس مخالف میں دیکھے تو اس سے نفرت کرنے لگے؟ پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ ہستی جسے میں اب بنا رہا ہوں، اپنے آدم کی طرف سے نفرت و حقارت سے منہ پھیر لے اور انسانوں سے محبت اور ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرے؟ کیونکہ بدصورت سے بدصورت انسان بھی اس حوا کو اپنے آدم کے مقابلے میں قبول صورت معلوم ہوگا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ وہ اپنے آدم کو چھوڑ بیٹھے اور موخر الذکر پھر غصے سے بے قابو ہو کر انسانوں سے انتقام لینے پر تل جائے دوبارہ وہ تنہائی اور اداسی محسوس کرے۔ دوبارہ انسانوں کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اس

میں ناکام رہ کے وہ دوبارہ انسانوں کا دشمن بن جائے۔

اور بالفرض محال اگر وہ دونوں جنگل کی طرف چلے بھی گئے تو ان کی آپس کی محبت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی کہ ان کی اولاد ہوگی اور بھیانک ہستیوں کی تعداد دنیا میں بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ ان کے وجود کے باعث انسان ایک عام بے چینی اور خوف کے عالم میں زندہ رہے گا..... تو کیا یہ میری خود غرضی نہیں ہے کہ میں اپنی اور عزیزوں کی جان بچانے اور مسرتیں حاصل کرنے کے لئے بنی نوع انسان پر ایک ایسا عذاب نازل کر جاؤں جو نسلاً بعد نسلاً بڑھتا ہی جائے؟ تو کیا میں جو کچھ کر رہا ہوں مناسب کر رہا ہوں؟

اس عفریت کی، جسے میں نے تین سال پہلے تخلیق کیا تھا، مثال میرے سامنے تھی۔ اس شیطان کی دھمکیوں نے مجھے بالکل ہی سہما دیا تھا۔ میری سمجھ بوجھ رخصت ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس شام اور اس جزیرے کے اس مکان میں پہلی دفعہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اگر میں نے یہ جوڑا بنائی تو آنے والی نسلیں مجھ پر قیامت تک لعنت بھیجتی رہیں گی۔ یہ خود غرضی تھی۔ سراسر خود غرضی تھی۔ میں ساری دنیا کا سکون بیچ کر محض اپنا سکون خرید رہا تھا سودا بے حد مہنگا تھا اور سو فیصدی خود غرضانہ۔

میں کانپ گیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میرے منہ سے ایک آہ نکل گئی اور غیر شعوری طور پر میری نظر اوپر اٹھ گئی۔ روشندان کے فریم میں ایک ہیبت ناک چہرہ جڑا ہوا تھا۔ مردہ چاندنی میں اس کی گہری گہری جھریاں اور بھی زیادہ گہری معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ وہی تھا..... وہی..... جیسا کہ اس نے کہا تھا وہ چھپ کر میرے کام کی رفتار دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ تو ثابت ہوا کہ وہ شروع سے ہی اس سفر میں میرے ساتھ رہا تھا۔

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا..... اور دفعتہً مجھے دنیا کی ساری برائیاں، ساری شیطنت اور بربریت اس ایک ہستی میں نظر آئی۔ وہ مجسم شیطان تھا۔ دوزخی عفریت تھا۔ وہ میرے بھائی ولیم اور جسٹائن کا خونی تھا اور پتہ نہیں ابھی وہ کتنوں کے خون کرنے والا تھا..... اور مجھے اپنے وعدے کے ہیبت ناک اور لرزا دینے والے نتائج کا احساس ہوا..... میری نظر کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا..... میں ایک اور شیطان تخلیق کر رہا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی ناقابلِ برداشت لہر دوڑ گئی..... میرے دماغ میں انجن چلنے لگے اور میرا پورا بدن پھنکنے لگا۔ میری رگوں میں خون سنسنا رہا تھا۔ مجھ پر جنون کا دورہ سا پڑا۔ میں دانت پیستا ہوا اٹھا۔ میز پر نیا بنایا ہوا ڈھانچہ پڑا تھا۔ میں نے اس کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اس نے روشندان میں سے میری یہ حرکت دیکھی۔ اس نے دیکھا کہ میں اس کی ساری مسرتوں اور امیدوں کو نوچے ڈال رہا تھا۔ انتقام اور مایوسی کی شیطانی غراہٹ کے ساتھ وہ روشندان کے سامنے سے ہٹ گیا۔

میں تجربہ گاہ میں سے نکل آیا۔ دروازہ بند کر کے قفل لگایا اور مٹھیاں بھینچے دوسرے کمرے میں آ گیا۔ میں اس کام کو دوبارہ شروع نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا۔

کئی گھنٹے گزر گئے اور اس تمام عرصے میں مَیں کھڑا سمندر کو بے چینی سے کروٹیں بدلتا دیکھتا رہا۔ سمندر سنسان تھا۔ اچانک ایک چھوٹی سی کشتی کسی طرف سے نکل کر اپنی طرف آتی نظر آئی۔ وہ میرے مکان کے قریبی کنارے سے لگ گئی۔ کوئی اس میں سے اتر کر ساحل پر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میرے گھر کا دروازہ چرچرایا۔ جیسے کسی نے بڑی احتیاط سے کھولا ہو۔ میں کانپ گیا اور مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنے پڑوسیوں، جن کا مکان چند قدم کے ہی فاصلے پر تھا، بیدار کردوں۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی اور خوف کی انتہا نہ رہی جب میں کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ آپ نے کبھی خواب دیکھا ہوگا کہ کوئی بلا آپ کا پیچھا کر رہی ہے اور آپ لاکھ کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس وقت میری حالت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے آواز نہ نکلی۔

بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ایک کافی لمبا اور سوکھا ہاتھ، جس کی پشت پر بڑی بڑی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اندر آیا اور پھر وہ بھیانک صورت آدم میرے سامنے کھڑا تھا اس نے دروازہ بند کیا۔ آہستہ آہستہ میرے قریب آیا اور اپنی غیر قدرتی آواز میں بولا۔

''میں نے دیکھا کہ تم کیا کر رہے تھے اور تم نے کیا کیا؟ کیا واقعی تم اپنا وعدہ بھول گئے؟ آخر کیوں تم نے اس ڈھانچے کے ٹکڑے اڑا دیئے میں بہت زیادہ مصائب برداشت کر چکا ہوں۔ میں دریائے ری ہارٹن کی دشوار گزار گھاٹیوں اور بلند پہاڑوں کو خاطر میں نہ لا کر محض ایک کے سہارے تمہارے ساتھ ساتھ یہاں تک آیا ہوں۔ میں نے سردی، گرمی اور بھوک پیاس کیا اسی دن کے لئے برداشت کی تھی؟ کیا میں اسی لئے یہاں آیا تھا کہ اپنی امیدوں کے پرخچے اڑتے دیکھوں؟''

''چلے جاؤ یہاں سے...... چلے جاؤ۔'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں دوسرا شیطان نہ بناؤں گا۔''

''ذلیل! غلام! میں نے ہر طرح تمہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی لیکن ثابت ہوا کہ تم اوّل درجے کے ضدی اور احمق ہو۔ تم اس قابل ہی نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔ یہ نہ بھولو کہ تم نے مجھے بنایا ہے۔ عام انسانوں سے زیادہ پرقوت۔ چنانچہ میں چاہوں تو کیا نہیں کر سکتا؟ تم نے مجھے بنایا ہے تم میرے خالق ضرور ہو لیکن میں تمہارا آقا ہوں۔ میں جبراً تم سے جو چاہوں کروا سکتا ہوں۔''

''وہ دن گئے جب میں تم سے ڈرا کرتا تھا۔ تمہاری یہ دھمکیاں اب مجھے سہا نہیں سکتیں۔ اب میں

وہ منحوس کام کبھی نہ کروں گا خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ میں تیرا خاتمہ کر دوں تو چلا جا یہاں سے۔"

اس نے میرے غصے سے سرخ چہرے کی طرف دیکھا اور دانت پیس کے بولا۔

"میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ہر انسان بلکہ جانور کو بھی اس کی شریک حیات ملے اور میں اکیلا تڑپتا رہوں۔ نہیں یہ کبھی نہ ہوگا۔ میں اچھا تھا۔ رحم دل تھا۔ لیکن اب ایسا نہ رہوں گا...... میں انتقام لوں گا ...... سخت اور عبرت ناک اور اب جو کچھ بھی ہوگا اس کی ذمہ داری تم پر، صرف تم پر عائد ہوگی۔ وہ وقت دور نہیں جب میرے انتقام کی آگ تمہاری مسرتوں اور آرزوؤں کو خاک سیاہ کر دے گی۔ میں تنہا اور اداس رہوں۔ میرا سکون عنقا ہو جائے۔ میں ہمدردی اور محبت سے محروم کر دیا جاؤں اور تم خوش وخرم رہو، زندگی سے لطف حاصل کرو اور کسی کی محبت سے لطف اٹھاؤ...... نہیں یہ کبھی نہ ہوگا...... انتقام کی وہ آگ، جو روشن آج ہوئی، اس وقت تک سرد نہ ہوگی جب تک کہ تم بھی میری طرح، بلکہ مجھ سے بھی زیادہ، دکھی نہیں ہو جاتے۔ مجھے اس وقت تک چین نہ آئے گا جب تک کہ تمہیں بالکل ہی تباہ نہ کر دوں گا۔ میں اس وقت ہی مسکراؤں گا جب تم اپنے دکھی وجود پر چمکتے ہوئے سورج پر لعنت بھیجو گے اور اس وقت قہقہے لگاؤں گا جب تمہاری آنکھوں سے آنسو اور لبوں سے ہچکیاں نکل رہی ہوں گی۔

ہوشیار ہو جاؤ کہ میں نڈر، بے پروا اور عظیم قوت کا مالک ہوں۔ میں عیار ہوں۔ میں سانپ کی طرح موقعہ کا انتظار کروں گا اور سن لو کہ میرے کاٹے کا کوئی منتر نہ ہوگا...... اس وقت تم پچھتاؤ گے۔ اپنی حماقت پر آنسو بہاؤ گے لیکن وقت نکل چکا ہوگا۔ تمہارے دل میں ناسور پڑ چکے ہوں گے دن تمہارے لئے بھیانک اور راتیں بھیانک تر ہو چکی ہوں گی اور تمہارے ناسور زدہ دل میں یادوں کے آسیب چیخ رہے ہوں گے۔"

"بکواس بند کر...... تیری یہ دھمکیاں مجھے اس کام کے لئے تیار نہیں کر سکتیں...... چلا جا یہاں سے۔"

"بہت اچھا جاتا ہوں۔ لیکن پھر آؤں گا...... تمہاری شادی کی پہلی رات کو میں پھر آؤں گا۔ جب تم اپنی بیوی کو آغوش میں لے رہے ہوگے، جب تم اپنے مستقبل کے متعلق دل خوش کن اندازے لگا رہے ہوگے تو اس وقت۔ اے میرے خالق! اور میرے دشمن! تم اپنے بندہ کو حجلۂ عروسی میں موجود پاؤ گے۔"

"میں غصہ سے بے قابو ہو کر آگے بڑھا اور چیخ کر بولا۔

"میں اسی وقت تیرا خاتمہ کئے دیتا ہوں۔"

اور میں اس پر جھپٹ پڑا۔ لیکن اس نے اپنا ایک ہاتھ ہلا کر جس طرح ہم پالتو بلی کو ہٹاتے ہیں

۔ مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں دیوار سے جاٹکرایا۔ وہ مکان سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد ہی میں نے اسے کشتی میں بیٹھے دیکھا۔ کشتی حیرت انگیز رفتار سے بہتی ہوئی آگے بڑھی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''اس'' کی آواز بدستور میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ میں نے کیوں اس کا خاتمہ نہ کر دیا؟ یہ بات سمجھ نہ سکا۔ وہ مجھے تباہ کرنے کی دھمکی دے گیا تھا اور میں نے اس کا تعاقب نہ کیا...... خدا جانے کیوں نہ کیا......! شاید وہ کسی بستی کی طرف گیا تھا......اور میں اس خیال سے کانپ گیا کہ خدا جانے اب اسکے غصے کا شکار کون ہوگا۔ اس کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

''جب تم اپنی بیوی کو آغوش میں لے رہے ہوگے......تو میں پھر آؤں گا۔''

تو گویا میری شادی کی پہلی رات کو میری قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اسی رات غالباً میں مارا جاؤں گا......اس رات وہ مجھ سے انتقام لے گا......اپنی موت کے تصور سے میں ذرا نہ گھبرایا۔ لیکن جب میں نے الزابیتھ کی حالت کا تصور کیا تو میری آنکھیں پرنم ہوگئیں......اب شادی کی پہلی ہی رات کو وہ بیوہ ہو جائے گی......میرے خدا......کیا واقعی یوں ہوگا؟ کیا اس رات کو واقعی الزابیتھ بجائے اس کے کہ میری آغوش میں سمٹے اور شرمائے وہ میری لاش پر آنسو بہائے گی......کیا واقعی اس رات وہ مسکرانے کی بجائے چیخ چیخ کر روئے گی......؟ اگر ایسا ہوا تو وہ دیوانی ہو جائے گی......اور الزابیتھ کی اس وقت کی حالت تصور کر کے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور پھر میں نے ایک آخری فیصلہ کیا...... میں آخر دم تک اس عفریت کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ اپنی خاطر اور دوسروں کی خاطر جدوجہد کروں گا۔ یا تو خود مارا جاؤں گا، یا اس کا خاتمہ کردوں گا......اور اس فیصلے کے ساتھ ہی مجھے ذرا سکون میسر آیا۔

رات ختم ہوئی۔ سورج طلوع ہوا۔ میں رات بھر سو نہ سکا اور اس وقت کچھ عجیب طرح کی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میرے اعضاء مضمحل تھے اور دماغ سُن۔ میں ساحل پر بے مقصود ٹہلنے لگا اور اچانک پھر میرے دل کی گہرائیوں میں ایک طوفان سا بپا ہوگیا اور میرا جی چاہا کہ اسی وقت خودکشی کرلوں۔ سمندر میں کود پڑوں یا اس پتھر سے اپنا سر ٹکرادوں اور اس طرح ایک ہی وقت میں اپنی ساری بے چینی کا خاتمہ کردوں۔ اگر میں زندہ رہا بھی تو کب تک؟ ایک نہ ایک دن اس عفریت کے ہاتھوں مارا جاؤں گا...... اور جب تک زندہ رہوں گا خدا جانے کس کس کی لاش پر آنسو بہاؤں گا۔ غالباً میرے عزیز میرے سامنے مارے جائیں گے۔ اور پھر......لیکن......رات کو تو میں نے کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا۔ پھر اس

وقت میں خودکشی کے متعلق کیوں سوچ رہا ہوں؟ کیا واقعی میں قنوطی بن گیا ہوں؟ واقعی میں اتنا بزدل اور بودا ہوں؟۔

اور میرے دل میں متضاد جذبات میں شدید کش مکش ہونے لگی، اس اضطراب نے مجھے بالکل ہی دیوانہ کر دیا اور میں پتھریلے ساحل پر تقریباً دوڑنے لگا۔

دوپہر ہو رہی تھی کہ میں نڈھال ہو کے ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا اور چند ثانیوں بعد ہی گہری نیند سو گیا۔ میں رات بھر جاگتا اور بے چین رہا تھا۔ چنانچہ یہ نیند ایک نعمت ثابت ہوئی جب بیدار ہوا تو اپنے آپ کو تازہ دم اور قدرے پُرسکون محسوس کر رہا تھا اور اس نیند کے بعد میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ میں انسانی برادری سے کٹ نہیں گیا ہوں۔ میں اب بھی زندگی سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔ زندگی اب بھی مجھے بہت کچھ دے سکتی ہے۔ اور میں اگر کسی کو جان دے سکتا ہوں تو اس سے جان لے بھی سکتا ہوں۔

''تو اس رات مجھے حجلۂ عروسی میں پاؤ گے'' اس کے الفاظ مجھے یاد آئے لیکن میں نے پہلے کی طرح سے بے چینی اور خوف محسوس کیا۔

سورج افقِ مغرب کی طرف ڈھل چکا تھا لیکن میں وہیں، درخت کی چھاؤں میں بیٹھا گھاس کے تنکے چبا چبا کر اپنی بھوک کو بہلا رہا تھا۔

دفعتہً ایک کشتی میرے سامنے ہی آ کر رکی اور ایک شخص کود کر ساحل پر آ گیا اور مجھے درخت کے نیچے بیٹھا دیکھ کر سیدھا میری طرف آنے لگا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنے والے نے قریب آ کر مجھے سلام کیا اور کاغذات کا ایک پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ میرے نام کے خطوط تھے ایک خط ہینری کا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ میں فوراً اس کے پاس پہنچوں کیونکہ اس کے ہندوستان جانے کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اور وہ بہت جلد لندن کے لئے روانہ ہو جانے والا تھا وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں چند دن ساتھ ساتھ رہیں کیونکہ خدا جانے پھر کب ملنا نصیب ہو۔ اس وقت وہ پرتھ میں مقیم تھا اور مجھے اس سے وہیں ملنا تھا۔ میں نے تیسرے دن اس جزیرے سے رخصت ہو جانے کا فیصلہ کیا۔

لیکن وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ایک کام کرنا ضروری تھا۔ مجھے کیمیا کے آلات جمع کر کے تھیلے میں بھرنے تھے اور اس کے لئے مجھے اس کمرے میں جانا تھا جہاں اس ڈھانچے کے اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ میں دوبارہ اس کمرے میں جانا نہ چاہتا تھا لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی میں دل پر جبر کر کے اس کمرے میں داخل ہوا۔ فرش پر اعضاء اور ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ میں کانپ گیا اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں نے کسی شخص کا گوشت نوچ

ڈالا ہو اور اس کے بدن کے ٹکڑے اڑا دیئے ہوں۔ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ میرے پیر جواب دے گئے اور اگر میں دیوار کا سہارا نہ لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ میں نے بدقتِ تمام اپنے حواس بجا کیئے، لرزتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آلات سمیٹنے لگا۔ اور پھر آلات کا تھیلا اٹھائے بھاگ کر باہر آ گیا۔ لیکن ابھی میں نے اس کمرے کا دروازہ بند بھی نہ کیا تھا کہ ایک خیال بجلی کی طرح تیزی سے میرے دماغ میں کوند گیا...... اگر میں نے وہ نُچا ہوا ڈھانچہ یوں ہی چھوڑ دیا تو خدا جانے لوگ میرے متعلق کیا سوچیں گے۔ خدا جانے وہ مجھے کیا تصور کریں گے۔ خونی...... یا شاید آدم خور...... ممکن ہے میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں...... چنانچہ ان بکھرے ہوئے اعضاء کو اس کمرے میں چھوڑ دینا حماقت تھی...... میں ہمت کر کے پھر اس کمرے میں گیا۔ اعضاء، ہڈیاں، پٹھے اور رگیں وغیرہ سمیٹ کر ایک ٹوکرے میں بھر لیں پھر ان کے اوپر بہت سے پتھر رکھ دیئے اور سوچا کہ رات کو یہ ٹوکرا سمندر میں غرق کر دوں گا اور پھر کسی کو معلوم نہ ہو گا کہ میں اس ویران جزیرے میں جون سا بھیانک کام کر رہا تھا۔

میں پھر اس درخت کے نیچے جا بیٹھا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا ایک ہی رات میں میرے خیالات میں ایسا زبردست تغیر ہوا تھا کہ اس پر میں خود بھی حیران تھا۔ گزشتہ رات سے پہلے میں اپنا وعدہ بہر طور جلد از جلد پورا کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس شیطان کے شر سے محفوظ رہوں۔ لیکن اب جیسے میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عفریت کی لرزہ خیز دھمکی کے الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے بہر حال کر کے رہے گا۔ تاہم ایک لمحے کے لئے بھی مجھے اس مکروہ کام کو دوبارہ شروع کرنے کا خیال نہ آیا۔ میں نے ایک شیطان بنا کے سخت غلطی کی تھی اور اب دوبارہ وہی غلطی نہ کرنا چاہتا تھا۔

▬▬▬▬▬▬▬▬▬▬

رات کے دو بج چکے تھے جبکہ زرد رو چاند طلوع ہوا۔ میں اٹھا، ٹوکرا اٹھایا جس میں اعضاء اور ہڈیوں وغیرہ کے علاوہ پتھر رکھے ہوئے تھے، اور ایک چھوٹی سی کشتی میں، جو ہیں ایک پتھر سے بندھی ہوئی تھی، بیٹھ گیا۔ اس وقت جزیرے کے باشندے گہری نیند سو رہے تھے اس لئے مجھے یہ خوف تو نہ ہی نہیں کہ کوئی مجھے دیکھ لے گا۔ میں نے چپو اٹھائے اور کشتی کو ساحل سے چار میل دور لے آیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کبھی کبھار کسی ماہی گیر کی کشتی میرے قریب سے گزر کر ساحل کی طرف تیزی سے نکل جاتی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی کشتی کا رخ ذرا سا موڑ دیا کہ ان ماہی گیروں کی کشتیوں سے دور نکل جاؤں...... اور اب سمندر سنسان تھا اور میں نے ایک بار محسوس کیا جیسے میں کوئی گھناؤنا جرم کر چکا ہوا

اور اب اس کے آثار مٹانے جا رہا ہوں۔ میں کانپنے لگا۔

آسمان کی نیلاہٹوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے بادل کے ایک ٹکڑے نے چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ سطح سمندر پر تاریکی بکھر گئی۔ موقع غنیمت جان کر میں نے وہ ٹوکرا سمندر میں چھوڑ دیا اور کشتی کو اس جگہ سے دور ہٹا لایا۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے اور ہوا سرد تھی تاہم وہ مجھے فرحت بخش رہی تھی۔ میرے دل و دماغ پر سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔ اور میں ایک طرح کی بشاشت، جو پچھلے کئی مہینوں سے محسوس نہ کی تھی، محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کے بجائے کہ میں کشتی کو ساحل کی طرف لے جاتا اسے اور آگے بڑھا لایا کہ تھوڑی دیر تک پرسکون سمندر پر بہتا رہوں تاکہ میری یہ بشاشت، جو میرے لئے ایک خزانے جیسی تھی، دیر تک قائم رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کشتی کا رخ ساحل کی طرف پھیر دیا۔ خیال تھا کہ وہ ہوا اور موجوں کے سہارے ساحل تک پہنچ جائے گی چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی اور سمندر کا ہلکا ہلکا شور مجھے گویا لوریاں دے رہا تھا۔ اس لئے میں کشتی میں دراز ہو گیا اور ایسا بے خبر سویا کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا۔

جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ سورج طلوع ہو کر کافی بلند ہو چکا تھا ہوا تیزی سے پھنکار رہی تھی، موجوں کے شور میں شدت آ گئی تھی اور میری کشتی دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شمال مشرقی ہوا میری کشتی کو اس جزیرے سے، جہاں سے میں چلا تھا۔ بہت دور گھسیٹ لائی تھی۔ میں نے کشتی کو اس جزیرے کی طرف موڑنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اگر دوبارہ میں نے ایسی کوشش کی تو کشتی میں پانی بھر جائے گا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے تہہ آب ہو گی۔ اس لئے اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ کشتی کو ہوا اور موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور یہی میں نے کیا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں شدید خوف و ہراس محسوس کر رہا تھا۔ اول تو میں شروع سے ہی جغرافیہ کے علم میں کورا رہا تھا اور پھر میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ تھا نہیں، سوائے سورج کے جس سے میں سمت کا اندازہ لگا سکتا اور پھر سورج کے، طلوع و غروب سے یہ معلوم کرنا ناممکن تھا کہ کشتی مجھے کس طرف اور کون سے انجانے دیس میں لے جا رہی تھی۔ ممکن تھا کہ کشی بہتی بہاتی ناپید کنار اٹلانٹک میں پہنچ جاتی اور میں بھوک و پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا یا یہ بھی ممکن تھا کہ سمندر کی غضیلی موجیں میری کشتی کو اوندھا دیتیں اور سمندر کی اتھاہ گہرائیاں میری آخری آرام گاہ ثابت ہوتیں۔ مجھ سے ساحل چھوٹے کئی گھنٹے ہو چکے تھے اور میں اپنے معدے میں بھوک اور پیاس کی اینٹھن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اوپر نظر کی۔ آسمان بادلوں سے سیاہ ہو رہا تھا میں نے سمندر کی طرف دیکھا جو میرے خیال میں میری قبر بننے والا تھا۔

"میرے آدم" میں نے دانت پیس کر کہا "لے لے! تیرا انتقام، بہر حال پورا ہوا۔"

اور مجھے اپنے والد، الزابیتھ اور ہینری کا خیال آیا۔ یہ لوگ اس عفریت کے وجود سے بے خبر اور میری واپسی کے منتظر ہوں گے۔ میں اسی سمندر میں غرق ہو جاؤں گا۔ وہ عفریت اب انہیں لوگوں سے انتقام لے گا۔ یہ خیال اتنا بھیانک تھا کہ اس حال میں بھی، جبکہ میری زندگی کے چند ہی گھنٹہ باقی رہ گئے تھے، میں امکانات پر..... غور کرنے لگا۔

بادلوں کی دھجیوں میں سے نظر آتا ہوا سورج مغرب کی طرف جھک گیا ہوا کی تیزی کم ہوگئی اور سمندر رفتہ رفتہ پرسکون ہونے لگا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ چپو چلاتا۔ سر چکرا رہا تھا اور طبیعت مالش کر رہی تھی چنانچہ میں بیٹھ رہا۔ دفعتہً شمال کی طرف مجھے سطح آب پر ایک بلند اور دھندلی سی لکیر نظر آئی۔ یقیناً وہ ساحل تھا۔ میں بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا۔ لیکن اس لکیر کو دیکھ کر میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اپنے کپڑے اتار کر ان سے بادباں بنایا اور کشتی کا رخ اس لکیر کی طرف پھیر دیا۔ کتنی عزیز چیز ہے زندگی۔ اس حالت میں بھی، جبکہ میں موت کی آرزو کر رہا تھا، خشکی کی لکیر دیکھ کر مارے خوشی کے رو پڑا تھا، حالانکہ جانتا تھا کہ جب تک وہ عفریت دنیا میں موجود ہے زندگی سے میں کچھ حاصل نہ کرسکوں گا۔

دور سے وہ ساحل مجھے چٹانی، ننگا اور ویران معلوم ہوا تھا۔ لیکن جب میری کشتی اس کے قریب پہنچی تو میں نے دیکھا کہ ساحل بنجر نہ تھا اور پھر دو چار کشتیوں کی موجودگی آبادی کا پتہ دے رہی تھی۔ ساحل ناہموار تھا۔ میں ان نشیب و فراز کا جائزہ لے رہا تھا کہ میری نظر ایک بلند مینار پر پڑی جو معلوم ہوا کہ ایک راس کے عقب میں قائم تھا۔ چنانچہ میں نے کشتی اس راس کی طرف موڑ دی۔ اس طرف یقیناً بستی تھی جہاں سے مجھے کھانا اور پانی مل سکتا تھا۔

خوش قسمتی سے میری جیب میں تھوڑی سی رقم موجود تھی۔ کشتی راس کے قریب پہنچی تو مجھے وہاں ایک خوبصورت شہر نظر آیا اور ایک چھوٹی سی بندرگاہ..... میری کشتی بھی بندرگاہ میں داخل ہوئی۔

میں کشتی کو کنارے پر ایک چوبی ستون سے باندھ کر اپنے لباس کے بادبان لپیٹ رہا تھا کہ میرے طرف بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت میری حالت وحشیوں کی سی ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ غالباً مجھے اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئے اور بجائے اس کے کہ وہ میری کچھ مدد کرتے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور میری طرف دیکھ دیکھ کے ایسے اشارے کرنے لگے کہ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو ان کے یہ اشارے مجھے چوکنا اور ہوشیار کر دیتے۔ ان کی سرگوشیوں کے کے چند الفاظ میں نے سن لئے۔ وہ لوگ، انگریزی بول رہے تھے۔ چنانچہ میں نے اسی زبان میں پوچھا۔

"دوستو! کیا آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔"

''یہ تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا'' ایک شخص نے نہایت روکھے پن سے جواب دیا۔'' غالباً تم ایسی جگہ آ گئے ہو جہاں آنا نہ چاہتے تھے یا تمہیں آنا نہ چاہئے تھا۔ بہر حال تمہیں فوراً بھیج دیا جائے گا جہاں تمہیں ہونا چاہئے۔''

ایسے سرد مہرانہ اور گول گول جواب پر میں حیران رہ گیا۔ دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ میرے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کے بشرے سے غصہ اور نفرت عیاں تھی۔

''بھائی صاحب! جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میں نے کبھی کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا اور نہ کسی سے سنا کہ انگریز کسی اجنبی سے استقبال ایسے اکھڑ پن سے کرتے ہیں۔''

''ممکن ہے نہ پڑھا ہو اور نہ ہی سنا ہو۔ تاہم یہ تو تم بھی جانتے ہو گے کہ تمہارے ملک میں بدمعاشوں سے سخت نفرت کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہم بھی کرتے ہیں۔''

جب اس عجیب و غریب گفتگو کا سلسلہ جاری تھا تو میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف بھیڑ بھاڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر شخص کے بشرے سے سخت غصہ اور حقارت عیاں تھی۔ چنانچہ اب میں ذرا چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ قسمت شاید مجھے غلط جگہ لے آئی تھی۔ میں نے بستی کی سرائے کا نام پوچھا تو کوئی جواب نہ ملا، میں آگے بڑھا تو بھیڑ مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھنا اٹھی اور لوگوں نے میرے چاروں طرف اپنا دائرہ تنگ کر لیا۔ بھیڑ میں سے ایک شخص جو مغلوب الغضب معلوم ہوتا تھا اور جس کے بشرے سے خشونت عیاں تھی، نکل کر میرے قریب آیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور دوسروں کی بہ نسبت تہذیب کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

''جناب! آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے میرے ساتھ مسٹر کرون کے پاس چلنا ہوگا۔''

''مسٹر کرون! یہ کون صاحب ہیں؟ اور میں کیوں چلوں ان کے پاس؟ کیا یہ آزاد ملک نہیں ہے؟''

''شریف لوگوں کے لئے بے شک یہ آزاد ملک ہے۔ مسٹر کرون یہاں کے مجسٹریٹ ہیں۔ ہم آپ کو انہیں کے پاس لئے جا رہے ہیں۔ گزشتہ رات کسی انجان شخص کی لاش ملی ہے۔ کسی بدمعاش نے اس کا خون کر دیا ہے اگر واقعی آپ بے گناہ ہیں تو مجسٹریٹ کے پاس جاتے گھبراتے کیوں ہیں؟ آپ اپنی بے گناہی ثابت کر دیں قصہ ختم ہوا۔''

اس خلاف توقع جواب نے مجھے بالکل ہی گھبرا دیا۔ لیکن میں نے اپنی گھبراہٹ چھپائے رکھی۔ میں بے گناہ تھا اور بڑی آسانی سے اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ بھیڑ ہمارے پیچھے چلی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم غالباً بستی کی سب سے بلند اور خوبصورت عمارت کے سامنے تھے۔ بھوک اور پیاس سے میں نیم جاں ہو رہا تھا، آنکھوں کے سامنے لال پیلے دھبے سے ناچ رہے تھے اور ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ میں بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ لیکن

میں نے اپنی ساری جسمانی قوت جمع کر کے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ان لوگوں کے سامنے اگر میں بے ہوش ہو گیا ہوتا تو ان کے شکوک یقین میں تبدیل ہو جاتے۔

مجھے یقین تھا کہ میں اپنی بے گناہی ثابت کر دوں گا......لیکن انسان کو ہونے والے واقعات سے بے خبر رکھا گیا ہے۔اسے یہ تک خبر نہیں ہوتی کہ آئندہ چند منٹوں میں اس پر کیا بیتنے والی ہے۔ چنانچہ چند لمحوں بعد ہی جو کچھ ہوا اس کی مجھے قطعی توقع نہ تھی۔

کپتان صاحب! یہاں میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہوتا ہوں کیونکہ جو کچھ ہوا وہ اتنا بھیانک اور غمناک تھا کہ اس کی پوری کہانی بیان کرنے کے لئے مجھے اپنے دل پر جبر کرنا پڑے گا......اب میں جو کچھ بیان کرنے والا ہوں وہ میری زندگی کا ایک ایسا حادثہ ہے جس نے میری روح تک کی بنیادیں ہلا دیں اور میرے دل میں خوف و مایوسی کے ایسے شدید جذبات جاگزیں کر دیئے کہ میرے دل سے اپنی ذلت و رسوائی حتیٰ کہ موت کا خوف بھی جاتا رہا۔تو اجازت دیجئے کہ میں چند ثانیوں تک خاموش رہ کے اس واقعہ کی تفصیل بیان کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکوں۔



اکیسواں باب

مجسٹریٹ صاحب! جن کا نام کرون تھا۔ بوڑھے تھے اور بشرے سے رحمدل اور خداترس معلوم ہوتے تھے۔ تاہم چند ثانیوں تک وہ بڑی خشمگیں نظروں سے میرا جائزہ لیتے رہے اور پھر اس شخص سے، جو مجھے یہاں لایا تھا، مخاطب ہوئے اور کہا کہ گواہ اور عینی شاہد پیش کئے جائیں۔

چھ آدمی آگے بڑھے۔

مجسٹریٹ صاحب نے پہلے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے کہا گزشتہ رات وہ اپنے بیٹے اور برادرِ نسبتی دانیال کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے گیا ہوا تھا۔ رات کے دس بجے ہوں گے کہ شمالی ہوا لہکنے لگی۔ چنانچہ ان تینوں نے کشتی کا رخ بندرگاہ کی طرف موڑ دیا۔ چاند چونکہ اس وقت تک طلوع نہ ہوا تھا اس لئے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ہوا کے تیز جھکڑوں نے انہیں بندرگاہ تک پہنچنے نہ دیا۔ اس لئے وہ چونکہ طوفانی سمندر میں بھی کشتی کھینے کے عادی تھے، اس لئے ماڑی تک پہنچ گئے جو بندرگاہ سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ پکڑی ہوئی مچھلیوں کا ٹوکرا اٹھا کے سب سے پہلے وہ (بیان دینے والا) کشتی سے اترا اس کا بیٹا اور برادرِ نسبتی اس کے پیچھے تھے۔ وہ ٹوکرا سنبھالے ریتیلے ساحل پر آگے بڑھ رہا تھا کہ دفعتہً اس نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ گرا۔ اس کا بیٹا اور برادرِ نسبتی اسے اٹھانے کو دوڑ پڑے اور اس وقت انہوں نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ ایک لاش سے ٹھوکر کھا کے گرا تھا۔ پہلا خیال انہیں یہ آیا کہ شاید کوئی بدنصیب سمندر میں ڈوب گیا ہوگا اور اب موجوں نے اس کی لاش ساحل پر لا پھینکی ہوگی۔ لیکن لاش کا معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے نہ تھے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ لاش سرد بھی نہ تھی بلکہ گرم۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ وہ شخص غالباً چند گھنٹوں پہلے مارا گیا تھا۔ وہ لوگ لاش کو ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں، جو قریب ہی تھی اٹھا لے گئے۔ اور اس کے بدن میں گرمی پہنچانے کی کوشش کی لیکن وہ مر چکا تھا۔ وہ کسی نوجوان کی لاش تھی جو خاصا قبول صورت تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہوگی۔ صاف ظاہر تھا کہ خون اس پر یوں اچانک آپڑا تھا کہ مرحوم کو اپنے بچاؤ کا موقع نہ ملا تھا۔ لاش کے حلق پر انگلیوں کے نشانات تھے جس سے ثابت ہوا کہ اس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔

میں بیان کے پہلے حصے کو بے پرواہی سے سنتا رہا۔ لیکن جب اس نے کہا کہ لاش کے حلق پر انگلیوں کے نشانات تھے تو مجھے ولیم کی موت یاد آ گئی۔ میں کانپ گیا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ چنانچہ گرنے سے بچنے کے لئے قریب پڑی ہوئی کرسی کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے میری یہ حالت دیکھی تو انہوں نے مجھے مجرم تسلیم کر لیا یا انہیں شک ضرور ہوا۔

ماہی گیر کے بیٹے نے اپنے باپ کے بیان کی تائید کی۔ پھر دانیال نے آگے بڑھ کے کہا کہ اس کے ساتھی کے ٹھوکر کھا کر گرنے سے تھوڑی دیر پہلے اس نے ساحل کے قریب ہی ایک کشتی دیکھی تھی جس میں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا یقیناً وہ وہی کشتی تھی جس میں بیٹھ کے میں ان کی بستی میں آیا تھا۔

اس بوڑھی عورت نے جس کی جھونپڑی میں لاش لے جائی گئی تھی، کہا کہ لاش ملنے سے ایک گھنٹہ پہلے، جب وہ اپنی جھونپڑی کے دروازے میں کھڑی ماہی گیروں کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی، اس نے بھی ایک کشتی دیکھی تھی جو عین اس جگہ سے، جہاں بعد میں لاش ملی، روانہ ہو کر مختلف سمت میں جا رہی تھی۔ اس نے کہا اس کشتی میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ جب ماہی گیر، اس کا بیٹا اور دانیال لاش کو اس کی جھونپڑی میں لائے تو سرد نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے لاش بستر پر رکھ دی اور اس کے پاؤں ملنے لگے اور دانیال ڈاکٹر کو بلانے دوڑ گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ نوجوان میں زندگی کی رمق تک باقی نہ تھی۔

دوسرے لوگوں سے میری آمد کے متعلق پوچھا گیا۔ سب اسی بات پر متفق تھے کہ میں کسی اور جگہ جانا چاہتا تھا لیکن اوّل تو رات کو تیز ہوا چل رہی تھی اور پھر میں موقع واردات سے بندرگاہ تک کے فاصلے سے ناواقف تھا اس لئے غلطی سے ان کی بستی میں آ گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ممکن ہے میں نے اس نوجوان کو کہیں اور جگہ مارا ہو اور اپنا جرم چھپانے کے لئے وہاں، جہاں سے وہ ملی، پھینک دی ہو۔

ان لوگوں کا بیان سننے کے بعد مسٹر کرون نے کہا لاش مجھے دکھائی جائے۔ غالباً وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ لاش دیکھ کے میری حالت کیسی ہو جاتی ہے۔

مسٹر کرون کو یہ خیال غالباً اس لئے آیا تھا کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ یہ سنتے ہی کہ لاش کے حلق پر انگلیوں کے نشانات تھے میں نہ صرف کانپ اٹھا تھا بلکہ گرنے سے بچنے کے لئے مجھے کرسی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ چنانچہ انہیں یقین تھا کہ لاش دیکھتے ہی میری حالت غیر ہو جائے گی۔ اور مسٹر کرون، ایک خاص نتیجے تک پہنچ سکیں گے۔

مجھے ایک سرائے میں لے جایا گیا۔ اس وقت مسٹر کرون کے علاوہ بستی کے چند معزز آدمی میرے ساتھ تھے۔ دوسرے لوگوں کو مجسٹریٹ صاحب نے رخصت کر دیا تھا۔ ایک عجیب اور ناقابلِ فہم اتفاق تھا کہ کسی انجان شخص کی لاش اسی رات ملی تھی جس رات کو میں بیٹھ کر سمندر میں وہ ٹوکرا غرق

کرنے گیا تھا جس میں اس ڈھانچے کے، جسے میں بنا رہا تھ، اعضاء تھے۔ بہرحال اس جزیرے کے، جہاں وہ منحوس کام کر رہا تھا، پانچوں باشندے مجھے جانتے تھے۔ اور اپنی بے گناہی کے ثبوت میں بطور گواہ میں انہیں پیش کر سکتا تھا۔ میں بے گناہ تھا اور مسٹر کرون اور دوسرے لوگوں کو اس کا یقین دلا سکتا تھا۔ اس لئے میں مطمئن تھا۔ تاہم یہ عجیب اتفاق میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

مجھے اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک تابوت میں لاش رکھی ہوئی تھی۔ میں تابوت کے قریب پہنچا تو بے اختیار میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ میں مجسٹریٹ اور دوسرے لوگوں کی موجودگی کو فراموش کر گیا میں یہ بھی بھول گیا کہ مجھ پر خون کا الزام عائد کیا گیا ہے، لوگوں نے میرے خلاف بیانات دیئے ہیں اور یہ کہ میری ذراسی غلطی، ذراسی بے چینی مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکوا سکتی ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میرا دل غم سے پارہ پارہ ہو گیا میں چند ثانیوں تک ایک سناٹے کے عالم میں کھڑا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، حقیقت ہے۔

تابوت میں میرے دوست ہینری کلیرون کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہو گئی تھی۔ میرا دماغ سُن ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھوں اور پیروں میں دم نکل گیا اور میری سانس رکنے لگی تھی۔ آخر کار ایک چیخ کے ساتھ میں نے اپنے کو ہینری کی لاش پر ڈال دیا۔

"ہینری! میرے دوست! یہ کیا ہو گیا...... میری وجہ سے۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری ہی وجہ سے ولیم اور جسٹائن کی جان گئی اور اب تم بھی...... تم بھی...... پھر...... خدا جانے اب کسی کی باری ہے...... یہ کیا ہو گیا...... مجھے معاف کرنا۔ میرے دوست......"

میں اپنے بال نوچ رہا تھا، سینہ کوٹ رہا تھا، تڑپ رہا تھا...... میں پاگل ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو میرے ساتھ آئے تھے اور جو ایک ہی طرح کے ردِعمل کے متوقع تھے۔ میری یہ حالت دیکھ کے بھونچکا رہ گئے اور مجھے اس کمرے سے باہر گھسیٹ لائے۔

پورے دو مہینے تک میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا مجھے بعد میں معلوم ہوا (بتایا گیا) کہ میں بے ہوشی کے عالم میں عجیب بھیانک باتیں بکتا رہا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تپ میرے دماغ میں چڑھ گیا تھا، میں اپنے آپ کو ولیم، جسٹائن اور ہینری کا قاتل کہتا تھا...... بعض اوقات میں رو رو کر ان لوگوں سے، جو میری تیمارداری کر رہے تھے، درخواست کرتا کہ وہ میری مدد کریں کہ میں اس عفریت کا خاتمہ کر سکوں...... کبھی یوں ہوتا کہ میں اس عفریت کی لانبی اور استخوانی انگلیوں کی گرفت خود اپنے حلق پر محسوس کرتا اور لوگوں کا کہنا تھا، چیخنے اور اپنے بستر پر تڑپنے لگتا۔ خوش قسمتی سے میں اپنی مادری زبان میں ہذیان بک رہا تھا۔ چنانچہ صرف مسٹر کرون میری باتیں سمجھ پاتے تھے۔ تاہم میری بھیانک چیخیں اور عجیب و غریب حرکتیں لوگوں کو سہا دینے کے لئے کافی تھیں۔

تعجب یہ کہ میں مر کیوں نہ گیا؟ خدا جانے میں کون سی مٹی سے بنایا گیا ہوں کہ پتھر کو ریزہ ریزہ کر دینے والے مصائب مجھ پر ٹوٹ پڑے، غموں نے میرا دل چھلنی کر دیا۔ لیکن میں نہ مرا اور نہ پاگل ہوا...، بلکہ زندہ ہوں اپنے حواس میں ہوں اور تمہیں اپنی کہانی سنا رہا ہوں۔

زندگی ایک لعنت بن کر مجھے چمٹ گئی ہے۔ لوگ زندگی کی آرزو کرتے ہیں اور انہیں زندگی نہیں ملتی۔ میں نے موت کی آرزو کی اور وہ مجھے نہ ملی۔

دو مہینے بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو قید خانے کے ایک نیم تاریک اور تنگ کمرے میں گندے بستر پر پڑے پایا۔ جیل کا داروغہ اور سنتری میرے گرد جمع تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صبح کا وقت تھا اور میں پچھلے واقعات بھول سا گیا تھا۔ چند لمحوں تک تو میں حیران پڑا یہ سوچنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں اور یہ جو میرے چاروں طرف کھڑے ہیں کون لوگ ہیں؟ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خدا جانے کتنی دیر تک میں یونہی پڑا رہا۔ پھر میں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور کمرے کی حالت اور دروازے اور کھڑکی پر موٹی موٹی سلاخیں دیکھیں تو رفتہ رفتہ پچھلے واقعات یاد آنے لگے۔ میں ہولے ہولے کراہنے لگا۔ میری ان کراہوں نے ایک عورت کو چونکا دیا جو قریب ہی ایک کرسی میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ وہ داروغہ کی بیوی تھی جو نرس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس کے کھنچے ہوئے چہرے سے سنگدلی اور اکھڑ پن عیاں تھا۔ آنکھیں چیاں سی، ماتھے پر سلوٹیں، چڑچڑے پن کی علامت اور ہونٹوں کے دونوں طرف گہری گہری قوسین۔

''اب تو جناب کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''ٹھیک ہی ہے...... لیکن خاتون اگر میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا، اگر وہ حقیقت تھی تو تعجب یہ کہ اس کے بعد میں مر کیوں نہ گیا؟''

''واقعی تمہیں مر جانا چاہئے تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم بہت ڈھیٹ ہو۔ میرے خیال میں اب تمہاری زندگی عذاب ہو جائے گی۔ خونی کا ضمیر خاموش نہیں رہتا۔ بہر حال یہ تمہارا معاملہ ہے چنانچہ بس تم جانو اور تمہارا خدا...... میں کون ہوتی ہوں پیشنگوئیاں کرنے والی۔ میں تو تمہاری تیمارداری کے لئے بھیجی گئی ہوں اور ایسی تیمارداری کی ہے میں نے کہ کوئی دوسری عورت نہ کرتی۔''

میں نے اس عورت کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کم سے کم اس وقت اسے تلخ باتیں نہ کہنا چاہیئے تھیں۔ میں جو حد درجہ نقاہت محسوس کر رہا تھا اور پچھلے واقعات پر غور کرنے کے قابل نہ تھا۔ تاہم یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ واقعی جو کچھ ہوا وہ حقیقت تھی یا میں نے ایسا کوئی خواب دیکھا تھا؟

آہستہ آہستہ وہ مبہم تصویریں، جو میری نظر کے سامنے گھوم رہی تھیں واضح ہونے لگیں۔ اور میں پھر بخار میں پھنک رہا تھا۔ گھور اندھیرے نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ عجیب قسم کا ٹھوس اندھیرا

تھا جو مجھے بھنبھوڑ ڈال رہا تھا۔ اس وقت کوئی ایسا نہ تھا جو مجھے تسلی دیتا اور جس کا محبت بھرا لہجہ مجھے سکون بخشتا۔

ڈاکٹر آیا اور دوا دے کر چلا گیا۔ بوڑھی نرس میرے لئے دوا تیار کرنے لگی۔ ڈاکٹر نے بڑی بے پروائی سے میرا معائنہ کیا تھا۔ بڑی بے پروائی اور بے دلی سے نسخہ تجویز کیا تھا اور بوڑھی نرس کے بشرے سے نفرت عیاں تھی۔ اور اس میں ان دونوں کا قصور نہ تھا۔ ان کے نزدیک میں خونی تھا چنانچہ ایک خونی سے کسے دلچسپی ہوسکتی ہے سوائے پھانسی دینے والے کے جو اس کا معاوضہ لے گا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس اجنبی شہر میں ایک ایسی ہستی بھی تھی جس نے بڑی ہمدردی کا ثبوت دیا تھا۔ میرا مطلب مسٹر کرون سے ہے انہیں کی کوششوں سے مجھے قید خانے کا بہترین کمرہ دیا گیا (اگر وہ بہترین کمرہ تھا تو خدا جانے بدترین کمرے کیسے ہوتے ہوں گے) اور انہیں نے ڈاکٹر اور نرس کا انتظام کیا تھا یہ اور بات تھی کہ وہ میرے پاس بہت کم آتے تھے۔ غالباً احتیاط کا تقاضہ یہی تھا۔

ایک دن میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری کمزوری کچھ کچھ دور ہو چکی تھی لیکن میرا رنگ مردے کی طرح زرد تھا اور آنکھیں پوری طرح نہیں کھلتی تھیں۔ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ دنیا مجھے عذاب اور دکھوں سے پُر معلوم ہوئی اور میرا جی چاہا کہ میں مرجاؤں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے ناکردہ جرم کا اقرار کر کے پھانسی قبول کروں اور اس طرح ایک ہی وقت میں اپنی ساری بے چینی سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔ بے شک میں بے گناہ تھا۔ لیکن جسٹائن بھی تو بے گناہ تھی۔ اسے بھی تو پھانسی دے دی گئی تھی۔ یہی خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور مسٹر کرون میرے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے بشرے سے رحم و ہمدردی کے جذبات ہویدا تھے۔ وہ دوسری کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گئے اور فرانسیسی زبان میں بولے۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''اچھا ہوں۔ شکریہ۔''

''یہاں آپ کو تکلیف تو ہو رہی ہوگی لیکن کیا کرتا مجبور ہوں...... دیکھئے نا...... وہ......''

''ٹھیک ہے۔ جناب ٹھیک ہے یہ کمرہ ہو یا کسی محل کی پرتکلف خواب گاہ۔ میرے لئے دونوں برابر ہیں۔ حیران ہوں کہ آپ کی مہربانیوں کا شکریہ کس طرح ادا کروں!''

''شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یہ تو میرا انسانی فرض تھا جو میں ادا کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میری ہمدردیاں آپ کو تسلی نہیں دے سکتیں۔ کیونکہ میں پھر بھی اجنبی ہوں۔ بہرحال یہ وقت بھی گزر جائے گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ چند ایسے ٹھوس ثبوت مل جائیں گے جو آپ کو بے گناہ ثابت کردیں گے۔''

''اگر مجھے سزائے موت دی گئی تب بھی مجھے افسوس نہ ہوگا کیونکہ مسٹر کرون! چند واقعات اور اتفاقات نے مجھے دنیا کا شاید سب سے زیادہ بدنصیب آدمی بنا دیا ہے۔ زندگی سے طبیعت سیر ہوگئی ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں مرنا ہی چاہتا ہوں۔''

بے شک حالیہ اتفاق بے حد عجیب و غریب ہے۔ جس نے آپ کو قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں لا پھینکا ہے۔ ہمارے یہاں کے لوگ مہمان نوازی میں مشہور ہیں۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہماری مہمان نوازی ضرب المثل ہے۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ آپ اتفاقاً اس صبح یہاں آئے جس رات کو ایک نوجوان کی لاش ملی تھی چنانچہ لامحالہ آپ کو خونی تسلیم کر لیا گیا...... اور یہاں آنے کے بعد آپ نے سب سے پہلی چیز جو دیکھی وہ آپ ہی کے دوست کی لاش تھی۔ مجھے آپ کی بے گناہی کا یقین ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کسی دشمن نے، یا شاید کسی شیطان نے، جو آپ سے کسی بات کا بدلہ لینا چاہتا ہے، آپکے دوست کا خون کسی سوچے سمجھے ہوئے ارادے کے تحت کر دیا اور ایسے موقع سے کہ اصل خونی کے بجائے آپ پھنس گئے۔ اور غالباً یہی خونی چاہتا تھا۔''

مسٹر کرون کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں چونک پڑا اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی انہیں میرے متعلق اتنی بہت سی باتیں معلوم ہوگئی تھیں یا یہ محض ان کا اندازہ تھا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کے اور میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا کے انہوں نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ جیبوں میں سے بہت سے کاغذات ملے تھے۔ میں نے اس خیال سے ان کا مطالعہ کیا کہ شاید آپکے عزیزوں وغیرہ کا کوئی پتہ لگا سکوں اور انہیں اس سانحہ کی اطلاع دے سکوں۔ ان کاغذات میں کئی خطوط تھے، جن میں سے ایک، جس کی تحریر سے میں نے اندازہ لگایا کہ آپ کے والد کا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ایک خط انہیں لکھ دیا اس واقعہ کو دو مہینے ہو چکے ہیں اور...... لیکن ابھی آپ پوری طرح تندرست نہیں ہیں اور کسی بھی طرح کی بے چینی اور جوش آپکے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

امید و بیم کی یہ حالت مجھے مارے ڈال رہی ہے مسٹر کرون! آپ مجھ سے کچھ نہ چھپاتے ہوئے صاف صاف بتا دیجئے کہ اب مجھے کس کا ماتم کرنا ہے؟''

''گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کے عزیز خیریت سے ہیں اور ایک صاحب جو غالباً آپکے دوست ہیں آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

میں کانپ گیا۔ کیونکہ مجھے فوراً خیال آیا کہ وہ جسے مسٹر کرون میرا دوست بتا رہے ہیں وہی بھیانک ہستی ہے۔ جسے میں نے بنایا ہے...... وہ...... ولیم، جسٹائن اور ہینری کا خونی وہ غالباً یہ پوچھنے

آیا ہے کہ اب بھی اس کے لئے ایک حوا مہیا کروں گا یا نہیں غالباً وہ بیکسانہ حالت پر قہقہہ لگانے آیا ہے۔ وہ میرے سامنے آ کر مسکرائے گا، طنزیہ، زہریلی مسکراہٹ۔ لیکن میں اسے دیکھنا نہ چاہتا ہوں مجھے اس سے نفرت تھی۔ چنانچہ میں اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے چیخا۔

''اف! میرے خدا!...... میں ...... میں اس سے ملنا نہیں چاہتا میں اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا...... خدا کے لئے مسٹر کرون اسے میرے سامنے نہ لائیے۔''

مسٹر کرون بھونچکے رہ گئے۔ پھر بولے۔

''میرا خیال تھا نوجوان! کہ تمہارے والد کی موجودگی تمہیں قدرے سکون بخشے گی...... لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پہلے سے زیادہ بے چین ہو گئے۔ تمہارے والد کو یہاں بلا کر شاید میں نے غلطی کی ہے۔''

''ابا...... ابا میرے ابا'' میں دیوانوں کی طرح چیخا اور پھر ایک قہقہہ میرے منہ سے پھوٹ پڑا'' وہ آ گئے...... کیا واقعی وہ آ گئے...... مسٹر کرون! کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

میرے جذبات کے اس فوری تغیر سے مجسٹریٹ صاحب کو ایک بار پھر حیران ہونے کا موقعہ ملا۔ بہر حال وہ اٹھے اور نرس کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ دوسرے ہی لمحے والد صاحب میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھائے اور خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے بولا۔

''خدا کا شکر ہے کہ میں آپ کو محفوظ دیکھ رہا ہوں۔ لیکن الزابیتھ اور آرنسٹ......؟''

''وہ بھی خیریت سے ہیں...... لیکن وکٹر......! میرے بچے تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟...... تم تو گھر سے سیاحت کے لئے نکلے تھے اور بچارا ہینری......''

ہینری کا نام سنتے ہی میں بے چین ہو گیا۔

''ہاں وہ مر گیا...... اور میں زندہ ہوں...... قسمت کا لکھا پورا کرنے کے لئے زندہ ہوں۔''

ہمیں زیادہ دیر تک باتیں کرنے کا موقع نہ دیا گیا۔ کیونکہ میں پوری طرح تندرست نہ ہوا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہی مسٹر کرون آ گئے انہوں نے کہا کہ زیادہ باتیں کرنے سے ممکن ہے میں تھک جاؤں یا ہذیان بکنے لگوں۔

والد صاحب کی موجودگی میرے حق میں بے حد مفید ثابت ہوئی اور میں بڑی سرعت سے تندرست ہونے لگا۔

میں تندرست ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھ پر ایسی گہری افسردگی طاری ہوئی جسے کوئی دور نہ کر سکا۔ ہینری کی لاش کی تصویر، جس کے حلق پر خونی کی انگلیوں کے نشانات تھے، میری نظر کے سامنے سے

ہٹتی نہ تھیں اور ایک دفعہ تو میری حالت ایسی دیوانوں کی سی ہوگئی کہ مسٹر کرون اور والد صاحب، دونوں ہی گھبرا گئے۔

اور پھر وہ مقررہ دن قریب آ گیا جس دن کہ مجھے حاضر ہونا تھا۔ مقدمہ قصبے کے مرکزی شہر (جو وہاں سے سو میل دور تھا) میں چلنے لگا تھا۔ میں پورے تین مہینے قید خانے کے اس تنگ و تاریک کمرے میں گزار چکا تھا اور ابھی اتنا طویل سفر کرنے کے قابل نہ ہوا تھا تاہم یہ سو میل کا سفر کرنے پر مجبور تھا۔

اس تمام عرصے میں مسٹر کرون خاموش نہ بیٹھے رہے تھے انہوں نے میری بے گناہی کے نہایت ٹھوس ثبوت اور بہت سے گواہ حاصل کر لئے تھے۔ قصہ مختصر مسٹر کرون کی کوششوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس روز خون کیا گیا، میں ایک ویران جزیرے میں مقیم تھا۔ جیوری نے میرے بے گناہ ہونے کا فیصلہ دیا اور میں پندرہ دن بعد رہا کر دیا گیا۔

والد صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا لیکن افسوس میں ان کی مسرتوں میں شریک نہ ہوسکا۔ میرے لئے قید خانے کا اور اپنے گھر کا کمرہ دونوں برابر تھے۔ میرے لئے خوشی عنقا ہو چکی تھی۔ میری زندگی میں زہر گھول دیا گیا تھا۔ ہر چند کہ دوسرے لوگوں کی طرح مجھ پر بھی سورج چمکتا تھا لیکن میں اپنے چاروں طرف گاڑھا اندھیرا ہی دیکھتا تھا۔ اور اس اندھیرے میں دو آنکھیں چمکا کرتی تھیں۔ کبھی تو وہ آنکھیں ہیبری کی نظر آتیں جن میں محبت ہوتی اور کبھی اس عفریت کی جن میں غصے اور انتقام کی آگ ہوتی۔

والد صاحب جنیوا اور الزابیتھ اور آرنسٹ کی باتیں کر کے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتے۔ لیکن میں خوش ہونے کے بجائے اور بھی زیادہ اداس ہو جاتا۔ لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ مسرتیں حاصل کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی آرزو میرے دل میں کروٹیں بدلنے لگتی۔ میں الزابیتھ کے متعلق سوچتا۔ اپنے وطن کے قدرتی مناظر، گنگناتے ہوئے جھرنوں اور شفاف تالابوں کے متعلق سوچتا۔ لیکن میرا مرجھایا ہوا دل بدستور مرجھایا ہوا ہی رہتا۔ مجھ پر گمبھیر افسردگی طاری رہتی۔ اور مجھے احساس ہوتا کہ میں زندگی کی مسرتوں سے محروم کر دیا گیا ہوں اور یہ کہ قدرتی مناظر میرے لئے اپنی دلچسپی کھو چکے ہیں اور اس وقت مجھے خیال آتا کہ میں کیوں نہ اس عفریت کا خاتمہ کر دوں جس نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے اور میری حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی، اپنے مشتعل جذبات کو دبائے رکھنے کے لئے مجھے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا، اگر میں اپنے آپ کو جذبات کے حوالے کر دیتا تو یقیناً کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھتا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کپتان صاحب! کہ ان دنوں میری کیسی حالت ہو رہی ہوگی۔ ایک طرف تو مجھ پر گہری افسردگی طاری

تھی، ولیم، جسٹائن اور ہینری کا غم تھا اور ایک ایسا راز میرے سینے میں دفن تھا جس کے متعلق میں کسی سے ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اور دوسری طرف مجھے اپنے برانگیختہ جذبات کو قابو میں رکھنا پڑ رہا تھا۔ اپنے آپ کو خوش اور بے فکر ظاہر کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ مجھے اداس دیکھ کے والد صاحب بھی اداس ہو جاتے تھے۔ غالباً کسی نے اتنی روحانی اذیت برداشت نہ کی ہو گی جتنی کہ میں نے کی ہے۔

لیکن مجھ پر بھی ایک فرض عائد ہوتا تھا۔ اس فرض کا احساس آہستہ آہستہ میرے دوسرے احساسات پر غالب آتا جا رہا تھا مجھے اپنے عزیزوں کی حفاظت کرنا تھی۔ اس عفریت کے وجود سے یہ لوگ ناواقف تھے جو انتقام کی آگ میں اندھا اور دیوانہ ہو رہا تھا چنانچہ اپنے عزیزوں کے قریب رہ کر ہی میں انہیں اس عفریت سے بچا سکتا تھا اور اس کے لئے میرا جلد از جلد جنیوا پہنچنا ضروری تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وہاں آئے گا چنانچہ اگر اتفاقاً میرا اس کا سامنا ہو گیا یا میں نے اس کی کمین گاہ کا کھوج لگا لیا تو اس کا امکان تھا کہ میں اس شیطان کا خاتمہ کر کے نہ صرف اپنے عزیزوں کو بچا لوں گا بلکہ میں خود بھی اپنی کھوئی ہوئی مسرت حاصل کر سکوں گا۔ چنانچہ میں جنیوا چلنے کی جلدی مچانے لگا۔ والد ٹال مٹول کرتے رہے۔ کیونکہ انہیں خوف تھا کہ اتنا طویل سفر میرے لیے مضر ثابت ہو گا اور میں پھر بستر علالت پر جا پڑوں گا۔ اور ان کا یہ خوف بیجا نہ تھا کیونکہ میں بے حد لاغر اور کمزور ہو رہا تھا۔ صحیح معنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور پھر مجھے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔

لیکن والد صاحب کو میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے چنانچہ ہم ''ہاروے دگرلس'' جانے والے جہاز پر سوار ہو گئے آئرلینڈ کا ساحل پیچھے چھوٹ گیا۔

ایک رات جبکہ بارہ بج رہے تھے، میں عرشے پر چت لیٹا شفاف آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ سمندر کی موجیں ہلکے ہلکے شور کے ساتھ جہاز کے پہلوؤں سے ٹکرا رہی تھیں اور ایک عجیب طرح کا سکون اور مسرت میرے دل میں پھیلنے لگی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بہت جلد الزابیتھ سے ملوں گا۔ بہت جلد اپنے وطن کے مناظر میری نظر کے سامنے ہوں گے۔ پھر خدا جانے کیا ہوا کہ یکا یک میرے خیالات کا رخ ماضی کی طرف مڑ گیا۔ ماضی کی تصویریں یکے بعد دیگرے میری نظر کے سامنے سے گزرنے لگیں۔...... والدہ کا انتقال...... مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے میری اینجلو اسٹیڈ کو روانگی...... میرے تجربات...... کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی ہوس...... زندگی اور موت کا راز معلوم کرنے کا شوق...... قبرستان کی اندھیری بھیانک راتیں...... مردہ جسموں کو چاٹتے ہوئے کیڑے...... میری تجربہ گاہ...... میز پر پڑا ہوا ایک لمبا تڑنگا جسم...... میرا دشمن...... میرے دکھوں کا بانی...... ولیم کی موت...... جسٹائن کو پھانسی...... ہینری کی موت......

اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تندرست ہونے کے بعد، بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ذرا سنبھلنے کے بعد میں تھوڑی تھوڑی افیون کھانے لگا تھا۔ کیونکہ اسی طرح میں قدرے سکون سے سو سکتا تھا۔ ورنہ قدرتی نیند، جو ایک نعمت، یہ عرصہ ہوا مجھ سے روٹھ چکی تھی۔ چنانچہ اس وقت، الٹے سیدھے خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لئے، میں نے افیون مقررہ تعداد سے زیادہ نگل لی اور جلد سو گیا۔ لیکن یہ غیر قدرتی نیند اپنے ساتھ بھیانک خوابوں کے لشکر لائی۔ صبح کے قریب میں نے اپنے حلق پر لانبی لانبی اور سخت انگلیوں کی گرفت محسوس کی۔ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئیمیں بری طرح تڑپنے لگا...... پھر کسی نے میرے دونوں کندھے پکڑ کے مجھے بری طرح، جیسے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں جھنجھوڑ ڈالا...... میں نے آنکھیں کھولدیں...... والد صاحب مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ اوپر شفاف آسمان تھا سمندر پرسکون تھا۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے چل رہے تھے اور جہاز بڑی سبک رفتاری سے چل رہا تھا وہ عفریت وہاں نہ تھا...... میں نے خواب دیکھا تھا۔

''وکٹر! کیا ہوا؟ خواب میں ڈر گئے کیا؟'' والد صاحب نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔



بائیسواں باب

طویل بحری اور بری سفر کے بعد ہم پیرس پہنچے تو میں تھکن سے نڈھال تھا۔ چنانچہ ہمیں مجبوراً وہاں قیام کرنا پڑا کہ میری طبیعت پھر بحال ہو جائے۔ والد صاحب اپنی باتوں سے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتے لیکن افسوس وہ نہ جانتے تھے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے اور میں کون سا منحوس راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہوں۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ لوگوں سے ملنے جلنے اور محفلوں میں شریک ہونے سے میری طبیعت کی افسردگی دور ہو جائے گی لیکن میری طبیعت بھیڑ بھڑکے سے گھبراتی تھی اور میں محسوس کرتا تھا کہ لوگوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ ہنسنے بولنے کا مجھے کوئی حق نہیں کیونکہ میں نے ایک عفریت ان بھولے بھالے اور بے فکر انسانوں کے درمیان آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ایک ایسا عفریت جو انسانوں کا گلا گھونٹ کے خوش ہوتا تھا۔ انسانوں کو غم دینا ہی اس کی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد تھا۔ اگر ان لوگوں کو میرا راز معلوم ہو جائے تو...... تو یقیناً یہ لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے...... میرے دل میں چور تھا...... چنانچہ میں انسانوں کے سامنے جاتے ڈرتا تھا۔

آخر کار والد صاحب نے اس دفعہ بھی اپنی ہار قبول کر لی۔ اب وہ کسی فنکشن میں شریک ہونے کے لئے مجبور نہ کرتے۔ اکثر خود بھی کہیں نہ جاتے اور گھنٹوں میرے پاس بیٹھے مجھے ہر طرح سمجھاتے اور میری افسردگی دور کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ میں بت بنا بیٹھا کہیں خلا میں گھورا کرتا۔ پھر اس خیال سے کہ خون کا جھوٹا الزام لگا کے میرے لطیف جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔ وہ جھوٹے خاندانی غرور اور جھوٹی شرافت پر ایک لیکچر دیتے اور آخر میں کہتے کہ زندگی میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے واقعات کے خیال سے یوں اپنے آپ کو ہلکان کرنا سراسر حماقت ہے وغیرہ وغیرہ۔

''ابا'' میں نے کہا ''مجھے نہ تو بے جا غرور ہے اور نہ خاندانی تکبر، جسٹائن اتنی ہی بے گناہ تھی جتنے کہ آپ ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس کی بے گناہی ثابت نہ ہو سکی۔ اس کا خون ناحق میری گردن پر ہے۔ میری وجہ سے اس کی جان گئی۔ ولیم میری وجہ سے مارا گیا اور ہینری بھی۔ میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گنہگار ہوں۔ مجرم اور خونی ہوں۔ افسوس میرے گناہوں کا خمیازہ ان تین بے گناہوں کو بھگتنا پڑا۔''

''یہ کیا پاپا گل پن ہے وکٹر! خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کہو۔ آخر یہ خیال کس طرح تمہارے

دماغ میں جم گیا! پہلے بھی کئی دفعہ تم ایسی ہی باتیں کہہ چکے ہو۔ لیکن اس وقت چونکہ تم بیمار تھے۔ اس لئے میں یہی سمجھا کہ تم ہذیان بک رہے ہو۔ لیکن اس وقت میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پوری طرح اپنے حواس میں ہو۔ آخر یہ کیا حماقت ہے؟''

''نہ یہ پاگل پن ہے اور نہ حماقت۔ میں آپ کو اور آپ کے ساتھ دسروں کو متفکر و پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ چمکتا ہوا سورج اور چاند اور ستارے جنہوں نے میرے تجربات دیکھے ہیں۔ گواہ ہیں کہ میں مجرم ہوں...... ولیم، جسٹائن اور ہینری، میری وجہ سے مارے گئے۔ وہ تینوں مجھے جان سے زیادہ عزیز تھے۔ لیکن افسوس کہ میں انہیں نہ بچا سکا۔ محض اس لئے کہ میں بزدل اور جودا ہوں۔ وہ تینوں مارے گئے اور اب دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن ابھی اور بہت سے لوگ زندہ ہیں۔ میں ان کو قربان نہیں ہونے دوں گا نہیں ہونے دوں گا......... نہیں ہونے دوں گا...... اب یہ خونی ڈرامہ دوبارہ نہ کھیلا جائے گا...... ہاں میری زندگی سے جو کھیلا جائے گا۔

والد صاحب سمجھے کہ میرے جذبات برانگیختہ اور خیالات پریشان ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ہی موضوع گفتگو بدل دیا اور اس کے پھر کبھی یہ موضوع نہ چھیڑا۔

وقت گزرتا گیا۔ میں زیادہ سے زیادہ افسردہ اور خاموش ہوتا گیا ساتھ ہی ساتھ میرے خیالات راہ پر آتے اور میرے اعصاب سکون پذیر ہوتے گئے۔ لیکن بعض اوقات میری طبیعت گھبرانے لگتی، میں بے چین ہو اٹھتا اور میرا جی چاہتا کہ میں کسی بلند مینار پر کھڑے ہو کر اپنے جرم کا اقرار کرلوں اور ساری دنیا کو وہ راز بتا دوں جو میرا سینہ پھاڑے ڈال رہا تھا اور پھر اسی مینار سے چھلانگ لگا کے اپنی جان دے دوں۔ اور اس وقت مجھے اپنے آپ کو روکنے اور اپنے جذبات پر قابو حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ جبر کرنا پڑتا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اس کا بھی عادی ہو گیا۔

ابھی ہم پیرس کو الوداع کہنے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ مجھے الزابیتھ کا ایک خط ملا۔

''پیارے وکٹر!

چچا صاحب کا خط پیرس سے آیا تو اس خیال سے بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ اب تم مجھ سے زیادہ دور نہیں ہو...... چنانچہ امید ہے کہ دس پندرہ دن بعد ہی میں تمہیں اپنے سامنے پاؤں گی۔

لیکن سوچتی ہوں کہ تمہیں کس حال میں دیکھوں گی۔ طویل علالت نے اور ساتھ ہی روحانی اذیت نے، تمہارا حلیہ بگاڑ دیا ہوگا (معاف کرنا میں یہ لفظ استعمال کر رہی ہوں) جب تم یہاں سے گئے تب بھی تم کہاں تندرست تھے۔ اور اب تو اس خیال سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ میں تمہیں پہچان سکوں گی یا نہیں؟ پورا موسم سرما بڑا ہی بے قرار گزرا ہے۔ الٹے سیدھے خیالات اور امید و بیم کی حالت نے مجھے ہر دم پریشان رکھا...... اس کے باوجود مجھے امید ہے کہ میں تمہیں بشاش دیکھوں گی

اور دوبارہ روحانی سکون حاصل کرسکوں گی۔ خدا کرے کہ میرے اندیشے غلط ثابت ہوں۔

لیکن بعض دفعہ یہ خیال مجھے ہیولہ بن کے ڈراتا ہے اور میری نیند اچاٹ کر دیتا ہے کہ شاید اب بھی تم ان شکوک سے (خدا جانے کیا ہیں اور جن کا اظہار ایک سال پہلے تمہارے بشرے سے ہو رہا تھا) نجات حاصل نہ کر سکے ہو گے۔ میں جانتی ہوں کہ تم ابھی ابھی بستر علالت سے اٹھے ہو اور اتفاقات نے تمہیں سخت روحانی اذیت پہنچائی ہو گی......ایسے وقت میں اپنی کوئی بات کہنا سراسر خود غرضی ہو گی۔ لیکن کیا کروں کہ مجبور ہوں۔ چچا صاحب جب تمہارے پاس آنے کے لئے یہاں سے روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے تنہائی میں مجھ سے چند باتیں کہی تھیں۔ چنانچہ اس خط کے ذریعے میں ساری باتوں کا فیصلہ کر دینا ضروری سمجھتی ہوں۔ کیونکہ تمہارے سامنے میری زبان نہ کھلے گی۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو وکٹر کہ ہم دونوں کی شادی تمہارے والدین کی باتوں کا دلچسپ موضوع تقریباً اسی وقت سے بنی ہوئی تھی جب میں اس گھر میں آئی تھی۔ اور اس وقت ہم دونوں بچے ہی تھے۔ ہم دونوں کی شادی سے ہی ان کی تمام تر امیدیں اور ارمان وابستہ تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں نے یہ بات ہمارے ذہن نشین بھی کر دی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں۔

ہم دونوں بچپن میں کھیل کود کے ساتھی تھے اور بڑے ہوئے تو ایک دوسرے کے بہترین دوست اور ساتھی رہے اور ہیں۔ اگر ہماری شادی نہ بھی ہوئی تب بھی ہم دونوں نہ صرف دوست رہیں گے بلکہ بھائی اور بہن کی بے لوث محبت ایک دوسرے کو دے سکیں گے چنانچہ اگر تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر بھی دیا تو مجھے اتنا غم نہ ہو گا جتنا کہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں تمہاری برادرانہ محبت سے محروم نہ رہوں گی۔ چنانچہ وکٹر! سچ بتاؤ کیا تم کسی اور کو چاہتے ہو؟

یہ خیال مجھے یونہی نہیں آیا ہے۔ جب سے تم واپس آئے ہو (میرا مطلب ہے انگلو اسٹیڈ سے) تب سے تنہائی کے متلاشی رہنے لگے ہو۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم نہ صرف مجھ سے بلکہ اپنے والد اور بھائی سے بھی دور رہنے کی کوشش کرتے ہو۔ چنانچہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ تمہیں یہ شادی منظور نہیں......حالانکہ یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اپنے والد کی مرضی کے خلاف نہ کرتے ہوئے طوعاً کرہاً مجھ سے شادی کر لو گے لیکن میرے ساتھ شاید خوش نہ رہ سکو گے۔

وکٹر! پیارے وکٹر! تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے تو یونہی سہی تمہارے انکار سے مجھے تھوڑا بہت رنج، غم ہو گا ضرور لیکن تمہاری محبت کی خاطر میں یہ غم برداشت کر لوں گی۔ میں تمہیں چاہتی ہوں وکٹر! اور بہر حال تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہاری خوشی کے لئے اگر مجھے اپنی امیدوں کا خون کرنا پڑے تو یہ بھی مجھے منظور ہے۔ یہ تو معمولی سی قربانی ہے۔ میں تمہاری خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں، تم نے کسی اور سے شادی کر لی تو یقین مانو میری محبت میں فرق نہ آئے گا۔ میں تمہاری اور

اپنی بھابی کی خدمت کر کے زندگی کے دن گزار دوں گی۔ چنانچہ وکٹر میری طرف سے تمہیں اجازت ہے،اور یہ اجازت میں خوشی سے دے رہی ہوں کہ جس سے چاہو شادی کرلو اور جہاں چاہو رہو۔ میں تمہاری مسرتوں کی راہ میں روڑا نہ بنوں گی یقین مانو وکٹر! میں برا بھی نہ مانوں گی۔تم مجھے ہمیشہ کی طرح بشاش اور مخلص پاؤ گے۔

خدا کرے کہ میرا یہ خط تمہارے اضطراب کا باعث نہ ہو۔اس خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ۔اس وقت جب تم یہاں آ ؤ گے اگر میں نے تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھی تو بھی اپنے خط کا جواب مل جائے گا اور تمہاری اسی مسکراہٹ کو اپنی قربانی کا تحفہ سمجھوں گی اور تمہاری یہی مسکراہٹ میری متاع حیات ہوگی۔

ہمیشہ تمہاری

الزابیتھ

جنیوا،۱۸ مئی۔

میں خط پڑھ چکا تو میرے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے۔جنہیں میں بھول چکا تھا......"میں پھر آؤں گا......اس رات تم مجھے اپنے حجلۂ عروسی میں پاؤ گے......" یہ تھا میری قسمت کا فیصلہ...... یقیناً وہ آئے گا۔اور وہ میری شادی کی پہلی اور غالباً زندگی کی آخری رات ہوگی...... بہت اچھا یونہی سہی۔ اگر اس رات وہ آیا۔اور یقیناً آئے گا تو ہم دونوں میں آخری مقابلہ ہوگا۔ اگر فتح اس کی ہوئی تو میں ابدی نیند سو جاؤں گا اور اگر میری ہوئی۔ اگر میں نے اس کا خاتمہ کر دیا تو میں پھر آزادی کا سانس لے سکوں گا......آزادی......کیسی آزادی!......کیسا سکون......! کیا اس عفریت کے خاتمے کے بعد میں سکون محسوس کرسکوں گا؟ شاید نہیں ۔ ولیم ،جسٹائن اور ہینری کے خون کا بوجھ آخر دم تک میری گردن پر دھرا رہے گا۔اور ضمیر کی ملامت میرا جینا دوبھر کر دے گی۔

میں نے بار بار الزابیتھ کا خط پڑھا۔رفتہ رفتہ میرے دل میں محبت کے جذبات بیدار ہوئے اور میں مسرتوں کے خوب دیکھنے لگا۔لیکن افسوس کہ میں شجر ممنوعہ کا پھل کھا چکا تھا اور مجھے تمام مسرتوں سے محروم کرنے کے لئے شیطان نہایت مکمل سازش کر چکا تھا۔تاہم میں الزابیتھ کو خوش کرنے اور اسے اور اپنے عزیزوں کو بچانے کے لئے اپنی جان کی قربانی دے سکتا تھا۔اگر واقعی اس عفریت کی دھمکی جھوٹی اور کھوکھلی نہ تھی تو میری موت یقینی تھی۔لیکن میری شادی کیا واقعی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی؟ بہر حال مجھے مرنا تو ہے ہی۔ چاہے چند مہینوں پہلے یا چند مہینوں بعد۔اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔لیکن اگر میرے دشمن کو یہ شک ہو گیا کہ میں اس کے انتقام سے بچنے کے لئے شادی کو قصداً التواء میں ڈال رہا ہوں تو انتقام کا کوئی نیا اور بھیانک طریقہ تلاش کر لے گا۔اس نے کہا ہے کہ وہ

شادی کی پہلی رات کو میرے سامنے ہوگا۔اس نے کہا ہے۔تاہم اس وقت تک ،یعنی میری شادی تک ،وہ خاموش نہ بیٹھا رہے گا۔اور اس کا تو مجھے خیال ہی نہ کرنا چاہئے کہ اس مدت میں مجھے سکون میسر آسکے گا۔ثبوت کے لئے دور جانے کی ضرورت نہ تھی۔اس کی دھمکی کے فوراً بعد ہینری کا خون کر کے اس نے ثابت کر دیا تھا کہ میری شادی کی پہلی رات تک وہ خاموش نہ بیٹھا رہے گا۔چنانچہ اگر میں نے شادی نہ بھی کی تو وہ میرے عزیزوں کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھاتا رہے گا اور میری موت گویا اس کے انتقام کی تکمیل ہوگی۔چنانچہ میری موت، جو میری شادی کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔میرے عزیزوں کی مسرتوں کو برقرار اور انہیں اس عفریت کے شر سے محفوظ رکھ سکتی ہے تو مجھے اس ایک گھنٹہ کی بھی تاخیر نہ کرنا چاہئے۔چنانچہ میں اپنے انجام سے واقف تھا۔یوں بھی میری زندگی میں کیا رہ گیا تھا کہ میں اس کی آرزو کرتا اور میرے عزیز، محض میرے زندہ رہنے سے اس عفریت کے انتقام کا شکار ہوتے۔چنانچہ ایک آخری فیصلہ کر کے میں نے الزابیتھ کے خط کا جواب یوں لکھا۔

الزابیتھ پیاری!

میں سمجھتا ہوں کہ اب اس دنیا میں ہمارے لئے مسرتیں بہت کم ہیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں۔اس کے باوجود میری ساری مسرتیں، جتنی بھی باقی رہ گئی ہیں، تم ہی سے وابستہ ہیں تم میری سب کچھ ہو۔تم میری زندگی ہو اور وہ دن میری زندگی کا بہترین دن ہوگا جس دن کہ تم میری دلہن بنو گی......میں تمہیں، صرف تمہیں چاہتا ہوں۔چنانچہ اپنے دل سے ہر شک نکال دو۔الزابیتھ! میری پیاری! میرے سینے میں ایک راز دفن ہے۔ایک ایسا بھیانک راز جسے میں تمہارے سامنے بیان کروں گا تو تم یقیناً چیخ اٹھو گی۔یہ راز صرف تم سے کہوں گا۔لیکن ابھی نہیں۔شادی کے دوسرے دن تم مجھ سے میری داستان سنو گی اور پھر میری افسردگی اور دنیا والوں سے گریز اور تنہائی کی تلاش کا سبب معلوم کر لو گی۔شادی کے بعد تم میری شریکِ حیات اور شریک راز بن چکی ہوگی چنانچہ اس وقت میں تم سے اپنا راز کہتے نہ جھجکوں گا۔لیکن شادی سے پہلے مجھ سے کچھ نہ پوچھنا اور نہ ہی کسی سے اس کا ذکر کرنا۔ہماری شادی کے دوسرے دن تم سب کچھ جان لو گی۔

تمہارا

وکٹر فرنکسٹائن

الزابیتھ کا خط ملنے کے ایک ہفتے بعد ہم جینوا میں تھے۔الزابیتھ نے مسکرا کے میرا استقبال کیا۔لیکن میرا لاغر جسم اور بخار سے سرخ آنکھیں اور گال دیکھ کے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔وہ خود بھی بدل گئی تھی ایک ہی سال میں وہ دبلی اور زرد ہوگئی تھی۔اس کے بشرے سے زندہ دلی اور بشاشت عیاں نہ تھی جو مجھے مسحور کر دیا کرتی تھی۔تاہم اس کی محبت بھری نظر، ملکوتی تبسم اور ہمدردانہ

الفاظ مجھے یقین دلا رہے تھے کہ وہی صرف وہی۔ مجھ جیسے شخص کی بہترین رفیق ثابت ہوسکتی ہے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ میں اکثر خاموش رہا کرتا تھا...... لیکن اب یہ خاموشی بھی ناقابل برداشت اور بھیانک ہوتی جارہی تھی۔ ماضی کی یادوں کے بھوت مجھے پریشان کرتے تھے اور جب میں پچھلے واقعات پر غور کرتا تو حقیقت میں پاگل ہوجاتا تھا۔ کبھی تو غصہ میں پھنکنے لگتا اور کچھ کرڈالنے کو جی چاہتا۔ اور کبھی انتہائی مایوسی کے عالم میں دنیا تیاگ دینے کے متعلق سوچتا۔ یہ وہ وقت ہوتا جب میں مایوسی میں نہ کسی سے کچھ بولتا اور نہ کسی طرف دیکھتا۔ بس ایک کونے میں وحشت زدہ سا بیٹھا رہتا۔ اور پریشانیوں کے بھنور میں غرق ہونے لگتا۔

صرف الزابیتھ مجھے اس بھنور سے کھینچ سکتی تھی اور وہ اس کی کوشش کرتی۔ اس کی مدھر آواز میری ڈھارس بندھاتی، اس کی مسکراہٹ میرے ویران دل میں جہاں، یادوں کے بھوت چیخا کرتے، امید کی کلیاں کھلاتی...... الزابیتھ...... میری الزابیتھ...... وہ میرے ساتھ ہنستی اور میرے ساتھ آنسو بہاتی۔ ہمارے درخشاں مستقبل کے ذکر سے مجھے خاموش کرتی...... بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ بے چاری جانتی نہ تھی کہ میں اپنے مستقبل سے واقف تھا۔ چنانچہ اس کے خیال سے خوش نہ ہوسکتا تھا۔

چند دنوں بعد والد صاحب نے میری شادی کا ذکر چھیڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ الزابیتھ سے میری شادی جلد از جلد ہوجائے کیونکہ ان کے خیال میں میری افسردگی دور کرنے کا یہی ایک علاج باقی رہ گیا تھا، میں خاموش رہا۔

''تو کیا تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں خدا کی قسم نہیں۔ میں الزابیتھ سے محبت کرتا ہوں اور اس کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں آپ ہماری شادی کی تاریخ مقرر کردیں۔ اس دن سے میں اپنے جسم اور روح کی خوشیوں کے لئے وقف کردونگا خواہ آپ کی مسرتیں مجھے اپنی جان کی قیمت ادا کرکے ہی کیوں نہ خریدنا پڑیں۔''

''وکٹر! تم پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ تمہاری یہ باتیں مجھے کتنا دکھ پہنچاتی ہیں۔ بیٹے! اس میں کوئی شک نہیں کہ ولیم، جسٹائن اور ہینری کی موت سے ہم پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں اور ہماری بہت سی مسرتیں ہم سے چھن گئی ہیں۔ لیکن جتنی بھی مسرتیں باقی رہ گئی ہیں بہر حال ہمیں حاصل کرنا ہیں۔ وکٹر! زمانہ سب سے بڑا حکیم واقع ہوا ہے۔ وہ گہرے سے گہرے زخموں کو مندمل کردیتا ہے اور غم کے تاریک سے تاریک داغ دھودیتا ہے۔ چنانچہ جلد یا بدیر تمہارے

کی شدت بھی کم ہو جائے گی۔ تمہاری اولادیں ہوں گی اور تم ان کی پرورش کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے اور تمہاری اولادیں تمہاری زندگی میں پھر مسرتیں لے آئیں گی۔ میرے بیٹے! دنیا میں کسی چیز کو دوام حاصل نہیں چنانچہ غم اور دکھ کو بھی نہیں...... یہ دور بھی آخر کار گزر ہی جائے گا۔

ایسے تھے میرے والد صاحب کے محبت بھرے اور تسلی بخش الفاظ لیکن میرے کانوں میں اس عفریت کی دھمکی کے الفاظ گونج رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس دھمکی کو جامۂ عمل پہنائے گا۔ اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ فتح ''اسی'' کی ہوگی۔ کیونکہ وہ مافوق الفطرت قوت کا مالک تھا۔ لیکن مجھے اپنی موت کا کوئی خوف نہ تھا۔ بشرطیکہ الزابیتھ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اور مجھے امید تھی کہ نہ پہنچے گی۔ وہ محض مجھے غم دینے کے لئے، جو مجھے عزیز تھے، ان کے گلے گھونٹ رہا تھا۔ چنانچہ جب میں اس دنیا میں نہ رہوں گا تو ''وہ'' میرے عزیزوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر کسی طرف نکل جائے گا اور اس طرح یہ لوگ ''اس'' کے شر سے، جس کے وجود سے وہ واقف نہیں، محفوظ رہیں گے اور جیسا کہ والد صاحب نے کہا تھا، چونکہ زمانہ بڑا حکیم واقع ہوا ہے اس لئے والد صاحب اور الزابیتھ بھی رفتہ رفتہ مجھے بھول جائیں۔ چنانچہ میں نے والد صاحب سے کہا کہ وہ الزابیتھ سے مشورہ کر کے ہماری شادی کی تاریخ مقرر کر دیں اور یہ کہ شادی دس دن کے اندر اندر ہو جانی چاہئے۔

اور یوں میں نے اپنے خیال میں اپنی قسمت پر آخر مہر لگا دی۔

لیکن اف...... میرے خدا! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرا دشمن کیا کرنے والا ہے، اگر میں نے اس کے دوزخی ارادوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو میں الزابیتھ سے شادی کرنے کے بجائے اپنے عزیزوں اور وطن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا اور دنیا کے دور دراز اور ویران گوشوں میں مرتے دم تک آوارہ روح کی طرح بھٹکا کرتا اور گمنامی کی حالت میں مر جاتا...... لیکن افسوس! اس عفریت نے جیسے کسی غیبی قوت کے ذریعہ مجھے اپنے اثر میں لے لیا تھا...... مجھے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اور میں، جیسے بے ہوش یا خواب کے عالم میں اس کے اشاروں پر اور اس کی مرضی کے مطابق ہر کام کر رہا تھا۔ حالانکہ سمجھ یہی رہا تھا کہ میں نے صرف اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ لیکن ہائے ایسا نہ تھا۔

جیسے جیسے شادی کا دن قریب آتا جا رہا تھا میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ میں اپنی موت قریب محسوس کر رہا تھا یا شاید اس لئے کہ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میری موت سے پہلے کوئی واقعہ ہونے والا ہے۔ کیسا واقعہ یہ میں نہ جانتا تھا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اور میرا اضطراب حد سے تجاوز کرنے لگا تھا۔ لیکن میں نے بظاہر اپنے آپ کو بشاش بنائے رکھا۔ مجھے بشاش دیکھ کے والد صاحب کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں۔ لیکن میری مصنوعی بشاشت الزابیتھ کو دھوکہ نہ دے سکی۔ اس کی تیز نظر میرے باطن کا جائزہ لینے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ وہ، ہر چند

کے منہ سے کچھ نہ کہتی تھی، اداس تھی۔ اس کی آنکھوں سے خواب جھانک رہا تھا جیسے وہ بھی سب کچھ جانتی ہو جو میں جانتا تھا۔ جیسے اسے بھی احساس تھا کہ "وہ" ہماری شادی کے بعد کیا ہو کر رہے گا اور یہ کہ اس کی مسرت عارضی ثابت ہو گی۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

لوگ مبارک باد کو آئے۔ سب خوش تھے۔ لیکن میں اندر ہی اندر اداس تھا۔ بظاہر میں والد صاحب کی مسرتوں میں شریک تھا لیکن دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ یہ میری شادی کے نہیں موت کے انتظامات ہو رہے ہیں...... والد صاحب کی کوششوں سے الزابیتھ کو اس کا ورثہ مل گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی جائیداد تھی جو ساحل کومو پر واقعہ تھی۔ چنانچہ طے پایا کہ شادی کے بعد ہم اپنا ماہ عسل وہیں منائیں۔ اگر مختلف حالات میں میری شادی ہوئی ہوتی تو ہم اس خوبصورت مکان میں اپنی زندگی کے چند بہترین دن گزارتے۔ لیکن افسوس ایسا نہ تھا۔

سب لوگ شادی کی تیاریاں کر رہے تھے اور میں اپنے بچاؤ کے انتظامات۔ ممکن تھا کہ وہ عفریت براہ راست مجھ پر حملہ کرتا۔ چنانچہ ایک بھرا ہوا پستول اور ایک خنجر میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا مقابلہ اور خاتمہ کرنے کے لئے میں نے کئی ایک ترکیبیں بھی سوچ رکھی تھیں۔ جو کسی طرح فیل نہ ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ ان سوچی ہوئی ترکیبوں اور پستول اور خنجر نے میری قدرے ڈھارس بندھائی اور میں پہلے کی نسبت کم بے چین رہنے لگا۔

اس کے علاوہ ایک دوسری بات بھی ہوئی جیسے جیسے شادی کا دن قریب آتا جا رہا تھا اس عفریت کی دھمکی مجھے کھوکھلی بلکہ گیدڑ بھبکی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس لئے میرے خوف پر ہلکی مسرت اور اس سے پیدا شدہ بے خودی سی غالب آنے لگی تھی۔ الزابیتھ، جسے میں چاہتا تھا، میری شریک حیات بننے والی تھی۔ یہ خیال ہی بذات خود مسحور کن تھا۔ چنانچہ میری افسردگی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔

الزابیتھ خوش تھی۔ بے حد خوش۔ میرے بشرے سے عیاں انبساط اور شگفتگی نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ چنانچہ مجھے مسرور دیکھ کے وہ خوش تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں خوف نہ تھا جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں تارے سے چمک رہے تھے اور ہونٹوں پر ملکوتی تبسم تھا...... لیکن شادی کے دن وہ پھر اداس تھی۔ غالباً اس خیال سے کہ دوسرے دن میں اس سے بھیانک راز کہنے والا تھا۔

شادی کی رسومات ادا کی جا چکیں۔

مہمان گھر پر جمع ہوئے۔ طے پایا کہ میں اور الزابیتھ کومو تک براہ دریا جائیں اور ایک رات ایوی آن میں گزار کے پھر آگے روانہ ہو جائیں۔ دن چمکیلا اور روشن تھا اور ہوا مناسب۔ ہماری پھولوں سے لدی ہوئی کشتی میں ہمارے لئے ریشمی شامیانہ تان دیا گیا تھا۔ میں الزابیتھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اس شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ جھیل کے دونوں کناروں کے نہایت حسین مناظر ہمارے

سامنے سے گزر رہے تھے۔ کوہ سالمبو کی سر سبز چوٹیاں، پھر ہرے بھرے جنگلات اور دور پرے نظر آتا ہوا مونٹ بلانک جس کی برف پوش چوٹیوں پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔

''الزابیتھ! میری پیاری!'' میں نے کہا ''تم اداس نظر آ رہی ہو۔ کاش تم جانتیں کہ میں نے کس قدر روحانی اذیت برداشت کی ہے اور اب بھی کر رہا ہوں...... خدا کے لئے الزابیتھ! آج تو یوں اداس نہ ہو آج تو مجھے مسکرانے دو۔ کیونکہ شاید آج کے بعد میں پھر کبھی مسکرا نہ سکوں گا۔

''ایسا نہ کہو وکٹر!'' الزابیتھ نے بے چین ہو کر کہا ''خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ لیکن خدا جانے کیا بات ہے کہ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اور جیسے کوئی آواز میرے کانوں میں کہہ رہی ہے کہ ہمیں مستقبل سے کوئی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ لیکن شاید یہ شیطان کی آواز...... وکٹر! انو د! ہماری کشتی کتنی تیزی سے بہہ رہی ہے۔ اور کیسے دلچسپ نظارے دریا کے دونوں کناروں پر...... آج میں بہت خوش ہوں۔ سچ، بہت خوش۔ مجھے تو ہر چیز، حتیٰ کہ قدرت بھی، مسرور نظر آ رہی ہے۔''

اور ایسی باتیں کہہ کر وہ میرا اور مجھ سے زیادہ خود اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ لمحہ بھر کے لئے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ پھر اداس اور افسردہ تھی۔

سورج افق مغرب کی طرف جھک گیا۔ اب ہمارے دونوں طرف سیاہ اور بلند چوٹیاں تھیں اور دریا ہلکے سے شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ کوہ الپس اب بہت قریب نظر آ رہا تھا۔ عظیم الشان پہاڑ جس پر دھوپ سمٹ کر چڑھ گئی تھی۔ ہوا، جو اب تک ہمیں تیزی سے کھینچ رہی تھی، رک سی گئی۔ چنانچہ کشتی کی رفتار بے حد سست ہو گئی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا اترنے لگا تھا۔ جب ہم کنارے پر پہنچے اور ابھی میں نے ریتلے ساحل پر قدم رکھا ہی تھا کہ میرا پچھلا خوف عود کر آیا۔

اندھیرے کے ساتھ ساتھ میرا خوف بڑھنے لگا۔



تیئیسواں باب

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

ہم دونوں دیر تک باہر گھومتے رہے اور پھر سرائے میں پہنچے۔ ہوا، جو سورج کے غروب ہوتے ہی رک گئی تھی، اب پھر چلنے لگی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا میں تیزی آ گئی اور پھر دفعتہً طوفان بادوباراں پھٹ پڑا۔

دن بھر میں پرسکون رہا تھا۔ لیکن جب اندھیرا اتر آیا، درخت سیاہ بھوتوں جیسے معلوم ہونے لگے اور نزدیک و دور کی چیزوں نے اندھیرے کا لبادہ اوڑھ لیا تو میرا دماغ عجیب وغریب اندیشوں کی جولان گاہ بن گیا میرے دل کی تہوں سے بے چینی کی لہریں اٹھ کے رگ وریشے میں دوڑ گئیں اپنے آپ ہی میرے دائیں ہاتھ نے کوٹ کی اندرونی جیب میں، جو میرے سینے پر تھی، داخل ہو کے پستول کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں چوکنا اور ہوشیار تھا۔ اگر کہیں پتہ بھی کھڑکتا تو میں چونک پڑتا اور میرے ہاتھ کا انگوٹھا پستول کا گھوڑا چڑھانے لگتا۔ میں آخر تک، اس وقت تک جب تک میں یا میرا دشمن مارا نہیں جاتا، اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

الزابیتھ چند لمحوں تک خاموشی سے میری بے تابی کو دیکھتی رہی۔ میں نے غالباً کچھ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ کیونکہ وہ کانپ گئی تھی۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کیا بات ہے وکٹر؟ تم اتنے پریشان اور خائف کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... آج کی رات...... صرف آج کی رات خیریت سے گزر جائے ......تو پھر......تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا......اف کس قدر بھیانک ہے آج کی رات!''

ایک گھنٹہ، قیامت کا ایک گھنٹہ گزر گیا۔

دفعتہً مجھے خیال آیا کہ اگر وہ آیا تو الزابیتھ اس کی صورت دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائے گی اور بفرض محال نہ بھی ہوئی تو میں اس کی موجودگی میں اپنے دشمن کا مقابلہ نہ کر سکوں گا کیونکہ اس طرح ایک طرف، تو مجھے اپنا بچاؤ کرنا پڑے گا اور دوسری طرف الزابیتھ کی حفاظت۔

''الزابیتھ! تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ کچھ کہے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں گھوم پھر کے یہ دیکھنے لگا کہ وہ کس طرف سے حملہ کر سکتا ہے اور میں کس طرح اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں دالان میں آ گیا۔ ایک ایک کونہ،

جہاں اس کے آنے کا امکان ہو سکتا تھا، دیکھ ڈالا...... وہ وہاں نہ تھا،

بہت دیر ہوگئی۔

وہ کہیں نظر نہ آیا۔ میرا خوف اور بے چینی دور ہونے لگی اور میں نے مسرت کی ہلکی سی لہر محسوس کر کے سوچا کہ اس کے ساتھ شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہوگا، غالباً اس کا خاتمہ ہو چکا ہو گا اور...... یکا یک ایک چیخ سنائی دی۔ چیخ کی آواز الزابیتھ کے کمرے میں سے آئی تھی۔ اس کے شیطانی ارادے کی حقیقت دفعتہً مجھ پر واضح ہوگئی، میرا دماغ سُن ہو گیا۔ اور ہاتھ کٹی ہوئی ٹہنیوں کی طرح بے جان سے لٹک گئے۔ میرے پٹھوں اور اعضاء نے دفعتہً اپنا کام کرنا چھوڑ دیا اور میرے بدن کا سارا خون میری کھوپڑی میں جمع ہو کر کنپٹیوں میں بجنے لگا۔ چیخ پھر سنائی دی میں جیسے خواب سے بیدار ہو کے گولے کی طرح دوسرے کمرے میں پہنچا۔

الزابیتھ...... میری پیاری الزابیتھ، جو آج ہی میری بیوی بنی تھی اور جس کے ارمان پورے نہ ہوئے تھے، بستر پر ترچھی پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں بستر کے ایک طرف لٹک گئی تھیں اور بے نور تھیں اور چہرے پر دم گھٹنے کی اذیت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ مر چکی تھی میرے خداوہ مر چکی تھی۔

چند ثانیوں تک میں بت بنا کھڑا رہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

خدا جانے میں کب تک بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں دوسرے کمرے میں تھا اور بہت سے لوگ، جن کے چہروں سے خوف و حیرت عیاں تھی، میرے چاروں طرف کھڑے تھے۔ میں اٹھا اور دیوانوں کی طرح لوگوں کو دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں، جہاں الزابیتھ کی لاش تھی، پہنچا۔ پہلے وہ پلنگ پر ترچھی پڑی تھی لیکن اب لوگوں نے اسے سیدھا لٹا دیا تھا اور اس کے چہرے پر ایک رومال ڈھانک دیا گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سو رہی ہے اور وہ جو کچھ میں نے دیکھا خواب تھا۔ میں دوڑ کر الزابیتھ سے لپٹ گیا۔ لیکن اس کے ٹھنڈے بدن اور ڈھلکی ہوئی گردن نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ خواب نہیں حقیقت تھی اور یہ کہ میں جس سے لپٹا ہوا ہوں وہ زندہ نہیں مردہ الزابیتھ ہے۔ اس کے نازک اور گورے حلق پر خونی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔

میں اسے پکارنے اور جھنجھوڑنے لگا۔ میں پاگل ہو گیا۔ اتفاقاً میری نظر اوپر اٹھ گئی۔ کھلے روشندان میں سے زرد رو چاند نظر آ رہا تھا۔ پھر ایک مہیب سائے نے چاند کو ڈھک لیا۔ روشندان کے چوکھٹے میں ایک ہیبت ناک چہرہ جڑا ہوا تھا...... وہ...... وہ...... وہی تھا...... وہی ڈبڈباتی ہوئی نیم وا آنکھیں، وہی جھریوں پڑا بھیانک چہرہ...... اور...... اور...... اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور یوں مسکرا کے اس نے سر ہلایا اور اپنی سوکھی اور لمبی انگلی سے الزابیتھ کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ میں دوڑ کر روشندان کے قریب پہنچا اور پستول نکال کے گولی چلا دی۔ لیکن وہ بچ گیا۔ اس نے

ایک بار پھر مسکرا کر میری بیوی کی لاش کی طرف اشارہ کیا اور تیزی سے بھاگتا ہوا جھیل میں کود پڑا۔

دھماکے کی آواز سن کے وہ لوگ، جو دوسرے کمرے میں تھے، دوڑے آئے میری زبان گنگ ہوگئی تھی۔ چنانچہ میں نے اس طرف اشارہ کیا جس طرف کہ وہ گیا تھا۔ ہم لوگ تیزی سے باہر آئے۔ اسے ہر جگہ تلاش کیا ''وہ'' نہ ملا۔ ہم نے کشتیوں میں بیٹھ کے جھیل میں اسے دور دور تک تلاش کیا۔ حتیٰ کہ جال پھینکے لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ کئی گھنٹوں کی تلاش کے بعد ہم لوگ ناکام واپس لوٹے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جسے میں نے دیکھا اور جس پر میں نے گولی چلائی تھی، میرا وہم تھا۔ تاہم کشتیوں سے اترنے کے بعد وہ لوگ مختلف گروہوں میں بٹ کے اسے تلاش کرنے کے لئے جنگل اور انگور کے باغات میں بکھر گئے۔

میں بھی ایک گروہ کے پیچھے چلا۔ لیکن ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ میرا سر چکرانے اور ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ اور میں نیم جاں زمین پر ڈھے گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے گاڑھی دھندسی چھائی ہوئی تھی اور بدن تانبے کی طرح تپ رہا تھا۔ اسی حالت میں لوگ مجھے اٹھا کے سرائے میں لائے اور بستر پر لٹا دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ میری نظر کمرے میں چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کمرے میں پہنچا۔ وہاں بستی کی بہت سی عورتیں بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں الزابیتھ کی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پڑا۔ اس تمام عرصے میں میرا دماغ دھندلایا ہوا رہا۔ کوئی خیال واضح نہ تھا۔ ان گنت بھیانک خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے اور میں کچھ پاگل سا ہو رہا تھا۔......ولیم کی موت......جسٹائن کو پھانسی......ہینری کی موت اور پھر الزابیتھ کا خون......مجھ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ حیران ہوں کہ اس کے بعد میں زندہ کس طرح رہا!......اور پھر میں یقین سے بھی نہ کہہ سکتا تھا والد صاحب اور آرنسٹ اس عفریت کے شر سے محفوظ تھے۔ ممکن ہے کہ اب وہ وہاں پہنچ گیا ہو اور آرنسٹ کی لاش اس کے قدموں میں پڑی ہو اور والد صاحب اس کی آہنی گرفت میں تڑپ رہے ہوں......میرے خدا!......اس خیال کے آتے ہی میں کانپ گیا......اب وہی دونوں باقی رہ گئے تھے ......اب مجھے انہیں بچانا تھا......حالانکہ نہیں جانتا تھا کہ انہیں بچا سکوں گا یا نہیں......! بہر حال اس خیال نے مجھے عمل پر اکسایا۔ خدا جانے کہاں سے میرے بدن میں قوت آ گئی۔ میں اٹھا۔

میں جلد از جلد جنیوا پہنچنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

وہاں سے مجھے گھوڑے نہ مل سکتے تھے۔ چنانچہ مجھے بحری سفر کرنا تھا۔ لیکن عناصر بھی میرے دشمن ہو رہے تھے۔ ہوا موافق نہ تھی اور بارش یوں ہو رہی تھی گویا آج برس کے پھر کبھی نہ برسے گی۔ بہر حال ابھی سورج طلوع نہ ہوا تھا اور رات ہونے سے پہلے میں جنیوا پہنچ سکتا تھا۔ میں نے چند

آدمیوں کو منہ مانگی اجرت دے کر کشتی دھکیلنے کے لئے ساتھ لے لیا۔ خود میں نے چپو سنبھالے۔ لیکن اس وقت میری کچھ ایسی حالت ہو رہی تھی کہ میں کسی کام کے قابل نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے چپو رکھ دیئے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دے کر بیٹھ گیا اور رات کا منظر نظروں کے سامنے گھومنے لگا ......الزابیتھ......میری بیوی کی لاش بستر پر ترچھی پڑی ہوئی تھی اور اس کے حلق پر خون کی انگلیوں کے نشانات تھے......وہ بطور میری بیوی کے ایک رات بھی میرے ساتھ نہ گزار سکی تھی......میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے......ہائے مجھ جیسا غمزدہ اور بدنصیب شخص روئے زمین پر کوئی دوسرا نہ ہوگا میں برداشت کی آخری حد تک پہنچ گیا ہوں۔ اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ اب میری زندگی کے بہت تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اتنی قوت ہے کہ اپنی بقیہ کہانی نہایت تفصیل سے سنا سکوں۔ چنانچہ میں بھی کہانی کو جتنی کچھ باقی رہ گئی ہے، اب مختصر کئے دیتا ہوں۔

میں جنیوا پہنچا۔ والد صاحب اور آرنسٹ زندہ تھے۔ الزابیتھ کی موت کی خبر سن کر والد صاحب پر ایک سکتہ طاری ہو گیا......قوتِ برداشت کا وہ پتلا اس آخری ضرب کی تاب نہ لا سکا......انہوں نے ولیم، جسٹائن اور ہینری کی موت پر صبر کیا تھا۔ لیکن الزابیتھ کی موت اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوئی۔ والد صاحب کی اس وقت کی حالت کی تصویر میری نظر کے سامنے سے ہٹتی نہیں۔ وہ بت بنے کھڑے تھے اور ان کی آنکھوں کی چمک بجھ سی گئی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح کہیں خلا میں گھور رہے تھے۔ خدا سمجھے اس عفریت سے، جس نے اس بوڑھے پر رحم نہ کیا۔ اسی دن سے وہ بستر پر جا پڑے اور اس کے چند دنوں کے بعد انہوں نے میری بانہوں میں دم توڑ دیا۔

پھر کیا ہوا؟......میں نہیں جانتا۔ میری ساری حسیں مردہ ہو گئیں۔ صرف اتنا احساس تھا کہ میرے چاروں طرف اندھیرا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں سرد آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو زنداں میں پایا۔ یادوں کے بھوت مجھے پریشان کرنے لگے۔ غم اور افسردگی مجھے کچلنے لگی اور میری حالت مالیخولیا کے مریضوں کی سی ہو گئی۔ میں نہیں جانتا کہ کتنے دنوں تک میری ایسی حالت رہی۔ رفتہ رفتہ میری سوچنے سمجھنے کی قوتیں عود کر آئیں۔ پھر، مجھے یاد ہے کہ میں رہا کر دیا گیا۔ کیونکہ جج نے میرے پاگل ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ اور حقیقت میں میری حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔

اور یہ آزادی میرے لئے محض بے کار ہوتی اگر میں اپنے آپ کو اس عفریت سے انتقام لینے کے لئے تیار نہ کرتا۔ میرے حواس بجا ہوئے تو پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ وہ جسے میں نے بنایا ہے اور جو میرے دکھوں کا بانی ہے، زندہ اور آزاد ہے......اور اس خیال کے ساتھ ہی پاگل کر دینے والا غصہ مجھ

پر مسلط ہو گیا اور میں نے گڑگڑا کے خدا سے دعا کی کہ ایک دفعہ، صرف ایک دفعہ میرا اس کا سامنا ہو جائے۔ میں اس کا خاتمہ کر دینے کے لئے بے تاب ہو گیا۔

اور اس دفعہ میں نے جھوٹی امیدوں سے اپنے آپ کو دھوکا نہ دیا اور اس عفریت کا خاتمہ کرنے کے مسئلے پر پہلی دفعہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ اور ا ایک آخری فیصلے پر پہنچ کر، اپنی رہائی کے کوئی ایک مہینے بعد، میں عدالت عالیہ کے جج کے پاس پہنچا اور میں نے اس سے کہا کہ میں ایک بیان دینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں ولیم، جسٹائن، ہینری اور الزابیتھ کے خونی کو جانتا ہوں اور اسے گرفتار کرنے کے لئے مجھے اس کی (جج کی) اعانت اور مدد درکار ہے۔

''میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس خونی کو بہر حال گرفتار کر لینا چاہیئے کیونکہ یہ بے حد خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

''شکریہ...... میری آپ سے درخواست ہے کہ نہایت غور اور توجہ سے میرا بیان سنئے۔ یہ ایک ایسی عجیب وغریب داستان ہے کہ ڈرتا ہوں کہ آپ اس پر یقین نہ کریں گے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پوری طرح اپنے حواس میں ہوں اور میری کہانی نہ تو پاگل پنا ہے اور نہ ہی میں پاگل ہوں۔ میں جو کچھ کہوں گا حقیقت ہے۔ آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی کہانی گڑھنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے چونکہ میں رہا کر ہی دیا گیا ہوں چنانچہ میں جو کچھ بھی بیان کروں گا وہ حقیقت ہے ایک پاگل دماغ کی اپچ نہیں ہے اور نہ ہی پاگل کا بھیانک خواب۔''

جب میں نے جج کو اس طرح مخاطب کیا تو میں ذرا بھی بے چین اور مضطرب نہ تھا۔ بہر حال میں نہایت ٹھہری ہوئی آواز میں اپنی کہانی سنانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ ہر واقعہ کی تاریخ اور وقت بھی بتاتا جاتا تھا۔

ابتدا میں تو وہ بڑی بے توجہی سے میری کہانی سنتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور میں نے دیکھا کہ کبھی تو وہ خوف سے کانپ اٹھتا اور کبھی اس کے بشرے سے حیرت، بے اعتباری اور تشکک کے آثار ہویدا ہونے لگتے۔

کہانی ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

''یہی عفریت میرے عزیزوں کا خونی ہے اور اسی کو گرفتار کرنے کے لئے مجھے آپ کی اعانت اور مدد کی ضرورت ہے۔ یقین ہے کہ آپ میری درخواست رد نہ کرتے ہوئے میری ہر ممکن مدد کریں گے۔''

میرے اس آخری فقرے پر وہ چونکا۔ اس نے میری کہانی اس طرح سنی تھی جس طرح کہ بچے جنوں اور پریوں کی کہانی سنتے ہیں اور کبھی اس کے واقعات پر یقین کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے۔

''دیکھئے آپ انکار نہیں کر سکتے۔اس خونی کو گرفتار کرنا آپ کا فرض ہے۔'' میں نے کہا۔

اور جب میں نے اسے اپنا فرض یاد دلایا تو اس کے چہرے کے جذبات میں فوراً تغیّر ہوا۔ بے اعتباری کے جذبات دوسرے جذبات پر غالب تھے۔تاہم اس نے بڑی ملائمت اور ہمدردی سے کہا۔

''بے شک یہ ہمارا فرض ہے اور ہم اس طرح آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اسے گرفتار نہ کر سکیں گے۔اور ہماری ساری بھاگ دوڑ محض بے کار جائے گی۔کیونکہ آپ کے بیان کے مطابق وہ جسے آپ نے بنایا ہے، مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے اور اسے گرفتار کرنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔آپ ہی سوچئے کہ ایسے جاندار کا کون تعاقب کر سکتا ہے جو سمندروں کو حیرت انگیز تیزی سے طے کر سکتا ہے، پہاڑوں پر حیوانی پھرتی سے چڑھ سکتا ہے اور ایسی جگہ رہ سکتا ہے جہاں انسانوں کا گزر ممکن نہیں؟ اس کے علاوہ لسے آخری جرم کئے ہوئے بھی چند مہینے گزر چکے ہیں۔چنانچہ کہا نہیں جا سکتا کہ اس وقت وہ دنیا کے کون سے حصے میں بھٹک رہا ہوگا یا کہاں چھپا ہوا ہوگا......؟''

''یقین ہے کہ وہ کہیں دور نہ ہوگا۔کیونکہ میں جہاں ہوتا ہوں وہیں وہ بھی ہوتا ہے اگر وہ الپس کی چوٹیوں پر پناہ گزیں ہے تو ہم اس کا کھوج لگا سکتے ہیں۔اور اس کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔لیکن معاف کیجئے گا جناب آپ کے بشرے سے میں نے آپ کے خیالات کا اندازہ لگا لیا ہے اور میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔آپ میری آپ بیتی کو جھوٹ اور من گھڑت سمجھتے ہیں اور میری مدد کرنے اور میرے دشمن کو وہ سزا دینے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کا وہ مستحق ہے۔''

اور آخری الفاظ کہتے وقت میری آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔جج کچھ گھبرا سا گیا۔

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے نوجوان! کہ تمہارا اندازہ غلط ہے۔'' اس نے کہا'' جہاں تک میرے اختیار میں ہے میں تمہاری مدد کروں گا۔تاہم جو کچھ تم نے کہا ہے اس کے پیشِ نظر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ہم کامیاب نہ ہوں گے۔چنانچہ میری درخواست ہے کہ کسی طرح کی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوتے ہوئے اور اپنے آپ کو کسی طرح کا یقین نہ دلاتے ہوئے ناکامیابی کے لئے پہلے ہی سے اپنے آپ کو تیار کر لو۔''

''نہیں ...... یہ نہ ہوگا...... نہ ہوگا...... میں جانتا ہوں کہ اب آپ سے کوئی درخواست کرنا اور کچھ کہنا لاحاصل ہے میں اس عفریت، اس کے ارادوں اور اس شیطنت سے بہت حد تک واقف ہوں اور جب تک اس کا خاتمہ نہ کر لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا جب بھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ وہ شیطان دنیا میں آزاد گھوم رہا ہے تو میں مارے غصہ کے دیوانہ ہو جاتا ہوں۔آپ میری درخواست قبول نہیں کر رہے ہیں۔اس لئے اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ میں

تنہا اس کا تعاقب کروں اور اسے سزا دوں اس لئے گواہ رہیئے کہ جب تک میرے دم میں دم ہے میں اس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اگر کامیاب رہا تو مجھے روحانی سکون میسر آئے گا اور اگر ناکام رہا تو میرے تمام دکھوں کا ایک ہی وقت میں خاتمہ ہو جائے گا۔''

یہ کہتے کہتے میں بری طرح کانپنے لگا۔ اور اس وقت میرے بشرے سے اس بہادر کا سا عزم اور استقلال عیاں تھا جو وطن کی راہ میں شہید ہونے کے ارادے سے نکلا ہو۔ لیکن جج نے میرے بشرے سے عیاں ان جذبات کو پاگل پنے کی علامت سے تعبیر کیا چنانچہ وہ مجھے یوں چمکارنے اور سمجھانے لگا جیسے کہ ایک دایا ضدی بچے کو چمکارتی اور سمجھاتی ہے۔ آخر میں اس نے کہا کہ میں اپنی علالت کے زمانے میں الٹے سیدھے خواب دیکھتا رہا ہوں اور ان خوابوں کو میں نے حقیقت سمجھ لیا ہے۔ اور یہ کہانی انہی خوابوں میں سے میرا ایک خواب ہے۔

''جناب!'' میں چیخ کر بولا'' کاش کہ آپ وہ سب کچھ جانتے ہوتے جو میں جانتا ہوں اور چونکہ آپ کچھ نہیں جانتے اس لئے مناسب ہوگا کہ اس معاملے میں خاموش ہی رہیں اور اپنی ہمدردیاں بیکار مجھ پر صرف نہ کریں۔ معاف کیجئے گا مجھے آپ کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے پاگل سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں لیکن میں جانتا ہوں کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں پوری طرح اپنے حواس میں ہوں اور میں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے۔ اب ہمدردیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ میں اس عفریت کا خاتمہ کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں اور آج ہی سے اپنی کوششوں کا آغاز کرتا ہوں اور جب تک ہم دونوں مین ایک بھی زندہ ہے میری یہ کوششیں جاری رہیں گی۔ خدا کرے کہ ایک دفعہ آپ کا اور اس عفریت کا سامنا ہو جائے تا کہ آپ جان لیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ نہیں ہے...... میں اس سے انتقام لوں گا...... اپنے عزیزوں کے خون کا انتقام اس سے لوں گا...... یا تو اس کا خاتمہ کر کے دنیا کو اس کے ناپاک وجود سے پاک کر دوں گا یا خود ہی مر کر اس احمق اور دکھ بھری دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ آپ کی ہمدردی اور تسلی آمیز باتوں کا شکریہ۔ خدا حافظ۔''

میں غصہ میں چیختا اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ اور عمل کا ایک نیا نقشہ سوچنے لگا، اور اس احساس کے ساتھ کہ اب جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔ اس کا ثبوت مل چکا تھا کہ کوئی میری کہانی پر یقین نہ کرے گا اور نہ ہی کوئی میری مدد کرے گا۔



چوبیسواں باب

میرے دوسرے خیالات اور احساسات شدید غصے نے نگل لئے میں صرف ایک بات سوچ رہا تھا۔ بہر طور مجھے اس خونی کا خاتمہ کرنا ہے انتقام کا ہی جذبہ میری جسمانی قوت برقرار رکھے ہوئے تھا اور یہی ایک جذبہ تھا جس کے سہارے میں زندہ تھا یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ یہی جذبہ تھا جو مجھے جینے پر مجبور کر رہا تھا۔

چنانچہ اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے میں نے جنیوا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ جنیوا میرا آبائی وطن جہاں میرے لئے اب کچھ نہ رہ گیا تھا۔ میں نے تھوڑی سی نقدی اور وہ زیورات، جو والدہ کی یادگار تھے، اپنے ساتھ لئے اور جنیوا سے نکل کھڑا ہوا۔

اور اب میری آوارہ گردی کا وہ دور شروع ہوا جس کا خاتمہ میری موت پر ہوگا۔ میں دنیا کے بہت بڑے حصے کو عبور کر چکا اور سفر کی وہ صعوبتیں برداشت کر چکا ہوں جو کبھی کسی نے برداشت نہ کی ہوں گی۔ میں کس طرح زندہ رہا یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ اکثر یوں ہوتا کہ میں نیم جانی سے زمین پر ڈھیر ہو جاتا اور اپنی موت کی دعا مانگنے لگا۔ لیکن میں زندہ ہوں۔ انتقام کی آگ نے مجھے زندہ رکھا...... نہیں۔ میں نہ مروں گا...... مجھے نہیں مرنا ہے...... ابھی ''وہ'' زندہ ہے اور جب تک میں اس کا خاتمہ نہیں کر لیتا نہ مروں گا۔

جنیوا چھوڑنے کے بعد سب سے پہلے مجھے اس عفریت کا سراغ لگانا تھا تا کہ میں اس کا تعاقب کر سکوں۔ لیکن چونکہ میں نے اپنے عمل کا کوئی واضح نقشہ نہ بنایا تھا اس لئے میں شہر کے باہر کئی گھنٹوں تک بھٹکتا رہا۔ کیونکہ نہ جانتا تھا کہ مجھے کس طرف سے جانا ہے۔ جب رات ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو اس قبرستان کے دروازے کے سامنے کھڑے پایا جس میں ولیم، والد صاحب، جسٹائن اور الزابیتھ ابدی نیند سو رہے تھے۔ میں قبرستان میں داخل ہو گیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ صرف ہوا کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ رات اندھیری اور خنک تھی اور فضا میں مردوں کی روحیں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

جب میں قبرستان میں داخل ہوا تو غمگین اور افسردہ تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی شدید غصہ ان جذبات پر غالب آ گیا۔ ولیم، والد صاحب اور الزابیتھ کی قبریں میرے سامنے تھیں۔ لیکن میں زندہ تھا۔ ان کا قاتل زندہ تھا اور اب مجھے اسکا خاتمہ کرنا تھا۔ دنیا میں میرے لئے بس یہی ایک کام باقی رہ

گیا تھا میں وہاں، قبرستان میں گھٹنوں کے بل جھک گیا اور زمین چوم کر بولا۔

''اس دھرتی کی قسم، ان مقدس روحوں کی قسم جو یقیناً اس وقت مجھے دیکھ رہی ہیں اور اس رات کی قسم...... کہ میں اس وقت تک اس شیطان کا تعاقب کروں گا جب تک ہم دونوں میں سے کسی ایک کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ میری زندگی کا یہی ایک مقصد ہے اور میں اسی لئے زندہ ہوں اور زندہ رہنے کی کوشش کروں گا۔ تپتے ہوئے صحرا اور طوفانی دریاؤں کو خاطر میں نہ لاؤں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ مرتے دم تک اس کا تعاقب کروں گا۔ چنانچہ اے مقدس روحو اس کام میں میری مدد کرو...... اے خدا! میری مدد کر...... وہ عفریت میری زندگی میں اور میرے بعد اکیلا، اور بے تاب رہے۔ تنہائی سانپ بن کر اسے ڈستی رہے۔ تنہائی اسے کبھی چین نہ لینے دے۔ وہ جب تک زندہ رہے ایک ساتھی کے لئے تڑپتا رہے۔ وہ موت کی آرزو کرے اور اسے موت نہ آئے۔ زندگی لعنت بن کر اس سے چمٹ جائے...... پروردگار مجھے ہمت عطا فرما۔ پروردگار مجھے قوت عطا فرما کہ میں اس سے انتقام لے سکوں جواب تک مجھ سے انتقام لیتا رہا ہے میں اس کا دل چھلنی کر دوں جس نے میرا دل چھلنی کر دیا ہے۔''

اور میری ان قسموں اور التجاؤں کا جواب آیا۔

ایک بھیانک دوزخی قہقہہ خاموش اور اندھیری رات کا دل چیر گیا اور ایسا تھا وہ قہقہہ کہ میں کانپ اٹھا۔ میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے اور میرا بھیجا ہل سا گیا۔ بھیانک قہقہہ سامنے کے پہاڑوں سے ٹکرایا اور لڑھکتا ہوا واپس لوٹا۔ قہقہے کی گونج مدھم ہوتے ہوتے ڈوب گئی۔ اور پھر ایک مکروہ آواز نے، اور اس آواز کو میں بخوبی پہچانتا تھا، کہیں قریب سے ہی تقریباً سرگوشی میں کہا۔

''میرے خالق! اب مجھے اطمینان حاصل ہوا۔ بدنصیب انسان! تو نے زندہ رہنے کا فیصلہ کیا اور میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔''

میں تیر کی طرح لپکا اس طرف جس طرف سے آواز آئی تھی۔ عین اسی وقت چاند طلوع ہوا اور اس کی مردہ روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ ایک دیو قامت سایہ حیرت انگیز تیزی سے، جو سراسر غیر انسانی تھا، ایک طرف بھاگا جا رہا تھا۔

میں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس دن تک کرتا رہا جس دن کہ کپتان صاحب آپ نے مجھے اپنے جہاز پر لے لیا۔

اس کے تعاقب میں مَیں نے دریاؤں کی پر پیچ وادیاں طے کیں اور بحر متوسط کے ساحل پر پہنچ گیا۔ اور ایک رات دیکھا کہ وہ اس جہاز پر سوار ہو رہا تھا جو بحر اسود کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ میں بھی اس جہاز پر سوار ہو گیا لیکن میرا دشمن وہاں سے بچ نکلا۔ میں نہیں جانتا کہ کس طرح؟۔

تاتار اور روس کے بے آب و گیاہ صحراؤں میں، میں اس کا تعاقب کرتا رہا لیکن اسے پکڑ نہ سکا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے لوگ، مرد، عورتیں اور بچے، اس کو دیکھ کر ڈر جاتے اور مجھے بتاتے کہ وہ کس طرف گیا ہے اور کبھی یہ ہوتا کہ وہ خود میری راہبری کرتا اور اس راستے پر جس سے وہ گزرا ہوتا، چند نشانات چھوڑ جاتا کیونکہ اسے خوف تھا کہ اگر مجھے اس کا سراغ نہ ملا تو میں مایوسی اور ناامیدی سے مر جاؤں گا اور وہ یہ نہ چاہتا تھا۔

موسم سرما آیا۔ برف باری شروع ہوگئی۔ زمین پر جمی ہوئی برف کی سفید تہہ پر میں اس کے قدموں کے نشانات دیکھتا اور ایک بیتابانہ جوش کے عالم میں آگے بڑھتا رہتا۔ کپتان صاحب! آپ پہلی دفعہ اس برفستانی خطہ میں آئے ہیں اور ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہیں۔ چنانچہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں نے کتنی تکلیفیں برداشت کی ہوں گی۔ بھوک، پیاس اور ٹھٹھرا دینے والی سردی...... اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی کا مر گیا ہوتا۔ لیکن میں سخت جان ہوں کہ اپنی کہانی کے لئے زندہ رہا۔

بھوک، پیاس اور سردی...... میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں درختوں کے پتوں اور چھال سے اپنی بھوک مٹاتا اور قبل از تاریخ کے انسانوں کی طرح غاروں میں رہتا۔

وہ عفریت ایسے راستوں سے جاتا، جن پر بستی تو کجا انسان کا سایہ تک نظر نہ آتا۔ کبھی اتفاقاً کوئی بستی نظر آتی تو میں کسی کے یہاں، اسے تھوڑے سے روپے دے کر، ایک رات کے لئے رہ پڑتا (میں کہہ چکا ہوں کہ اپنے ساتھ تھوڑی سی رقم اور زیورات لے کر چلا تھا) اور وہ رات مجھے حسین ترین رات معلوم ہوتی۔ ورنہ میری ہر رات کھلے آسمان تلے یا اندھیرے غاروں میں گزرتی۔

چنانچہ، میرے دوست، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میری زندگی کیسی گزر رہی تھی۔ میں سکون اسی وقت محسوس کرتا جب رات کو میری آنکھ لگ جاتی صبح کی پہلی کرن کے ساتھ میں پھر چل پڑتا اور رات کا منتظر رہتا...... رات ہی کو میں ولیم، والد صاحب، الزابیتھ، جسٹائن اور ہینری کی آواز سنتا اور ان کی صورتیں میری نظر کے سامنے گھومنے لگتیں اور میں اپنی قسم دہراتا۔

اس کے، جس کا میں تعاقب کر رہا تھا، جذبات واحساسات کیا تھے میں نہیں جانتا۔ بعض دفعہ درختوں کے تنوں، پتھروں اور چٹانوں پر کچھ لکھ کر میری راہبری کرتا، میرے غصے اور جذبۂ انتقام کو ہوا دیتا اور مجھے تعاقب پر اکساتا۔

اس نے ایک پتھر پر لکھا تھا۔

میرا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا۔ تم زندہ ہو اور میرے غلام۔ میرا حکم مانو اور میرا تعاقب کرو۔ اب میں برفستان کی طرف جا رہا ہوں، آؤ۔ میرے پیچھے آؤ۔ وہاں کی سردی تمہاری ہڈیوں کے گودے تک کو ٹھٹھرا دے گی۔ لیکن میں اس کا عادی ہوں۔ برفستان کی سرحد پر تمہیں ایک مردہ خرگوش پڑا ہو

ا ملے گا۔ اسے کھا کر اپنی جسمانی قوت برقرار رکھو۔ آؤ۔ میرے خالق! میرے دشمن! ہماری زندگی کی یہ یادگار دوڑ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ انجام سے پہلے ابھی تمہیں بہت کچھ برداشت کرنا ہے۔

میں قسم کھاتا ہوں...... کپتان صاحب گواہ رہنا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ اس وقت تک میں اس کا تعاقب کرتا رہوں گا۔ جب تک کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

میں نے شمالی برفستان میں اس کا تعاقب کیا۔ سردی ناقابلِ برداشت تھی۔ لوگ اپنی اپنی جھونپڑیوں میں آگ جلائے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی شخص نظر آجاتا جو اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے جھونپڑی سے نکل آیا ہوتا۔ چاروں طرف ویرانی تھی اور سفید سفید برف۔ دریاؤں کی سطح پر کئی فٹ موٹی برف کی تہہ جم گئی تھی اور جنگلی جانور بھی اپنے اپنے بھٹوں میں جا چھپے تھے اور میری غذا کا مسئلہ نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔

میرے مصائب کے ساتھ ساتھ میرے دشمن کی خوشی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ اس نے یوں لکھا۔

''ہوشیار ہو جاؤ میرے خالق! ابھی تو میرے انتقام کی ابتدا ہی ہوئی ہے۔ اپنے آپ کو گرم کپڑوں میں لپیٹ لو۔ اشیائے خوردونوش کا ذخیرہ جمع کرلو۔ اب ہم ایسے خطے میں داخل ہو رہے ہیں جہاں کی تکلیفیں تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوں گی اب میری نفرت و جذبۂ انتقام کو کچھ تسکین ملے گی۔''

اس کی اس طنزیہ اور حقارت آمیز تحریر نے میرے غصے کو ہوا دی اور ایک بار پھر میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اسے اس کی جسارت کی سزا دوں گا۔ چنانچہ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا اور ایک ایسے سمندر پر پہنچا جو دنیا کے سارے سمندروں سے مختلف تھا۔ افق تا افق سفید اور چمکیلی برف جمی ہوئی تھی۔ میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے برف تک پہنچا دیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں میں اپنے دشمن اور اپنے مصائب کے بانی کو جالوں گا اور اسی جگہ میرے اور اس کے درمیان آخری اور فیصلہ کن معرکہ ہوگا۔ اسی جگہ یا تو میں اس کا خاتمہ کردوں گا۔ یا خود ہی برف کی موٹی موٹی تہوں کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاؤں گا۔

آج سے چند ہفتوں پہلے میں نے ایک برف گاڑی، مع کتوں کے خریدی اور اپنا تعاقب جاری رکھا اور اس دفعہ میری رفتار بھی تیز تھی، میں نہیں جانتا تھا کہ اس عفریت کے پاس بھی برف گاڑی ہے یا نہیں لیکن معلوم ہوا کہ ہر دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی وہ شیطان مجھ سے بچ نکلا تھا۔ تاہم

میرے اور اس کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ جب میں اس برفستان کی سرحد پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے صرف ایک دن پہلے آگے روانہ ہوا تھا۔ گویا ہم دونوں میں صرف ایک دن کا فاصلہ تھا۔ چنانچہ اس امید میں کہ میں بہت جلد اسے جا لوں گا، میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور دو ہی دنوں بعد میں ایک چھوٹی سی ساحلی بستی میں تھا۔

بستی والوں سے میں نے اس عفریت کے متعلق پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ایک دیو، جو حد درجہ بدصورت اور ڈراؤنا تھا، گزشتہ رات بستی میں آیا تھا۔ اس کے پاس ایک بندوق اور بہت سے پستول تھے۔ بستی کے کنارے پر کی ایک جھونپڑی والے اسے دیکھتے ہی خوف سے چلاتے ہوئے بھاگ آئے تھے اور پوری بستی میں خوف و ہراس کی عام لہر دوڑ گئی تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس دیو نے جھونپڑی والوں کی اشیائے خوردونوش کا سارا ذخیرہ جھونپڑی والوں کی برف گاڑی میں رکھا، سب کتے اس نے جوتے اور اس طرف روانہ ہو گیا جس طرف کہ آج تک کوئی انسان نہیں گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس طرف سوائے برف کے اور کچھ نہیں ہے۔ آدمی بھوک پیاس سے نہیں سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا ہے۔ چنانچہ وہ دیو بھی بہت جلد مر جائے گا۔

بستی والوں سے یہ معلومات حاصل کر کے میں قدرے مایوس ہو گیا۔ اب مجھے ایک ایسے خطے میں سفر کرنا تھا جہاں برف کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور سردی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کے باشندے بھی اس سے پناہ مانگتے تھے اور پھر میں تو اس ملک کا باشندہ تھا جہاں کی آب و ہوا معتدل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسی سردی کو دو دن بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میرا ٹھٹھر کے مر جانا یقینی تھا۔ لیکن میری یہ مایوسی عارضی تھی اس خیال نے میری ہمت بندھائی کہ بہر حال مجھے مرنا تو ہے ہی۔ کسی طرح بھی سہی۔ ایک دن پہلے مرا تو کیا اور ایک دن بعد مرا تو کیا، کم سے کم میں اپنے دشمن کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں گا کہ میں بودا اور بزدل تھا۔ اور پھر میں آخر دم تک اس کا تعاقب کرنے کی قسم کھا چکا تھا۔

چنانچہ اپنی برف گاڑی میں اشیائے خوردونوش کا ذخیرہ رکھ کے اور خدا کا نام لے کر اس برفستان میں گھس پڑا۔ میں نہیں جانتا کہ برفستان میں کتنے دنوں تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔ البتہ اشیائے خوردونوش کا جتنا ذخیرہ میں نے ساتھ لیا تھا اس کی بناء پر میں اندازاً کہہ سکتا ہوں کہ میرا یہ تکلیف دہ سفر کم سے کم تین ہفتوں کا رہا ہو گا۔ کپتان صاحب! اس سفر میں مَیں نے جتنے مصائب برداشت کئے ہیں ان کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ بارہا برف کے دندانے دار اور خطرناک تودے میری راہ میں حائل ہوئے، بارہا میں نے اس سمندر کا شور سنا جو برف کی موٹی تہہ کے نیچے کروٹیں بدل رہا تھا۔ برف

مسلسل گرتی رہی اور یہ برف میں نے اپنے سر پر لی۔ ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں چلتی رہیں اور میں ان کو خاطر میں نہ لایا۔

ایک دن جب کتے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر کے برف گاڑی کو گھسیٹتے ہوئے ایک بلند تودے پر پہنچے تو ایک کتا تھکن سے چور ہو کر گرا اور پھر مر گیا۔ دوسرے کتوں کی حالت بھی قابل رحم ہو رہی تھی۔ اور مایوسیاں میرے دل میں گھر کرنے لگی تھیں کہ مجھے دوپہر کو ایک متحرک دھبہ سا دکھائی دیا۔ میں نے آنکھیں بھینچ کر غور سے دیکھا اور میرے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ وہ ایک برف گاڑی تھی جس میں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ اور اسے پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ وہ وہی تھا۔ خدا جانے کیوں میں اسے دیکھتے ہی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ عفریت میری نظر سے اوجھل ہو جائے۔ میں نے مرے ہوئے کتے کو کھول کر الگ پھینکا۔ دوسرے کتوں کو خوب سا کھانا کھلایا اور ایک گھنٹہ کے آرام کے بعد جو بے حد ضروری تھا، میں آگے روانہ ہوا۔ وہ برف گاڑی دور پرے اب تک، سیاہ محرک دھبے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ البتہ کبھی کبھی وہ برف کے کسی تودے کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور اس وقت میں حد درجہ بے چینی محسوس کرنے لگتا۔

کتوں کی حالت کی طرف میں نے کوئی دھیان نہ دیا۔ میں ایک مجنونانہ جوش کے عالم میں انہیں بڑی بے دردی سے بھگاتا رہا...... دو دن ...... مسلسل دو دن کی اندھا دھند دوڑ کے بعد میں مفرور عفریت کے بہت قریب پہنچ گیا۔

اور اب ہم دونوں کے درمیان ایک میل سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا لیکن آپ میرے غصے اور مایوسی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جب وہ اچانک میری نظروں سے اوجھل ہو گیا...... دفعتہً میں نے سمندر کا شور سنا۔ میرے عین نیچے سمندر گرج رہا تھا گرج کی آواز دم بدم تیز اور ڈراؤنی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کتوں کو اور تیز بھگایا۔ لیکن میری ساری کوششیں رائیگاں ہی گئیں۔ ہوا تیزی سے چلنے لگی تھی۔ برف کی چادر تلے سے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی گرج سنائی دی۔ دفعتہً بھونچال سا آ گیا اور عین میرے سامنے کی برف پھٹ گئی۔ چشمِ زدن میں سب کچھ ہو گیا۔ اب میں اپنا تعاقب جاری نہ رکھ سکتا تھا کیونکہ اس عفریت کے درمیان گرجتا ہوا اتھاہ سمندر حائل تھا۔ میری برف گاڑی، کتے اور خود میں برف کے ایک تیرتے ہوئے تودے پر کھڑے تھے اور تودے کا حجم، جس پر میں کھڑا تھا، لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میری موت قریب تھی۔ بھیانک موت...... اور اس موت کے لئے میں اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

کئی گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے۔

برف گاڑی میں جتے ہوئے کتے مر گئے۔ انتہائی مایوسی سے خود میرے دل کی حرکت بھی بند ہونے کے قریب تھی کہ میں نے آپ کا جہاز دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرف کوئی جہاز نہ آتا ہوگا اور نہ آئے گا۔ چنانچہ اس خلاف توقع منظر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے جلد ہی اپنی حیرت پر قابو حاصل کر لیا۔ برف گاڑی کے ایک حصہ کو توڑ کر دو چپو سے بنائے اور برف کے اس تودے کو بڑی کوششوں سے آپ کے جہاز کی طرف کھینے لگا۔

میں نے سوچا تھا کہ اگر یہ جہاز جنوب کی طرف جا رہا ہوگا تو اس کے کپتان سے ایک کشتی مانگ لوں گا اور تعاقب جاری رکھوں گا۔ لیکن شکر ہے کہ آپ شمال کیطرف جا رہے ہیں۔ چنانچہ میں آپ کے جہاز پر آ گیا۔ لیکن ابھی میرا کام پورا نہیں ہوا ہے۔

کیا خدا کبھی مدد نہ کرے گا؟ کیا میں اپنے دشمن کا خاتمہ نہ کر سکوں گا؟ کیا میں سکون سے نہ مر سکوں گا؟ کیا مرنے کے بعد بھی میری روح بھٹکتی رہے گی؟ شاید...... کیونکہ ابھی وہ زندہ ہے۔ اور مرنے کے بعد زندہ رہے گا۔ والٹن! میرے دوست! وعدہ کرو کہ اگر میں مر گیا تو تم میرے اس ادھورے کام کو پورا کرو گے اور اس عفریت کا خاتمہ کر کے میری روح کو سکون بخشو گے۔ لیکن نہیں...... یہ میرا معاملہ ہے۔ اس سے تمہیں کیا تعلق؟ میری وجہ سے تم کیوں پریشان ہوتے پھرو؟...... نہیں۔ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں...... البتہ...... اگر میں مر گیا اور اتفاقاً وہ عفریت تمہارے سامنے آ گیا تو وعدہ کرو کہ اس وقت تم اس سے میرا انتقام لے لو گے مجھے یقین دلاؤ میرے دوست کہ وہ میری لاش پر فتح مندانہ قہقہے نہ لگائے گا۔ مجھے یقین دلاؤ میرے دوست کہ اس شیطان کا ظالمانہ دور بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ لیکن میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں کہ وہ بے حد عیار اور چالاک ہے اور لوگوں کو میٹھی میٹھی باتوں اور ٹھوس دلائل سے لبھا لیتا ہے۔ چنانچہ میرے دوست اس کی باتوں میں نہ آ جانا اس کی روح بھی اس کے جسم کی طرح ناپاک ہے۔ ولیم، جسٹائن، ہینری، الزابیتھ اور میری بے کسانہ موت کو یاد کرنا اور پھر اپنی تلوار اس کے ناپاک سینے میں گھونپ دینا، اور اس وقت میری روح قریب ہی ہوگی اور شیطان کو تڑپتے اور مرتے دیکھے گی۔ اور اگر میری زندگی میں ایسا ہوا، اور خدا کرے کہ ایسا ہو، تو میں پھر اطمینان اور سکون سے مر سکوں گا اور اس دنیا سے ناکام نہ جاؤں گا۔



اختتامیہ

مارگریٹ۔

تم نے عجیب وغریب، المناک اور ہیبت ناک کہانی پڑھ لی؟ سچ کہو کہ کیا تمہارا خون مارے خوف کے منجمد نہیں ہو گیا جس طرح کہ میرا ہوا تھا؟ کیا تمہاری آنکھوں سے آنسو نہیں بہے جس طرح کہ میری آنکھوں سے بہے تھے۔ وکٹر نے یہ کہانی رک رک کر سنائی تھی کیونکہ زیادہ بولنے سے اس کی آواز پھولنے لگتی تھی اور کبھی یوں ہوتا کہ اس کی آواز بلند ہو کر پھٹ جاتی۔ یہ کہانی سناتے وقت وکٹر کے چہرے کے جذبات میں ہر لحہ تغیر ہوا کرتا تھا۔ کبھی تو اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے تھے اور کبھی ان میں مایوسی کے بادل منڈلانے لگتے تھے کبھی وہ بے چین ومضطرب ہو جاتا اور کبھی مسکرانے لگتا۔ کبھی اس کے بشرے سے خوف عیاں ہوتا اور کبھی اطمینان وسکون۔ کبھی تو اس کا چہرہ مارے غصے کے سرخ اور آواز گرجدار ہو جاتی اور کبھی اس کا چہرہ زرد ہو جاتا اور آواز مردہ ہو جاتی۔

یہ ایک ایسی حیرت انگیز کہانی ہے کہ اگر وکٹر نے مجھے راحیل اور فیلکس کے خطوط نہ دکھائے ہوتے...... یہ خطوط میں تمہیں بھجوا رہا ہوں) تو میں اس کہانی پر مشکل ہی سے یقین کرتا۔ اور پھر میں نے اس کو، جسے وکٹر نے بنایا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ چنانچہ اب شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ میری بہن! یقین کرو''وہ'' ہیبت ناک ہستی دنیا میں موجود ہے۔

ایک دن میں نے شوقِ تجسس سے بے تاب ہو کر فرنکسٹائن سے کہا کہ وہ آدمی بنانے کا فارمولا مجھے بھی بتا دے۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کیا تم بھی اپنے عزیزوں کی تباہی کا سامان کرنا چاہتے ہو؟ میری حالت دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔''

وکٹر فرنکسٹائن کی کہانی میں نے لکھ لی تھی۔ یہ بات اسے معلوم ہوئی تو اس نے وہ کاغذات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے وہ کاغذات اسے دے دیئے۔ وکٹر نے میری تحریر میں جگہ بہ جگہ تصحیح کروائی۔ چنانچہ اب جو مسودہ تمہارے پاس پہنچ رہا ہے وہ مکمل اور صحیح ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس عرصے میں ہم دوسری باتیں کرتے رہے۔ نہ تو وکٹر نے اس عفریت کا ذکر کیا اور نہ میں نے ہی اس سے کچھ پوچھا حالانکہ میں اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس خیال سے خاموش تھا کہ میرے سوالات مبادا وکٹر کو اعصابی ہیجان میں مبتلا کر دیں۔

''جب میں بچہ تھا'' وکٹر نے کہا ''تو اس وقت بھی مجھے احساس تھا کہ میں کچھ کرنے اور کچھ بننے والا ہوں۔ لیکن اس وقت چونکہ میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں پختہ نہ تھیں اس لئے نہ جانتا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور کیا بننے والا ہوں ...... یہ اب معلوم ہوا...... میں ایک ہستی تخلیق کرنے اور دنیا کا سب سے زیادہ مصیبت زدہ آدمی بننے والا تھا۔ بچپن سے ہی میرے حوصلے بلند تھے اور میں اپنے آپ کو بہت بلند، اتنے بلند جو انسانوں کی پہنچ سے باہر ہو، ایسے مقام پر دیکھا کرتا تھا۔ میرے دوست! تصور ہمیں مستقبل کی جو تصویر دکھاتا ہے وہ غلط اور جھوٹی ہوتی ہے۔ دیکھو والٹن! میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ یہ میرا زوال ہے...... کتنا عبرتناک...... کس قدر سبق آموز...... میں نے آسمان کو چھونے کی کوشش کی تھی...... میں ایک انتہائی بلند مقام پر پہنچنا چاہتا تھا نتیجہ......؟ نتیجہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ کل یا پرسوں یا دو چار دن میں مر جاؤں گا اور کوئی جانے گا بھی نہیں کہ وکٹر فرنکسٹائن نام کا کوئی شخص کبھی اس دنیا میں موجود تھا۔''

مارگریٹ! کیا واقعی میرا دوست مجھ سے بچھڑ جائے گا۔ میں زندگی بھر نا آشنائے دوست رہا۔ میں نے ایک دوست کی کمی شدت سے محسوس کی۔ اور اس ویران برفستان میں مجھے ایک دوست مل گیا۔ کس وقت؟ جبکہ اس کی زندگی کے چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں...... لیکن نہیں...... میں وکٹر کو نہ مرنے دوں گا...... نہ مرنے دوں گا۔ ماہر ڈاکٹروں سے اس کا علاج کراؤں گا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ خود وکٹر جینا نہیں چاہتا...... اسے زندگی کے نام سے چڑ ہو گئی ہے۔

''میں تمہارا مشکور ہوں والٹن'' اس نے کہا۔ ''لیکن تم ہی بتاؤ میں جی کر کیا کروں گا؟ بالفرض

محال تمہاری کوششوں سے میں زندہ رہا بھی تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں خوش رہ سکوں گا؟ کیا کوئی دوسرا ہینری کی اور کوئی دوسری لڑکی الزابیتھ کی جگہ لے سکتی ہے؟ میرا اولیم مجھے واپس مل سکتا ہے؟ کیا دوبارہ میں جسٹائن کو زندہ دیکھ سکتا ہوں؟ کیا اب میں والد صاحب کی محبت بھری باتیں سن سکتا ہوں؟ نہیں میرے دوست! میرا گھر برباد ہو گیا۔ میرے عزیز مارے گئے۔ اب میں کس کے لئے اور کیوں زندہ رہوں۔ اب اس دنیا میں میرے لئے صرف ایک کام باقی رہ گیا ہے...... اس عفریت کا خاتمہ کرنا۔ یہ کام پورا ہو لے تو پھر میں بھی اپنے عزیزوں سے جا ملوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں دنیا میں اسی لئے بھیجا گیا تھا کہ ایک شیطان تخلیق کروں جو میرے دکھوں کا بانی ہو اور پھر اس کا خاتمہ کر کے خود بھی مر رہوں۔''

۲/ستمبر

میری بے حد پیاری بہن۔

میں عجیب حالت میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور کہہ نہیں سکتا کہ اپنے وطن اور عزیزوں تک پہنچ سکوں گا یا نہیں؟ ہمارا جہاز برف کے خطرناک اور ناقابلِ عبور پہاڑوں میں پھنسا ہوا ہے اور ان پہاڑوں کے جہاز پر ڈھے پڑنے کا دھڑکا لگا ہوا ہے...... میرے ساتھی امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہیں اور میں کچھ نہیں کر سکتا بہر حال اب بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور قطعی ناامید نہیں ہوا ہوں۔ تاہم یہ خیال مجھے چین لینے نہیں دیتا کہ ان بچاروں کو موت کے منہ میں مَیں ہی لایا ہوں...... اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ان سب کا خون میری گردن پر ہوگا۔

اور مارگریٹ! خود تمہاری حالت کیسی ہو جائے گی؟ ہماری موت کی خبر ظاہر ہے کہ تم تک نہ پہنچے گی۔ چنانچہ تم میری واپسی کی منتظر رہو گی۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور تمہاری امید پر ناامیدی غالب آتی جائے گی۔ تم یقین کرنا چاہو گی کہ تمہارا بھائی مر چکا۔ لیکن یقین نہ کر سکو گی۔ میری بہن! تمہاری اس وقت کی حالت کا تصور اپنی تباہی اور موت کے خیال سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لیکن تم ایک محبت کرنے والے شوہر کی بیوی اور دو بے حد پیارے بچوں کی ماں ہو۔ چنانچہ یقین ہے کہ بہت جلد دنیا کے جھمیلوں میں پھنس کر ایک حد تک مجھے فراموش کر جاؤ گی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔

میرا مصیبت زدہ دوست فرنکسٹائن میری ڈھارس بندھاتا رہتا ہے۔ وہ مجھے ان بہادروں کے قصے سناتا ہے جنہوں نے دنیا کے انجان خطوں کا کھوج لگایا ہے اور میرے مستقبل کے سلسلے میں

نہایت خوشگوار امید افزا پشینگوئیاں کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی یہ باتیں میری اور میرے ساتھیوں کی ہمت بندھاتی ہیں اور ہم برف کے ان پہاڑوں کو معمولی کیڑے مکوڑے سمجھنے لگتے ہیں جنہیں سرنگوں کرنا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارے یہ جذبات عارضی ثابت ہوتے ہیں ہر نیا دن جو طلوع ہوتا ہے۔ ہمارے لئے خوف اور نا امیدی ہی لاتا ہے...... اس لئے مجھے خوف ہے کہ کہیں جہاز پر بغاوت نہ ہو جائے۔

۵/ستمبر

ایک دلچسپ واقعہ ہوا ہے۔

ہم بدستور برف کے پہاڑوں کی آغوش میں ہیں اور زندہ دفن ہو جانے کا خوف اب تک دور نہیں ہوا ہے۔ سردی ناقابلِ برداشت ہے اور میرے کئی ساتھی اس کی تاب نہ لا کر اپنے وطن اور عزیزوں سے دور، اسی برفستان میں ابدی نیند سو گئے ہیں۔ فرنکسٹائن کی صحت دن بدن گرتی جارہی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی چنگاریاں سی روشن ہیں۔

میں اپنے پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ مجھے اس جہاز پر بغاوت ہو جانے کا خوف لاحق ہو گیا ہے ...... آج صبح میں فرنکسٹائن کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ شور کی آواز سن کر چونکا۔ چند ملاح کیبن میں گھس آئے اور ان کے سرغنہ نے مخاطب کیا۔ اس نے کہا کہ وہ لوگ جہاز کے دوسرے ملازموں کے فرستادہ اور نمائندے ہیں اور ایک مطالبہ کرنے آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم برف کے پہاڑوں میں قید ہیں اور اب شاید بچ نہ سکیں گے۔ لیکن اگر یہ پہاڑ کسی طرح پھٹ گئے اور ہمیں نکلنے کا راستہ مل گیا تو، انہوں نے کہا، میں وعدہ کروں کہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس لوٹ چلوں گا۔

اس کے اس مطالبے نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں اب تک مایوس نہ ہوا تھا اور نہ ہی مجھے واپس لوٹ چلنے کا خیال آیا تھا۔ تاہم ان کا یہ مطالبہ مناسب تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ عین اسی وقت فرنکسٹائن نے، جو اب تک بے ہوش سا پڑا تھا۔ آنکھیں کھول دیں۔ کہنیوں کے بل اٹھ کر چند ثانیوں تک ملاحوں کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے یوں کہنا شروع کیا۔

''دوستو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ حیران ہوں کہ تم اتنی جلد ہمت ہار بیٹھے!۔ کیا اسی لئے تم اپنے وطن سے چلے تھے کہ ناکام اور ذلیل لوٹو؟ کیا تم نے اپنے وطن سے رخصت ہوتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ یہ مہم بے حد دلچسپ ثابت ہو گی؟ کیوں؟ اس لئے کہ یہ خطرناک ہے، یہاں قدم قدم پر موت کھڑی نظر آتی ہے۔ اور راہ کی مشکلات، خطرات اور موت کے دھڑکے نے اس مہم کو دلچسپ بنا دیا

ہے یہ اس لئے بھی دلچسپ ہے کہ تم بہادر ہو اور موت سے پنجہ لڑانا اور اسے شکست دینا چاہتے ہو۔ اگر تم کامیاب لوٹے تو شہرت دوام کی بلندیوں کو چھو لو گے۔ دنیا کے ہر گوشے میں تمہارا نام عزت و احترام سے لیا جائے گا۔ تاریخ تمہارے کارناموں کو محفوظ کر لے گی اور آنے والی نسلیں قیامت تک تمہاری احسان مند رہیں گی۔ کیونکہ تم ان کے لئے ایک نیا راستہ دریافت کر جاؤ گے۔"

"تم ان لوگوں میں سے ہو گے جو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے۔ لوگ تمہیں دیوتا کی طرح پوجیں گے۔ لیکن اگر تم نے کم ہمتی کا ثبوت دیا اور اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹ گئے تو تم پر لوگ ہنسیں گے، تمہارا مذاق اڑائیں گے، تمہاری بزدلی اور بودے پن پر فقرے کسے جائیں گے اور تم دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔"

"دوستو! ہمت نہ ہارو...... مرد بنو...... انسان چاہے تو کیا نہیں کر سکتا...... محکم یقین اور پیہم عمل کی ضرورت ہے۔ انسان کی ہمت کے سامنے پتھر بھی موم ہو جاتے ہیں...... دوستو! یہ برف اتنی مستحکم نہیں ہے جتنے کہ تمہارے دل ہیں۔ تم محض اپنے دل کی حرارت سے برف کے ان تودوں کو پگھلا سکتے ہو۔ تمہارے عزم اور ارادوں کے سامنے ان تودوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

"تم کیا منہ لے کر عزیزوں میں جاؤ گے؟...... نہیں، اس طرح اپنے وطن میں نہ جاؤ کہ تمہارے ہاتھوں پر ناکامیوں اور بودے پن کی شرمناک داستان کندہ ہو بلکہ اس طرح جاؤ کہ تمہارے چہرے فتح مندی سے دمک رہے ہوں اور لوگ خوشی کے نعروں سے تمہارا استقبال کریں اور دیکھیں کہ تم ناممکن کو ممکن کر کے لوٹے ہو۔"

اس نے یہ تقریر کچھ ایسے جوشیلے انداز میں کی اور اس کے بشرے سے کچھ ایسے جذبات کا اظہار ہوا کہ سب کے سب مسحور سے ہو گئے اور شرمندہ نظر آنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ "فی الحال وہ جائیں اور جو کچھ کہا گیا ہے اس پر غور کریں اگر اس کے بعد بھی۔" میں نے کہا "انہوں نے واپس لوٹ جانے کا ہی فیصلہ کیا تو میں انہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کروں گا۔

وہ لوگ خاموشی سے چلے گئے اور میں شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنے دوست کی طرف گھوما تو وہ بستر پر مردے کی طرح پڑا تھا۔ کیونکہ مسلسل بولنے کی وجہ سے بے حد تھک گیا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھی کیا فیصلہ کریں گے البتہ میں اپنے متعلق کہتا ہوں کہ ناکام لوٹنے سے مر جانا بہتر سمجھتا ہے۔ لیکن خوف ہے کہ میں اپنا مقصد حاصل نہ کر سکوں گا۔ شاید مجھے یہیں سے

واپس لوٹنا پڑے گا۔دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

۶/ستمبر

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

میرے ساتھی اپنی ضد پر قائم رہے۔چنانچہ میں نے وعدہ کرلیا ہے کہ اگر کسی طرح سے برف کے پہاڑ ہٹ گئے اور ہمیں راستہ مل گیا تو میں لوٹ چلوں گا۔چنانچہ یوں، میری بہن، میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا اور دل کی دل ہی میں رہی۔

میں ناکام اور شرمندہ واپس آؤں گا۔

۱۲ستمبر

ختم ہوگیا۔سب ختم ہوگیا۔

میں انگلستان آرہا ہوں۔میرے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرا دوست مجھ سے بچھڑ گیا۔لیکن بہتر ہوگا کہ میں واقعات تفصیل سے تحریر کردوں۔

نوستمبر...... برف کے پہاڑ جو ہمیں بھینچے ہوئے تھے ہٹنے لگے بجلی کی سی کڑک کی آواز سنائی دی اور برف پھٹنے لگی ۔اس وقت زبردست خطرہ لاحق تھا لیکن ہم نے حواس قائم رکھے۔اس وقت میں وکٹر فرنکسٹائن کی طرف متوجہ تھا جس کی صحت بالکل گر چکی تھی اور وہ بستر ے سے اٹھنے کے قابل نہ رہا تھا۔

جہاز کے عقب میں برف تیزی سے ٹوٹ ٹوٹ کر شمال کی طرف بہہ رہی تھی۔مغرب کی طرف سے ہوا کے تیز جھونکے آرہے تھے۔گیارہ ستمبر کو شمال کی طرف کا راستہ پوری طرح کھل چکا تھا۔ میرے ساتھیوں نے یہ دیکھا تو ان کے منہ سے خوشی کی چیخیں نکل گئیں۔فرنکسٹائن نے، جس پر غنودگی سی طاری تھی، آنکھیں کھول کر اس شور وغل کی وجہ پوچھی۔

''میرے ساتھی خوشی منا رہے ہیں'' میں نے جواب دیا'' کیونکہ وہ لوگ بہت جلد اپنے وطن اور عزیزوں میں پہنچ جائیں گے۔''

''تو کیا واقعی تم واپس جا رہے ہو؟''

''مجبور ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔لیکن میں تمہارے ساتھ نہ آؤں گا۔کیونکہ ابھی میرا کام پورا نہیں ہوا ہے۔خدا میری مدد کرے گا اور میں اپنے دشمن سے انتقام لوں گا۔''

اور اس نے ایک جوش کے عالم میں اٹھنے کی کوشش کی۔لیکن وہ اتنا کمزور ہو رہا تھا کہ اس کی

سانس پھول گئی وہ بستر پر چت گرا اور بے ہوش ہو گیا۔
بہت دیر تک اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ میں سمجھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آیا۔ اس کی سانس رک رک کے چل رہی تھی اور زبان گنگ ہو گئی تھی۔ جہاز کے ڈاکٹر نے اسے دوا پلائی اور مجھے الگ لے جا کیہا۔
''والٹن! اب اس کی زندگی کے چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔''
مجھ پر بجلی سی گری۔ میں فرنکسٹائن کے بستر کے قریب سر جھکائے بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد فرنکسٹائن نے مجھے اشارے سے اور قریب بلایا اور بے حد کمزور آواز میں کہا۔
''میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ بہت جلد مر جاؤں گا۔ لیکن وہ عفریت زندہ ہے۔ والٹن! میرے انتقام اور نفرت کی آگ قدرے سرد پڑ گئی ہے۔ پچھلے چند دنوں سے میں ماضی کے واقعات اور خود اپنی حالت پر برابر غور کر رہا ہوں۔ میں بے قصور ہوں اور وہ بھی جسے میں نے بنایا ہے، بے قصور ہے، میں نے ایک مجنونانہ جوش اور شوق میں ایک جاندار، جو سوچ اور سمجھ سکتا ہے، تخلیق کیا۔ چنانچہ جس طرح میں اس کی زندگی کا ذمہ دار ہوں، اسی طرح اسے زندگی کی وہ مسرتیں، جو میرے اختیار میں تھیں، بخشنے کی ذمہ داری بھی میری ہی تھی۔ بے شک یہ میرا فرض تھا۔ لیکن دوسرا اور اہم فرض بھی مجھ پر عائد ہوتا تھا۔ بنی نوع انسان کی حفاظت کا فرض۔ اور اسی فرض کے احساس نے مجھے ایسا ہی دوسرا جاندار تخلیق کرنے سے باز رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ میرے آدم نے حد درجہ خود غرضی اور شیطنت کا ثبوت دیا اس نے میرے عزیزوں کی جان لی۔ اسی پر بس نہ کرتے ہوئے وہ غالباً سارے انسانوں سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کب تک انتقام لیتا رہے گا۔ چونکہ وہ خود تنہا اور اداس ہے اس لئے دوسروں کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ اس عفریت کا خاتمہ میرا کام تھا لیکن میں اپنا کام پورا نہ کر سکا۔ چنانچہ میں ایک بار پھر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو میرا یہ کام تم پورا کرنا۔ میں کہہ چکا ہوں وہ بے قصور ہے تاہم اس کا زندہ رہنا خطرے سے خالی نہیں۔''
''لیکن میں تمہیں مجبور نہیں کرتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اپنے اور عزیزوں کو چھوڑ کے اس کی تلاش میں سرگرداں رہو۔ لیکن چونکہ اب تم انگلستان جا رہے ہو اس لئے شاید تمہاری اس سے مڈبھیڑ نہ ہو گی۔ چنانچہ میں نہیں جانتا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے، میں کوئی مناسب مشورہ نہیں دے سکتا۔ جیسا بھی مناسب سمجھو کرو۔''
''لیکن یہ خیال مجھے سکون سے مرنے نہ دے گا کہ وہ زندہ ہے۔ اگر میں نے اس کا خاتمہ کر دیا

ہوتا تو خود میری موت آسان ہوتی۔ میرے عزیزوں کی صورتیں میری نظر کے سامنے گھوم رہی ہیں اور میں ان سے ملنے کے لئے بے تاب ہوں۔ حالانکہ دنیا سے ناکام و نامراد جاتا ہوں۔ الوداع! میرے دوست۔"

اس کی آواز ڈوب گئی۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے پھر بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا، وہ مسکرایا، آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا شکریہ ادا کیا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میرا دوست مر چکا ہے...... میں نے اسے پکارا اور اسے جھنجھوڑا...... اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ فرنکسٹائن مر چکا تھا۔ اس کا بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں اس سے لپٹ کر رونے لگا۔

آدھی رات۔

دفعتہً میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسی آواز تھی؟ کہیں میں نے خواب میں تو وہ آواز نہ سنی تھی؟...... نہیں...... پھر وہی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ کسی انسان کی آواز تھی۔ لیکن کچھ عجیب سی۔ پھٹی ہوئی اور غیر قدرتی یہ آواز اس کیبن میں سے آ رہی تھی جہاں فرنکسٹائن کی لاش ہے چل کر دیکھنا چاہئے کیا بات ہے۔ چنانچہ شب بخیر میری بہن۔

اف! عجیب منظر تھا وہ۔ حیران ہوں کہ میں اس کی تصویر لفظوں میں کس طرح کھینچوں؟ تاہم مجھے کوشش کرنی چاہئے کیونکہ اس کے بغیر یہ کہانی ادھوری رہ جائے گی۔

میں اس کیبن کی طرف چلا۔ جہاں فرنکسٹائن کی لاش تھی۔ میں دروازے میں ہی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ فرنکسٹائن کی لاش پر کوئی جھکا ہوا تھا۔ میرے خدا! کس قدر ہیبت ناک تھا وہ۔ دیو قامت اور بھدا...... تابوت پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لانبے اور خشک بالوں سے تقریباً ڈھکا ہوا تھا اور اس کا چہرہ، جو کسی ممی کے ہاتھ کی طرح سوکھا ہوا تھا۔ وہ نہایت بھیانک اور لرزا دینے والی آواز میں بین کر رہا تھا۔

میرے پیروں کی چاپ سن کر وہ خاموش ہو گیا۔

وہ اٹھا اور حیوانی پھرتی سے کھڑکی کی طرف چلا۔ ایسی بھیانک صورت میں نے، اور کسی نے کبھی بھی، نہ دیکھی ہو گی۔ خوف سے میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنے

دوست کی موت اور اس کی درخواست یاد آ گئی۔ میں سنبھلا

''ٹھہرو۔'' میں نے حتی الامکان تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

وہ رک گیا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر وکٹر کی لاش کی طرف گھوم گیا۔ چند ثانیوں تک وہ اپنے خالق کے بے جان جسم پر نظریں گاڑے رہا۔ دفعتہً اس کے بشرے سے حد درجہ غصے اور نفرت کا اظہار ہوا۔

''یہ بھی میرا شکار ہے۔'' اس نے میری موجودگی کو بھول کر کہا'' اس کی موت کے ساتھ میرے انتقام کا اور میری مجرمانہ زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے اس شخص کے ساتھ ہی میری زندگی کے مسلسل حادثات، جدوجہد اور میری آرزوؤں کا خاتمہ ہوتا ہے...... قابلِ پرستش فرنکسٹائن! اب اگر میں نے تجھ سے معافی مانگی بھی تو کیا؟...... فرنکسٹائن! میں تیرے عزیزوں کا اور تیرا بھی خونی ہوں ہائے! اب تو مجھے جواب نہ دے گا...... اب میں تجھے زندہ نہ دیکھ سکوں گا۔''

اور اس کی آواز رندھ گئی میں نے اسی وقت اس عفریت کا خاتمہ کر کے اپنے دوست کی آخری خواہش پوری کر دی ہوتی۔ لیکن شوق تجسس نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ فرنکسٹائن کا یہ آدم اب کیا کہتا ہے؟

میں ہمت کر کے اس کی طرف بڑھا۔ میں اس کے قریب پہنچا۔ لیکن اس کے ہیبت ناک چہرے پر نظر کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ اپنی بھیانک آواز میں ماتم کرتا رہا۔ بڑی کوششوں کے بعد آخر کار میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب کیوں روتے ہو؟ تمہارا یہ غم مصنوعی ہے۔ اگر تم ایسے شیطان نہ بن گئے ہوتے، اگر غصے میں اندھے نہ ہو گئے ہوتے تو آج فرنکسٹائن زندہ ہوتا۔''

تم مجھے الزام دیتے ہو؟ ٹھیک ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تم نہیں جانتے کہ میں نے کتنی اذیتیں برداشت کی ہیں۔ میری اذیت اس سے (اس نے فرنکسٹائن کی طرف اشارہ کیا) بڑھ کر تھی۔ میرے دکھ اس کے دکھوں سے زیادہ تھے، اگر میری جگہ کوئی فرشتہ ہوتا تو وہ بھی وہی کرتا جو میں نے کیا۔ چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ تم مجھے خود غرض تو کہہ سکتے ہوں گنہگار نہیں کہہ سکتے...... اور تمہارا خیال ہے کہ ولیم کا گلا گھونٹ کر میں نے مسرت محسوس کی تھی؟ جسٹائن کو پھانسی پر لٹکتے دیکھ کے میں مسکرایا تھا؟ ہینری کو اپنی گرفت میں تڑپتا دیکھ کے میں نے قہقہے لگائے تھے؟ تم سمجھتے ہو کہ اس کی کراہیں میرے لئے سامعہ نواز تھیں؟ نہیں نہیں...... میرے پاس بھی دل ہے میں بھی رحم

کے جذبات محسوس کرسکتا ہوں......تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ نفرت، حقارت اور انتقام کی آگ روشن کرنے اور رحم کے جذبات کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے مجھے کتنا جبر کرنا پڑتا تھا۔''

''ہینری کو مارنے کے بعد میں سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ تو غمگین اور اداس تھا۔ مجھے فرنکسٹائن کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ میرا یہ رحم انتہا کو پہنچ کر ایک عجیب طرح کے خوف میں تبدیل ہو گیا اور مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوئی لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے بنانے والا اور مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ دینے والا خود اپنی مسرتوں کی تلاش میں ہے اور مجھے حوّا نہ دے کر خود شادی کرنے والا ہے تو رشک و رقابت نے مجھے پاگل کر دیا۔ مجھے اپنی دھمکی یاد آئی اور میں نے اپنی اس دھمکی کو جامۂ عمل پہنانے کا ارادہ کر لیا میں جانتا تھا کہ اس طرح میں خود اپنے آپ کو آزمائش میں ڈال رہا ہوں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میں اپنے جذبات کا غلام تھا۔ چنانچہ میں نے الزابیتھ کا گلا گھونٹ دیا اور اس کے بعد اپنے سارے رحیمانہ جذبات سختی سے کچل دیئے۔ میں بے حس بن گیا۔ میں شیطان، عفریت، بھوت، ہیولا اور خدا جانے کیا کیا ہوں کیونکہ جس نے مجھے دیکھا۔ حتیٰ کہ میرے خالق نے بھی مجھے یہی نام دیئے حالانکہ میں ایسا نہ تھا۔ ہاں میں ایسا نہ تھا۔ لیکن مجھے بلا تحقیق شیطان اور عفریت تسلیم کر ہی لیا گیا۔ تو میں سوائے اس کے اور کیا کر سکتا تھا کہ حقیقت میں شیطان بن کے دکھا دوں۔ لیکن اب میرا کام پورا ہو گیا۔ میرا آخری شکار میرے سامنے مردہ پڑا ہے۔''

اس کا لہجہ بے حد غمناک اور مایوسانہ تھا۔ لمحہ بھر کے لئے میرا دل پگھل گیا۔ لمحہ بھر کے لئے مجھے اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ لیکن مجھے فرنکسٹائن کی غمناک کہانی یاد آئی اور جب میں نے اپنے دوست کو تابوت میں مردہ پڑے ہوئے دیکھا تو مجھے غصہ آنے لگا۔

''اچھا ہوا کہ تو آ گیا'' میں نے کہا ''اگر تو کسی طرح مجھ سے بچ نکلا تب بھی جب تک زندہ رہے گا اپنی ہی آگ میں جلتا رہے گا۔ تیرے آنسو مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر وہ، جس کی لاش پر آنسو بہاتا ہے، زندہ ہوتا تو تُو اسے کبھی نہ بخشتا۔ تو اسے اور بھی زیادہ دکھ دیتا اور میں سمجھتا ہوں کہ تو فرنکسٹائن کی موت پر اس لئے آنسو بہا رہا ہے کہ اب تو فرنکسٹائن کو پریشان دیکھ کے خوش نہ ہو سکے گا۔ فرنکسٹائن نے مرنے کے بعد، تجھ سے تیری خوشی چھین لی ہے۔''

''نہیں......نہیں......یہ بات نہیں ہے'' اس نے سینہ کوٹتے ہوئے کہا ''لیکن اگر تم یوں ہی سمجھ رہے ہو تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی میں اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں......اب تک میں بالکل ناامید نہ ہوا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن میں مسرتوں سے ہمکنار ہو سکوں گا۔

لیکن اب وہ امید بھی نہ رہی۔اب میں آخیر تک اکیلا اور اداس رہوں گا۔اور جب مروں گا تو اپنے وجود پر لعنت بھیج کر مروں گا۔شیطان راندۂ درگاہ اور ٹھکرایا ہوا ہے لیکن اکیلا نہیں ہے اس کے ساتھی اور دوست اسی دنیا میں موجود ہیں۔میں بھی راندۂ درگاہ اور ٹھکرایا ہوا ہوں اور اکیلا ہوں۔میرا کوئی نہیں......کوئی نہیں......اور کوئی میرا ہوگا بھی نہیں۔کسی کو مجھ پر رحم نہ آئے گا۔کوئی مجھ سے ہمدردی نہ کرے گا۔کوئی میرا دوست نہ ہوگا۔کوئی میرا ساتھی نہ ہوگا۔

میں اپنے جرائم پر نظر کرتا ہوں تو خود مجھے یقین نہیں آتا کہ میں وہی ہوں جس کا دل رحم اور ہمدردی سے پُر تھا اور جو شریف اور بھلائی کرنے والا تھا......نہیں میں وہ نہیں ہوں۔میں کبھی فرشتہ تھا۔لیکن کسی نے مجھے سمجھنے کی کوشش نہ کی، کسی نے میرا ہاتھ نہ تھاما جو میں نے صلح اور دوستی کے لئے بڑھایا تھا......اور اب خونی ہوں۔عفریت ہوں۔شیطان ہوں۔"

"تم نے فرنکسٹائن کی زبانی اس کے دکھوں کی داستان سنی ہے اور یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔وہ میرے دکھوں کا اندازہ نہ کرسکا چنانچہ مجھے ایک شیطان کے ہی روپ میں پیش کیا اور اگر فرنکسٹائن میرے دکھوں کا اندازہ کر بھی لیتا تب بھی اسے اپنے ہی دکھ سخت اور ناقابلِ برداشت معلوم ہوتے۔اپنے دکھوں کو تو میں، صرف میں سمجھ سکتا ہوں......تم کہو گے میں نے فرنکسٹائن کی امیدوں کا خون کردیا...... لیکن میری امیدیں کہاں پوری ہوئیں۔میں اب بھی اس طرح تنہا ہوں جس طرح کہ پہلے تھا......دنیا والوں نے مجھے ٹھکرایا، میں نے ان پر احسان کئے، ان کی مدد کی لیکن انہوں نے مجھے مارا پیٹا اور مجھے ٹھکرادیا تو وہ ظالم نہیں لیکن میں ظالم تسلیم کرلیا گیا؟ دنیا والے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کریں تو ان کی یہ کوششیں بجا......وہ میرے خلاف ہر کام کرنے میں حق بجانب ......لیکن میں اگر کچھ بھی کروں گا تو گنہگار......کیوں؟ کیا اس لئے کہ وہ انسان ہیں اور میں نہیں ہوں ؟ میں دوستی کی خواہش کروں تو مجرم، ہمدردی چاہوں تو گنہگار، زندگی کی مسرتیں حاصل کرنا چاہوں تو قابل گردن زنی......ساری دنیا کے الزامات میرے ہی سر تھوپے جاتے ہیں......میں ہی گنہگار تسلیم کر لیا جاتا ہوں...... میں ہی ظالم اور بے درد ہوں...... یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تم فیلکس کو ظالم اور احسان فراموش کیوں نہیں کہتے؟ میں نے اس کے ساتھ بھلائی کی تھی لیکن اس نے مجھے مارا پیٹا۔تم اس شخص سے نفرت کیوں نہیں کرتے جس نے اپنی بچی کی جان بچانے والے پر گولی چلادی تھی؟ لیکن تم بھلا ان سے کیوں نفرت کرنے لگے! وہ تمہاری طرح آدم کی اولا ہیں۔چنانچہ شریف ہیں......ہاں وہ کیوں برے ہونے لگے؟ آخر تمہارے بھائی ہی تو ہیں......لیکن نفرت تو مجھ سے کی جاتی ہے۔

کیونکہ میں بدصورت ہوں۔لیکن کیا انسان بدصوت نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے......اور ایسے بدصورت، بے ڈھنگے لوگوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔ان پر رحم آتا ہے۔لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہ آیا۔کسی نے مجھ سے ہمدردی نہ کی......کیوں؟ آخر کیوں؟

''بے شک میں برا ہوں۔بہت برا۔میں نے بے گناہوں کے گلے گھونٹے ہیں۔معصوم میری گرفت میں تڑپے اور حسین کراہے ہیں۔میں نے ان لوگوں کی جانیں لی ہیں جن سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔میں نے خالق کا دل چھلنی کیا۔یہاں تک کہ وہ مرگیا......اپنے آپ سے میری نفرت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ تمہاری نفرت اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔میں اپنے ان ہاتھوں کی طرف، جن سے میں نے بے گناہوں کے خون کئے کیونکہ میں اکیلا، ستایا ہوا اور ٹھکرایا ہوا ہوں......میں کہاں آدم کی اولاد ہوں؟ کہاں تمہارا بھائی ہوں۔مجھ سے نفرت کی جاتی ہے۔کیونکہ میں نے لوگوں کے گلے دبائے ہیں۔میں دیکھتا ہوں تو میری نفرت اور بھی شدید ہو جاتی ہے میں اپنے شیطانی کارنامے یاد کرتا ہوں تو میری یہ نفرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے......لیکن اب میں کس کو نہ ستاؤں گا......میرے انتقام کی آگ سرد کرنے کے لئے اب نہ تمہارے خون کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور کے......اب مجھے اپنی موت کا انتظار ہے۔اور میرا یہ انتظار طویل نہ ہوگا۔تمہارے جہاز سے نکل کر میں برف کے ایک تیرتے ہوئے تودے پر بیٹھ جاؤں گا۔وہ تودہ مجھے دور، انتہائی شمال میں بہا لے جائے گا۔وہاں میں چتا تیار کروں گا اور اس پر بیٹھ کر اپنے اس بے ڈھنگے اور ڈراؤنے جسم کو راکھ کردوں گا......میں مرجاؤں گا......پھر نہ تو مجھے تنہائی پریشان کرے گی اور نہ اداسی......اور وہ دن دور نہیں......زیادہ دور نہیں۔جب میں اندھا کردینے والی آرزوؤں سے چھٹکارا حاصل کرلوں گا۔پھر میں سورج کی روشنی دیکھ سکوں گا اور نہ چاند ستارے۔ہوا کے فرحت بخش جھونکے میرے گھناؤنے چہرے کو چھوئیں گے اور نہ ہی سردی اور گرمی مجھے ستائے گی......زندگی ختم ہو جائے گی اور شاید اس کے خاتمے کے بعد میں سکون محسوس کرسکوں گا۔''

''تم آخری انسان ہو جسے میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں......فرنکسٹائن میرے خالق! اگر تم زندہ ہوتے، اگر تم میرا تعاقب کررہے ہوتے تو میں بھی زندہ رہنے کی آرزو کرتا......اب میری زندگی میں کچھ نہیں رہ گیا ہے......اب میری زندگی مجھے دلچسپ نہیں معلوم ہو رہی......تم دکھی تھے میرے خالق! لیکن تم سے زیادہ میں دکھی ہوں۔تم نے غم برداشت کئے لیکن تم سے زیادہ میں برداشت کررہا ہوں۔''

''لیکن'' وہ دفعتہً مٹھیاں بھینچ کر چیخا ''بہت جلد میرے دکھوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔میری راکھ کو

ہوا اڑا لے جائے گی...... میں جا رہا ہوں...... میں مرنے جا رہا ہوں...... یہ دنیا اب مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے...... الوداع! چاند، سورج، ستارو! الوداع! اب میں تمہیں کبھی نہ دیکھ سکوں گا...... یہ دنیا مجھے راس نہ آئی۔ بہت جلد...... بہت جلد میں اسے چھوڑ جاؤں گا...... بہت جلد...... بہت جلد...... بہت جلد......۔"

اور وہ یوں چیختا ہوا کھڑکی میں سے برف کے تودے پر کود پڑا...... موجیں تودے کو آگے بہا لے گئیں...... میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ برف کے سفید تودے پر سر جھکائے اداس کھڑا ہوا ایک دیو قامت سایہ اندھیرے میں غائب ہو رہا تھا۔

ختم شد